

اسلام اور سیاست جلد اول

مصنف:

حضرت آیۃ اللہ مصباح یزدی مدظلہ العالی

یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

اسلام اور سياست جلد (۱)

حضرت آية الله مصباح يزدي مد ظله العالی

اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات

مقدمہ ۱

بے شک ہمارے اسلامی نظام اور انقلاب کے ثمرات میں سے ایک نماز جمعہ بھی ہے جس کے امت اسلامی کے لئے بہت سے فوائد ہیں مثلاً جس کا ایک ضمنی فائدہ مومنین کو ضروری چیزوں سے آگاہ کرنا ہے، نماز جمعہ کے خطبوں سے قبل یا نماز جمعہ اور نماز عصر کے درمیان تقاریر کا سلسلہ لوگوں کے لئے بہت مفید ہے، چنانچہ شروع انقلاب سے آج تک مختلف اساتید دانشمندان اور خطباء کے ذریعہ مختلف موضوعات منجملہ اعتقادی تربیتی، اقتصادی، وغیرہ جیسے عظیم اور مہم مسائل پر نماز جمعہ پڑھنے والوں کے درمیان یہ گفتگو ہوتی رہی ہے اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ بھی دوسرے لوگوں تک یہ آواز پہونچتی رہی ہے۔

ہم نے بھی ”اعتقادی نظام اور ارزش اسلام میں توحید کی اہمیت“ کے موضوع پر تقریریں کیں ہیں، جو الحمد للہ چھپ کر قارئین کرام تک پہونچ چکی ہیں، فی الحال بعض اجاب اور دوستوں کی فرمائش اور ان کے اصرار پر ”اسلام کے سیاسی نظریات“ کے عنوان کے تحت چند جلسہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور امیدوار ہیں کہ خداوند عالم اس سلسلہ میں ہماری مدد فرمائے، اور جو بھی اس کی مرضی ہو اور امت اسلام کے لئے مفید ہو وہ ہمیں الھام کرے، اور ہماری زبان پر جاری کرے، تاکہ شہید پرور اور حزب اللہی امت تک ہم اس کو پہونچا سکیں، ہماری اس بحث کا عنوان بہت وسیع ہے، اس کے اندر مختلف موضوعات کی بحثیں کی جاسکتی ہیں چاہے وہ عمیق ہوں یا سادی اور رواں۔

اگرچہ اس سلسلہ میں امام خمینی کی تحریک کے آغاز (یعنی ۱۳۳۱ ہجری شمسی) سے لے کر آج تک بہت سی گفتگو ہوتی رہی ہے اور مضامین و کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اس طرح بہت سی تقاریر بھی ہوتی رہیں ہیں، لیکن معاشرہ کے متوسط فہم لوگوں کے لئے بہت ہی کم اس طرح کے منظم مطالب بیان کئے گئے ہیں، بہر حال اجاب کا اصرار تھا کہ ان مطالب کو اس ترتیب سے بیان کیا جائے تاکہ سبھی لوگ اس سے استفادہ کر سکیں، اور مختلف لوگوں کی خصوصاً جوان طبقہ کی ضرورت کو پورا کر سکے، الحمد للہ ہماری قوم تمدن کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے، خصوصاً آخری چند سالوں میں ہمارے معاشرے اور ماحول نے بہت زیادہ ترقی کی ہے، اور بہت سے دقیق و عمیق مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بہر حال علمی اور ادبی زبان، علمی مراکز (یونیورسٹی اور حوزات علمیہ) سے مخصوص ہے، اور اگر عوام کے لئے گفتگو کرنا ہوتی ہے تو حتی المقدور علمی اصطلاحات نہیں ہونی چاہیئے تاکہ اکثر لوگ (چونکہ مطالعہ نہیں ہے) ان احاث سے فائدہ اٹھا سکیں، البتہ اس بات کی توجہ رکھنی چاہیئے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ کے تحت جو گفتگو کی جائے گی اتنی مفصل بحث ہے جس کو ۱۰۰ جلسوں میں بھی بیان کرنا مشکل کام ہے، اس وجہ سے ہم اپنے وقت اور

جلسات کی محدودیت کی بنا پر کچھ منتخب مسائل کو چھیڑیں گے، اور جن مسائل کی زیادہ ضرورت ہے، اور جن کے سلسلہ میں سوالات اور شبہات کئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں بحث کریں گے۔

یہ توجہ رہے کہ ہمارا موضوع بنام ”اسلام کا سیاسی فلسفہ“ تین کلموں سے مرکب ہے جس کے ہر ایک کلمہ کے لئے مفصل بحث درکار ہے اور سیاسی فلسفہ کی متعدد اصطلاح ہیں (مثلاً علم سیاست کا فلسفہ و علم سیاست کے مقابل میں فلسفہ سیاسی) لیکن فلسفہ سیاسی سے ہماری یہاں مراد حکومت و سیاست کے بارے میں اسلامی نظریات کی توضیح و تفسیر ہے جو خاص اصولوں پر قائم ہے، اور اسلامی حکومت کے سیاسی افکار بھی انہیں اصولوں کی بنیاد پر قابل وضاحت ہیں۔

۲. اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ

جس وقت ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ اسلام ”سیاست اور حکومت“ کے سلسلہ میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے، جو اسلامی اصول و ضوابط پر مبنی ہے تو سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا دین سیاست و حکومت کے بارے میں کوئی خاص نظریہ رکھتا ہے تاکہ اسلام اس سیاسی نظریہ کو بیان کرے؟ یہ ایک ایسا مشہور سوال ہے جو صدیوں سے مختلف ممالک اور مختلف معاشرہ میں ہوتا آیا ہے، ہمارے ملک میں بھی یہ سوال مورد بحث چلا آیا ہے خصوصاً مشروطیت کے زمانے سے آج تک اس سوال پر کافی زور دیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بحث بھی ہو چکی ہے، البتہ امام خمینی کے بیانات کے پیش نظر اور مرحوم شہید مدرس کے مشہور و معروف جملہ کہ ”ہمارا دین عین سیاست اور ہماری سیاست عین دین ہے“ جس نے ہمارے ذہن میں نقش بنا لیا ہے، اور یہ مسئلہ ہم لوگوں کے لئے واضح اور روشن ہو چکا ہے، اور ہم اپنے لئے اس سوال کا واضح جواب رکھتے ہیں، لیکن اسلام کے سیاسی نظریہ اور دین کی سیاست میں دخالت جیسے مسائل پر تحقیق اور بررسی کی ضرورت ہے۔

مغربی تمدن میں دین کو جامعیت نہیں دی گئی ہے اور اس کو محدود کر کے پیش کیا گیا ہے کہ دین کا تعلق اجتماعی و سیاسی مسائل سے نہیں ہے، فقط دین کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ ہونا چاہئے اور فرد کا رابطہ خدا سے کیا ہے اس اس چیز کو دین کے اندر مغربی تمدن کے نزدیک بیان کیا جاتا ہے، لہذا سیاسی، اجتماعی، بین الاقوامی، حکومت اور لوگوں کے درمیان روابط اور حکومتوں کے آپسی روابط یہ سب انسان اور خدا کے رابطہ سے جداگانہ چیزیں ہیں، یعنی ان کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے دین ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس کے اندر انسان کے فردی مسائل اجتماعی مسائل شامل ہیں اور اس کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ اور انسان کا آپس میں رابطہ اور دیگر سیاسی، اجتماعی اور بین الاقوامی روابط بھی شامل ہیں یعنی دین کے اندر یہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں، کیونکہ اسلام کے اعتبار سے خداوند عالم تمام دنیا پر حاکم ہے لہذا سیاست، اقتصاد (معاش) تعلیم و تربیت، مدیریت اور وہ تمام مسائل جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں وہ سب دینی احکام میں شامل ہیں۔

۳۔ اسلامی سیاسی نظریہ کا بنیادی ہونا

اب جبکہ ہم نے قبول کر لیا کہ اسلام حکومت اور سیاست کے سلسلے میں اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے، اور حکومت و سیاست کے بارے میں اسلام کی طرف ایک خاص نظریہ کی نسبت دی جاسکتی ہے، اس نظریہ کی ماہیت و کیفیت کے بارے میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔

کیا اسلام کا سیاسی نظریہ ایک بنیادی نظریہ ہے یا کسی نظریہ کی تقلید ہے؟ یعنی کیا اسلام نے یہ نظریہ اختراع اور ایجاد کیا ہے اور خدا کے نازل شدہ تمام احکام تعبدی کی طرح اس نظریہ کو پیش کیا ہے یا یہ کہ اسلام نے کسی ایک نظریہ کو لے کر اس کی تائید کر کے پیش کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اسلام نے بہت سے مسائل میں سیرت عقلاء کی تائید کی ہے، جسے اصطلاحاً اسلام میں ”امضاء روش عقلاء“ کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر عام انسان جس طرح کے معاملات کرتے ہیں مثلاً خرید و فروخت، کرایہ، بیمہ وغیرہ ان کو سیرت عقلانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کہ لوگوں نے ان کو ایجاد کیا ہے اور شارع مقدس نے ان کی تائید فرمائی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ اسی طرح ہے کہ عقلاء نے کچھ حکومت و سیاست کے بارے میں نظریہ قائم کیے اور ان کو قبول کیا، اور شارع مقدس نے بھی ان نظریات کی تائید کرنے کے بعد قبول کر لیا ہے؟ یا یہ کہ خود اسلام نے اس سلسلے میں اپنا ایک خاص اور اختراعی نظریہ پیش کیا ہے؟ اور دنیا کے تمام نظریات کے مقابلے میں اسلامی حکومت کے بارے میں پیش کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں سیاسی و اجتماعی زندگی کے لئے بنیادی و اختراعی اصولوں پر مشتمل ایک مجموعہ پیش کیا ہے، نہ یہ کہ اسلام کے نظریات تقلیدی اور تائیدی ہیں جو حضرات حکومت کے مختلف اشکالات اور سیاسی فلسفہ سے آگاہی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں مختلف نظریات موجود ہیں جن میں سے ایک نظریہ ”تنوکر اسی“ (الہی حکومت) بھی ہے یہ نظریہ عیسوی صدی کے وسط میں یعنی تقریباً ایک ہزار سال پہلے یورپ میں کلیسا (عیسائی کی عبادت گاہ) کی طرف سے پیش کیا گیا مخصوصاً کیتھولک عیسائیوں کے کلیسا کا کہنا یہ تھا کہ ہم لوگ خدا کی طرف سے لوگوں پر حاکم ہیں، اس کے مقابلے میں عیسائیوں کا دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے تھا کہ حضرت عیسیٰ مسیح (ع) کا دین سیاست سے جدا ہے، یعنی دین اور سیاست میں کوئی ربط نہیں ہے۔

بہر حال دوسرے فرقے کا اعتقاد یہ تھا کہ پاپ کو حکومت کا حق ہے، اور خدا کی طرف سے کلیسا کو ایسا صاحب اقتدار ہونا چاہئے جو لوگوں پر خدا کی طرف سے حکومت کر سکے، اور لوگوں کو بھی خدا کے حکم سے پاپ کی اطاعت کرنا چاہئے اس نظریہ کو تنوکر اسی حکومت نام دیا گیا۔

جب یہ کھاجاتا ہے کہ اسلام عام لوگوں کی ایجاد شدہ حکومت کے علاوہ اپنے خاص نظریہ کے تحت اسلامی اور الہی حکومت کو پیش کرتا ہے تو کیا اس سے بھی تنوکر اسی حکومت مراد ہوتی ہے جسے مغرب اور یورپ میں سمجھا جاتا ہے اور الہی حکومت ان کے تمدن میں اسی معنی میں پہچانی جاتی ہے؟ اور جس طرح تنوکر اسی حکومت میں خداوند عالم نے حاکم کو وسیع پیمانے پر اختیارات دیئے ہیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں پر حکومت کر سکتا ہے اور لوگوں پر بھی واجب ہے کہ اس حاکم کی مرضی کے مطابق عمل کریں؟ کیا حکومت الہی و ولایی کے مطابق بھی جس کا ہم دعویٰ کرتے ہیں اور اسلام کے ولایت فقیہ کے نظریہ کے تحت کیا ولی فقیہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں پر حکومت کا حق رکھتا ہے اور کیا اس کو یہ بھی حق ہے کہ جس طرح وہ چاہے قوانین بنا کر ان کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرے، اور لوگوں پر بھی اس کی اطاعت واجب ہے؟

یہ سوال بہت اہم ہے اور ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ایک مناسب بحث اور تحلیل کی ضرورت ہے تاکہ اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے۔

مذکورہ سوال کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جس الہی حکومت کے ہم معتقد ہیں اور وہ تنوکر اسی حکومت (جو مغرب اور یورپ میں معروف ہے) زمین تا آسمان فرق رکھتی ہے، یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ الہی حکومت اسلام کی نظریں وہی حکومت ہے کہ جس کے عیسائی خصوصاً فرقہ کیتھولک خدا اور پاپ بارے میں قائل ہیں۔

سیاسی صاحب نظر افراد نے حکومت کے نظریات کی کثرت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ڈکٹیٹری حکومت (شہنشاہی حکومت)

(۲) ڈیموکریٹک (جمہوری حکومت) اگرچہ ان دونوں کی بہت سی قسمیں موجود ہیں لیکن کلی طور پر حکومت کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ایسی حکومت جس میں حاکم اپنی مرضی سے حکومت کرتا ہے اور خود فرمان جاری کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے اپنی حکومت کو چلاتا ہے اور اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔

دوسری قسم ایسی حکومت جس میں لوگوں کی رائے دخالت رکھتی ہے اور لوگ اپنی مرضی سے اپنے حاکم کو چنتے ہیں اور حاکم بھی لوگوں کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں یعنی ان کی حکومت لوگوں کے ارادے اور ان کی چاہت پر موقوف ہوتی ہے۔

۳۔ اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان

جن لوگوں نے حکومت کے سلسلہ میں مغربی تقسیم کو قبول کیا ہے اور معتقد ہیں کہ حکومت دو حال سے خالی نہیں ہے حکومت یا ڈکٹیٹری ہے یا ڈیموکریٹک اور جمہوریت، اب یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹری حکومت ہے یعنی جو بھی حکومت

پر ہو مختار ہے مثلاً ہمارے زمانہ میں ولی فقیہ اپنی طاقت و قدرت اور اسلحہ کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے یا اسلامی حکومت کا کوئی نیا انداز ہے؟ یا اسلامی حکومت کی کوئی تیسری شکل ہے کہ نہ ڈکٹیٹری ہے اور نہ جمہوریت؟

بہر حال حکومت کی دوگانہ تقسیم ایسی ہیں جن کو تمام لوگوں نے قبول کیا ہے لہذا اسلامی حکومت مذکورہ تقسیم سے خارج نہیں ہے یا یہ حکومت ڈکٹیٹری ہے یا جمہوری اگر اسلامی حکومت جمہوری ہے تو اسلامی حکومت کو یورپی حکومت میں پائے جانے والے طور طریقے اپنانا چاہئیں، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسلامی حکومت ڈکٹیٹری حکومت ہوگی جو صرف خاص فرد کی مرضی پر تکیہ زن ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں تیسرے نظریہ کو انتخاب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لہذا ضرورت ہے اس چیز کی کہ اس اہم سوال کا جواب دیں اور بیان کریں کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹری ہے یا جمہوری یا کوئی تیسری قسم انہیں سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے مقدمات اور اس کے ارکان کیا ہیں؟ وہ کون سے ارکان ہیں کہ جن پر حکومت اسلامی کو توجہ رکھنی چاہئے تاکہ واقعی طور پر حکومت اسلامی ہو سکے؟ جو حضرات ہمارے مذہب اور فقہ کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اگر نماز کے ارکان میں کوئی ایک بھی رکن چھوٹ جائے چاہے عمداً طور پر چھوڑا جائے یا سھواً چھوٹ جائے اس کی نماز باطل ہو جائیگی درحقیقت ارکان نماز سے ہی نماز ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے ارکان ہونا چاہئیں کہ اگر وہ ارکان موجود ہوں تو اس حکومت کو اسلامی حکومت کھا جائے گا اور اگر وہ ارکان نہیں ہیں یا اگر ان میں خلل (کی و زیادتی) پائی جائے تو اس کو حکومت اسلامی نہیں کھا جائے گا۔

انہیں ارکان کی اہمیت کے پیش نظر جن پر اسلامی حکومت موقوف ہوتی ہے، ہم ان ارکان سے آگاہ ہونے کی خاطر ان کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ جب ہم ان ارکان کو پہچان لیں گے تو اسلامی حکومت کا معیار و ملاک ہمارے ہاتھ میں آجائے گا کہ جس کے ذریعہ سے ہم اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کے فرق کو مکمل طریقہ سے پہچان لیں گے اسی وجہ سے اس اہم سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔

۵۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ، اس کے اختیارات اور وظائف کی وسعت

اس سلسلہ کا ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے حکومت اسلامی کی ایک خاص شکل و صورت معین کی ہے؟ جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ آج کی اس دنیا میں حکومت کے کیا ڈھانچے اور طور طریقے ہیں اور قدیم زمانے میں بھی حکومت کی شکل و صورت ہوتی تھی جو اس وقت نہیں ہے۔

موجودہ حکومتوں کی بعض قسمیں اس طرح ہیں:

۱۔ بادشاہی حکومت، مشروطہ و مطلق۔

۲۔ جمہوری حکومت (ریاستی یا پارلیمنٹ کی حکومت)۔

۳۔ الہی حکومت۔

کیا اسلام نے حکومت کی ان شکلوں میں سے کسی ایک کو قبول کیا ہے یا اسلام نے خود ایک خاص شکل معین کی ہے جو مذکورہ شکلوں سے فرق رکھتی ہے یا یہ کہ اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص طریقہ کو نہیں اپنایا، اور فقط حکومت کے لئے چند معیار معین کئے ہیں جن کا ہر طرح کی حکومت میں لحاظ کرنا ضروری ہے؟ مثال کے طور پر اسلام کا حکم ہے کہ حکومت میں عدالت کا لحاظ رکھا جائے لیکن عدالت کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ کیا عدالت زمان و مکان کے اعتبار سے لحاظ کی جائے؟ چنانچہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں کسی بھی وقت بھی زمان و مکان کے اعتبار سے اس طرح کی عدالت لحاظ کیا جاسکتا اور اسلام نے ایک خاص شکل و صورت کی عدالت برتنے پر اصرار نہیں کیا ہے؟! اور اسلام کی نظر میں حکومت کی مناسب شکل اس کے معیار کی رعایت پر ہے۔ اور اگر اسلام نے حکومت کے لئے کسی خاص شکل و صورت کا انتخاب کیا ہے تو کیا اسلام کی نظر میں اس حکومت کا ڈھانچہ ایک ثابت اور پائیدار ڈھانچہ ہے؟ یا یہ کہ اس کا ڈھانچہ غیر پائیدار ہے کہ جس میں اکثر و بیشتر تبدیلی و تغیر ہو سکتی ہے؟

اس طرح کے سوالات اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل و صورت کے بارے میں ہوتے رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کے جوابات بھی دئے جائیں۔ فلسفہ حکومت کے سلسلے میں ایک دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اسلامی حاکم اور رئیس چاہے وہ کوئی ایک فرد ہو یا ایک گروہ یا ایک مجلس و انجمن کی شکل میں ہو، یعنی اسلامی حکومت کے اختیارات کیا کیا ہیں؟ اور اسی طرح حکومت کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ کیونکہ گزشتہ زمانے اور عصر حاضر کی حکومتوں میں ذمہ داریوں کے لحاظ سے کافی فرق نظر آتا ہے بعض حکومتیں اختیارات اور وظائف کے لحاظ سے کافی محدود ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ بعض حکومتیں فقط لوگوں کی عام حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہیں جو اہم ہوتے ہیں، اور اکثر کاموں میں خود لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن بعض حکومتوں کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں اس کے وظائف اور ذمہ داریاں بھی وسیع ہوتی ہیں اس حکومت کی ذمہ داریاں بہت مہم اور خطر ناک ہوتی ہیں کہ جن کے بارے میں اسے جواب دہ ہونا ہوتا ہے اور ان ذمہ داریوں کو تمام لوگوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ لوگوں کو حق ہے کہ وہ حکومت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں مطالبہ کریں۔

اسی طرح یہ بھی روشن ہونا چاہیے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ کے تحت اسلامی حکومت نے کیا کیا اختیارات و ذمہ داریاں معین کی ہیں اور بلاشبہ یہ اختیارات و ذمہ داریاں مناسب اور متعادل ہونی چاہئیں، جن مقدمات پر کوئی کام موقوف ہو ان مقدمات کو فراہم نہ کر کے کسی کے سپرد کوئی ذمہ داری کی جائے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

بہر حال اسلامی حکومت کے اختیارات اور اس کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ اس اہم سوال کے بارے میں ہم گفتگو کریں گے۔

۶۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار اور چند دیگر سوالات

آج کے انہیں اہم سوالوں میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ حکومت اسلامی میں لوگوں کا کردار کیا ہے؟ لوگوں کے اختیارات اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ انہیں سوالوں میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ صدر اسلام میں حضرت رسول خدا، حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی حکومتوں کی کیا شکل تھیں؟ اسی طرح بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ کی حکومتیں کس حد تک اسلامی تھیں؟

اور جس وقت ہم اسلامی حکومت کی گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد مذکورہ حکومتوں سے کون سی حکومت مراد ہوتی ہے؟ اور تاریخ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کس طرح ہوتی آئی ہے کہ نتیجہً اسلامی حکومت کی یہ شکل اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایران میں بھی وجود میں آئی؟

البتہ مذکورہ سوالات کے ضمن میں دوسرے جزئی سوال بھی ہوتے ہیں منجملہ یہ سوال کہ کیا ہماری یہ حکومت سو فی صد اسلامی حکومت ہے؟ اور کیا اس میں اسلامی حکومت کے تمام معیار و ضوابط موجود ہیں؟ اور اگر اس میں وہ تمام معیار و ضوابط موجود ہیں تو کیا اس حکومت نے ان کی رعایت کی ہے؟ اسی طرح یہ سوال کہ اس حکومت میں کیا کیا نقص ہیں؟

۷۔ اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے

قبل اس کے کہ ہم مذکورہ سوالات اور شبہات کا جواب دیں اور فلسفہ سیاسی اسلام میں وارد ہوں اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس روش و طریقے کو پہلے بیان کر دیں جس کو مذکورہ بحث کی تحقیق اور بررسی میں اپنائیں گے اس بحث کی متدلوثری (طور و طریقہ) کیا ہے، بہر حال یہ ایک مقدماتی بحث ہے کہ جس کو شروع میں بیان کر دینا چاہئے، کیا یہ ہماری بحث کا طریقہ اور عقلی روش ہے؟ یعنی کیا ہم عقلی دلیلوں کے ذریعہ اسلام کے نظریات کو بیان کریں گے؟ یا ہماری روش اور شیوہ بحث تعبدی اور نقلی ہوگا یعنی قرآن و سنت کے تابع ہے؟ گویا اس حکومت کے اصول و ضوابط قرآن و روایات سے اخذ کئے جائیں گے؟

یا یہ کہ اسلامی سیاست ایک تجربہ کی طرح ہے؟ کہ جس کے درست اور غیر درست ہونے کو تجربہ ہی ثابت کر سکتا ہے؟ اس صورت میں ہماری گفتگو کا شیوہ تجربہ ہوگا اور فیصلہ کرنے کا معیار بھی تجربہ ہوگا۔

بہر حال چونکہ ہماری بحث عقلانی پہلو رکھتی ہے اسی وجہ سے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عقلی بحث کی کم از کم دو قسمیں ہیں:

(۱) جدلی طریقہ -

(۲) برہانی اور دلائل کا طریقہ -

جس وقت ہم کسی گفتگو کو شروع کرتے ہیں اور عقلی لحاظ سے کسی ایک موضوع کی تحقیق کرتے ہیں تو کبھی ایسے اصول و مقدمات سے بحث کر کے مجھول نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جن مقدمات اور اصول کو ہم اور ہمارا مخالف قبول کرتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ برہانی راہ و روش ہے کہ جس میں تمام مقدمات بھی مورد بحث قرار پاتے ہیں گویا بحث خود قضا یا اولیہ و یقینیات و بدیہیات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذریعہ ہمارا استدلال اور برہان یقینی اور قطعی قرار پائے، اور ظاہر ہے اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو بحث طولانی ہو جائے گی۔

مثال کے طور پر اگر ہم برہان کے ذریعہ ثابت کرنا چاہیں کہ حکومت اسلامی میں عدل و انصاف رعایت ہونا چاہئے تو سب سے پہلے ہمیں عدل کے مفہوم اور معنی کو واضح کرنا ہوگا اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دیں کہ عدالت کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ اسی طرح یہ سوال کہ عدالت اور آزادی ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں یا نہیں نیز اسی طرح یہ سوال کہ عدالت کے معیار کو کون معین کرے؟ کیا عدالت کے معیار کو خداوند عالم معین کرے یا عقل؟

مذکورہ سوالات کے حل ہونے کے بعد یہ سوال ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں عقل کس حد تک فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے؟ کیا عقل کی قضاوت ایک خاص مقدار میں ہے یا مطلق طور پر اس طرح یہ بحث طول پکڑ جاتی ہے یہاں تک کہ اصول اولیہ اور مسائل معرفت شناسی کے بارے میں مورد سوال قرار پاتے ہیں بہر حال ان کو بھی واضح و روشن ہونا چاہئے، خلاصہ یہ عقل کیا ہے؟ اور اس کی دلالت کس طرح کی ہے؟ عقل کس طرح استدلال کرتی ہے؟ اور عقل کا اعتبار اور اس کا حکم کس حد تک قابل قبول ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اگر ہم اس طرح کے مسائل پر تحقیق کریں تو مختلف علوم سے بحث کرنی پڑے گی، جو ایک طولانی مدت چاہتی ہے جو مفقود ہے۔

بہر حال برہانی بحث کرنا اپنی جگہ مقدس اور محترم ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی اشارہ کیا کہ برہانی و استدلالی بحث کرنے کے لئے بہت سے علوم کا سہارا لینا پڑتا ہے اور بہت کم افراد ہی ان علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور علم کے ماہر انسان اس کے محدود مسائل تک ہی رسائی رکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ یہ کام کافی مشکل ہے اور اس طرح کے مسائل کو واقعاً حل کرنے ایک طویل مدت درکار ہے ہم بھی اپنی گفتگو میں اگر اسی برہانی راستہ کو اپنائیں اور الگ الگ مسائل سے بحث کر کے بدیہی اصول اور بنیادیں پہنچیں تو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، لہذا اپنی بحث کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، اسی وجہ سے جہاں برہانی بحث سادہ اور غیر پیچیدہ ہے وہاں برہانی اور استدلالی بحث کریں گے اور اس کے علاوہ تمام موارد میں جدلی بحث کریں گے کیونکہ جدلی بحث کا مناسب ترین طریقہ ہے۔

در حقیقت یہ ہدف اور نتیجہ تک پہنچنے کے لئے یہ راستہ درمیانی راستہ ہے، یعنی یہ راستہ دوسروں کو قانع کرنے کے لئے عام راستہ ہے، خداوند عالم نے قرآن مجید میں بارہا دشمن کو قانع کرنے کے لئے اور اپنی طرف سے اتمام حجت کے لئے اس کو بیان کیا ہے، اور ہمیں بھی حکم دیا ہے کہ ہم بھی اس راستہ کو اپنائیں اور دوسروں سے اسی کے ذریعہ بحث اور گفتگو کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾^(۱)

”حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو، اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث و جدل کرو۔“

حوالہ

اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت

ہم نے پہلے جلسہ میں اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت اس سلسلے کے منتخب مسائل کو بیان کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس سلسلے میں ہم کیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، آج ہم خداوند عالم کی مدد سے اس سلسلے میں بحث کریں گے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کتنی مہم اور ضروری ہے۔

۱۔ اسلامی انقلاب سے مغرب و مشرق کا برتاؤ

اس بحث کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے لئے ایک نگاہ اپنے ملک اور اس زمانے کے اسلامی ممالک کی تاریخ پر نظر ڈالیں، اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ دنیا پرست، قدرت طلب، زورگو افراد ہمیشہ تاریخ میں فتنہ و فساد کے باعث بنے ہیں اور جس طرح انسان کی زندگی ماڈرن ہوتی جا رہی ہے اور حکومتیں قاعدہ و قانون اور علم کی بنیاد پر ترقی کی طرف گامزن ہیں، فتنہ و فساد کی فعالیت بھی عملی تر اور قواعد و ضوابط کے بنیاد پر دقیق تر ہوتی جا رہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی طاقتیں اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہیں کہ دنیا کی دو بڑی سوپر طاقت یعنی مغرب کی ٹرومنڈ طاقت اور مشرق کی مارکسٹ اور کمیونسٹ طاقت موجود ہیں اور جنگ کی کامیابی کے بعد دونوں طاقتوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی قدرت سے دوسرے ممالک کو بھی خوف زدہ کیا جائے تاکہ وہ ان کے مقابلہ میں سر نہ اٹھا سکیں۔

اور جب بھی کسی نے ان فتنہ گر اور مفسدوں کے مقابلہ میں سر اٹھایا ہے اسکو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان ظالم و ستم گروں کا مقابلہ کرنے والے انبیاء اور ان کے پیروکار تھے جو کسی بھی زمانہ میں ستم گروں و ظالموں کے مقابلہ میں تسلیم نہیں ہوئے اسی وجہ سے ظالم و ستم گروں نے انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو اپنا دشمن سمجھا اور ان کے ساتھ دشمن جیسا سلوک کیا، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد، خصوصاً کلیسا کو جو یورپ میں دینی قدرت کا مظہر تھا میدان سے خارج کرنے بعد یہ گمان کر بیٹھے کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان کے مقابلہ میں آسکے۔

لیکن بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں غیر یقینی طور پر ایران کے انقلاب کو دیکھتے ہوئے بہت تعجب ہوا، شروع میں تو یہ سوچا کہ کہ ایران کا یہ انقلاب ان دوسری انقلابی تحریکوں کی طرح ہے جو کبھی کبھی اسلامی ممالک میں ہوتی چلی آئی تھیں کہ جن کو کئی طور پر نیست و نابود کر دیا گیا تھا، انھوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ ہم اپنے مخصوص تجربات کے ذریعہ اس انقلاب کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں گے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا انھوں نے دیکھا کہ یہ انقلاب تو دوسری تحریکوں سے بہت نمایاں فرق رکھتا ہے۔

بہر حال اسلامی انقلابِ ایران کے نتیجہ میں اس منطقہ میں ایک بڑی طاقت رونما ہوئی، انقلاب اسلامی نے مشرق و مغرب پر بھروسہ نہ کیا اور نہ ہی بغاوت جیسی تحریکوں اور فوجی ٹکراؤ کا سہارا لیا، بلکہ غرب کو ناکام کرتے ہوئے اسلامی حکومت تشکیل دیدی۔

اسلام دشمن طاقتوں کے پاس دینداری سے مقابلہ کا جو کچھ تجربہ تھا وہ سب انقلاب اسلامی کے نابودی کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے، آپ حضرات کے لئے تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم فقط اشارہ کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔

شروع انقلاب میں ملکی حالات کو خراب کرنے کی کوشش کی، اس امید میں کہ یہاں پر ایسی ایک حکومت تشکیل دی جائے جو مغرب کے لئے کام کرے، لیکن انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کی طاقت و قدرت اس سے کھیں زیادہ ہے کہ یہ گروہوں کو تحریک کر کے انقلاب اسلامی کے لئے کوئی خطرہ ایجاد کریں یہاں تک کہ اپنے مختلف حربے استعمال کینے منجملہ یہ کہ ایران پر اقتصادی پابندی لگا ئی عراق کے ذریعہ آٹھ سال تک جنگ تھوپی ان تمام حربوں کے ذریعہ انقلاب اسلامی کو ناکام کرنا چاہتے تھے لیکن خدا کے فضل سے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

۲۔ جوانوں کی گمراہی کے لئے مغرب کا ایک ثقافتی حربہ

چونکہ دشمن کسی بھی میدان میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس کی امید صرف جوانوں پر آکر رکی کہ ایران کے جوانوں کے لئے فرہنگ (کلچر) کے لحاظ سے ایک طولانی مدت پروگرام بنایا جائے، اور اس پروگرام کے تحت مختلف طریقوں سے ملک میں نفوذ کرنا چاہا (کیونکہ اس سلسلے میں ان کے پاس کافی تجربہ موجود تھا) ان کی کوشش یہ تھی کہ ایک ایسا مرکز بتایا جائے کہ جس کے ذریعہ اپنے افکار و نظریات کو نشر و اشاعت کی جائے اور اس مرکز کے ذریعہ ملت کے مختلف لوگوں تک اپنی تبلیغاتی لہریں پہونچائی جائیں تاکہ اہستہ اہستہ اپنی مرضی کے مطابق ماحول بنایا جائے، ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں بھی دوسرے پروگراموں کی طرح انھوں نے اپنے علمی حساب و کتاب کے تحت پروگرام بنایا۔

چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ انقلاب کی نسل بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے، اور مستقبل کی نبضوں کو جوانوں کے ہاتھوں میں دیکھا (وہ جوان کہ جو شاہ کے ظلم و ستم سے آگاہ نہیں ہیں اور نہ ہی انقلاب سے پہلے والے اور انقلاب کے بعد والے اسلامی رزمندوں کی جانثاروں سے آگاہ ہیں، اور صرف وہ اپنی خواہشوں کے پیروں ہیں ان کی مرادیں کبھی مادیات ہوتی ہیں اور کبھی خواہشات) تو یہ کہ جوان طبقہ جو اس وقت ملت کی اکثریت ہے اس میں کسی طرح سے رسوخ پیدا کیا جائے اور اہستہ اہستہ اپنی مرضی کے مطابق ایسی حکومت بنوائیں جو ان کے نفع کیلئے کام کرے، اور وہ اسی کشمکش میں تھے کہ پروگرام کو کہاں سے شروع کیا

جائے، اور اس جوان نسل کے افکار و عقائد میں کس طرح نفوذ کیا جائے، تاکہ ان کی امیدوں کیلئے زینہ فراہم ہو سکے، چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں بہت اسٹیڈی کی کہ آخر اس قدر لوگ کیوں حکومت اسلامی کے حامی اور وفادار ہیں یہاں تک کہ تمام مشکلات مالی، مہنگائی، بمباری اور دوسری پریشانیوں کو بھی برداشت کر رہے ہیں پھر بھی حکومت اسلامی کی حمایت سے باز نہیں آتے، ان تمام چیزوں کو دیکھ کر دشمن اس نتیجہ پر پہونجا کہ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ دین اسلام کے معتقد ہیں۔

۳۔ فرہنگی تین حربے

کیونکہ ایرانی قوم اہل بیت علیہم السلام کے پیروں ہیں اور ائمہ علیہم السلام اور امام حسین علیہ السلام کو اپنے لئے نمونہ عمل بنایا ہے، اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے لئے اپنی جان و مال بھی قربان کر سکتے ہیں اور ان کو یہ اعتقاد ان کی ماں نے دودھ میں پلایا ہے، اور جب تک زندہ رہیں گے، یہ عقیدہ ان کے دلوں میں باقی رہے گا مگر دشمن اس عقیدہ کو کم رنگ کرنا چاہتا ہے، اور دشمن کی تمنا یہ ہے کہ آئندہ آنے والی نسل میں اس طرح کا عقیدہ باقی نہ رہے اور اس طرح اسلامی حکومت اور اسکے ذمہ دار افراد سے بدظن کر دیں، کیونکہ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام ہمارا حاکم ہے، اور حکومت کے حقدار علماء اور دیندار افراد ہیں جن کی سرپرست ولی فقیہ ہے، اور جب تک یہ عقیدہ جوانوں کے درمیان موجود ہے اس حکومت اسلامی کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔

چنانچہ دشمن نے سوچا کہ اس اعتقاد کو ختم کرنا چاہئے لیکن کس طرح؟ ظاہر ہے کہ یہ افکار روشن فکر طبقہ کے ذریعہ ہی ان تک پہونچائے جاسکتے ہیں، لہذا یونیورسٹی اور ثقافتی مراکز کے درمیان ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے ذریعہ یہ افکار ملت تک پہونچائے جائیں، اور ایسے افراد کو بروئے کار لایا جائے جو ان کے افکار کو پھیلانے اور حداقل لوگوں کے دلوں میں خصوصاً جوان طبقہ میں شک و وسوسہ پیدا کریں اور اسلامی حکومت، ولایت فقیہ کی نسبت ان کے عقائد کو ڈاڈول اور کم رنگ کیا جائے، جوانوں میں حکومت اسلامی کی نسبت عقیدہ کو کم رنگ کرنا ہی ان کا مطلوب ہے کیونکہ اگر ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا تو پھر کوئی دوسرا ۱۳ سالہ نوجوان کمر سے بم باندھ کر ٹینک کے نیچے نہیں جائے گا، یہ کام تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب آخرت اور حساب و کتاب پر ایمان ہو اور اپنے صحیح راستہ کو جانتا ہو، لیکن اگر شک پیدا ہو جائے تو کافی ہے ایک قدم آگے بڑھانے اور پھر پیچھے ہٹ جائے اور یہ شک و تردید دشمن کے لئے کافی ہے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

انہیں مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے زر خرید غلاموں (کہ واقعاً جنھوں نے دھوکہ کھایا) اور اپنے مختلف تجربوں، اور ان لوگوں کے ذریعہ کہ جن کے عقائد واقعاً ضعیف و کمزور ہیں مخفیانہ طور پر ذریعہ اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کیا اور درج ذیل چیزوں کے ذریعہ اپنا کام شروع کیا۔

الف: دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا

دشمن کا سب سے پہلا کام دین کو سیاست اور حکومت سے جدا کرنے کی فکر کو رائج کرنا تھا اس مسئلہ کی تبلیغ کے لئے راستہ بحمد کافی ہموار تھا کیونکہ صدیوں سے مغرب اور یورپ میں اس سلسلہ میں کافی کام ہو چکا تھا بہت سی کتابیں لکھی گئیں کافی مقدار میں ریسرچ کی گئی تھیں جس کے نتیجے میں مغربی ممالک میں یہ فکر رائج ہو چکی تھی کہ دین سیاست سے الگ ہے۔

اپنے اسی ہدف کو حاصل کرنے کے لئے ایران میں بھی راستہ ہموار کیا کہ کم از کم کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہو کہ دین سیاست سے جدا اور الگ ہے اگرچہ اس کے لئے تھوڑا بہت راستہ پہلے سے ہی ہموار تھا کیونکہ انقلاب سے پہلے بھی اور انقلاب کے بعد بھی بعض وہ لوگ جو حکومت کے کارکنان تھے ایسا عقیدہ رکھتے تھے، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ دین اور سیاست میں ایک بہت بڑی دیوار حائل ہے اور اس چیز کے پیش نظر تقریریں بھی ہوئیں، کتابیں بھی لکھی گئیں، چنانچہ اسی نظریہ کو مزید تقویت ان چیزوں کے ذریعہ جو مغربی ممالک میں کارگر ہو چکی تھیں اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا، دی گئی۔

پس معلوم یہ ہوا کہ دشمن کی ثقافتی کارکردگی میں سے ایک، دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا ہے، البتہ اس فکر سے تمام لوگ تحت تاثیر قرار نہ پائے کیونکہ جن حضرات نے اس اسلامی حکومت کے لئے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو قربان کیا تھا، مالی قربانی پیش کی ہے، اور تمام مشکلات کو برداشت کیا ہے، آسانی سے اس فکر سے متاثر نہیں ہونگے، کیونکہ ابھی تک ان کے کانوں میں امام خمینی کی دل نشین آوازیں گونج رہی ہیں، اور مرحوم مدرس کی یہ آواز کہ ”دیانت ماعین سیاست ما است“ (ہماری دینداری اور ہماری سیاست ایک ہی ہے) کو اتنی آسانی سے نہیں بھلا سکتے تھے۔

ب: ولایت فقیہ کا انکار

دشمن اور مغرب زدہ روشن فکری کی کارکردی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ملت میں یہ فکر ایجاد کریں کہ اگرچہ سیاست اور اجتماعی کاموں میں دین دخالت رکھتا ہے اور معاشرہ میں بھی اسلامی احکامات جاری ہونے چاہئے، اور سیاست میں بھی دینی امور کی طرف توجہ ہونا چاہئے، لیکن اسلامی حکومت کے معنی فقہاء کی حکومت نہیں ہے بلکہ اسلامی پارلیمنٹ میں قوانین کا طے ہونا کافی ہے، بعض قوانین کا دین کے خلاف نہ ہونا اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں دین کے مطابق قوانین جاری ہو گئے اور بس، اسلامی حکومت کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

پس دوسرا حصہ دشمن کی سیاست کا یہ تھا کہ اگر تمام لوگوں کو اس بات پر قانع نہ کر سکے کہ دین سیاست سے الگ ہے اور وہ اس بات کے قائل رہے کہ دین اور سیاست باہم ہیں تو ہم کھیں گے کہ دین اور سیاست باہم ہیں لیکن دینی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ دینی احکام جاری ہوں، لیکن ان احکام کا مجری (جاری کرنے والا) کون ہے؟ اس مسئلہ کا دین سے کوئی ربط نہیں، بلکہ احکام دینی کو

جاری کرنے کے لئے لوگوں نے جس کا انتخاب کر لیا وہی حاکم ہے، پس اسلامی حکومت کا مطلب اسلامی قوانین کا جاری کرنا ہے، نہ کہ حاکم متدین، مومن اور فقیہ ہو، یعنی دین کی سیاست میں دخالت کو قبول کرتے ہیں لیکن دین احکام کا مجری فقیہ اور مجتہد ہو اس کو قبول نہیں کرتے، یا یہ کہ حکومت کا سربراہ ولی فقیہ ہو، غیر قابل قبول ہے۔

اس سلسلہ میں (یعنی ولایت فقیہ کے ذریعہ حکومت نہ ہونے کے سلسلہ میں) بہت کوششیں کیں اور اس وقت بھی ان کی یہ کوشش جاری ہے، مختلف اخباروں، ماہناموں اور دیگر مختلف طریقوں سے ان مطالب کو منتشر کیا جا رہا ہے اور اسی سلسلہ میں یونیورسٹی اور دوسرے مراکز میں میٹنگ کرتے رہتے ہیں تاکہ ابھی تک جو متدین حضرات دین کو سیاست سے جدا نہ ہونے کا نظریہ رکھتے ہیں ان کے ذہنوں میں یہ فکر ڈالیں کہ اسلامی حکومت قابل قبول ہے لیکن ولایت فقیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس قسم کا تبلیغی مشن، اسلامی احکامات اور فقہی بنیادوں سے نابلد جوانوں میں موثر ہو سکتا ہے خصوصاً جبکہ اس سلسلے میں ثقافتی وسائل کے ذریعہ بھرپور تبلیغات کی جائے، اور وسیع مالی امکانات کو اس کے لئے خرچ کیا جائے، لیکن پھر بھی ایسے افراد موجود ہیں جن پر ان کی تبلیغات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور ولایت فقیہ کو جیسا کہ قانون اساسی میں بھی اسی کو محور قرار دیا گیا ہے، اپنی تمام زندگی میں اہمیت دیتے ہیں اور جیسا کہ دنیا بھر میں یہ انقلاب، انقلاب ولایت فقیہ، اور حکومت، حکومت ولایت فقیہ کے نام سے مشہور ہے، اور سبھی ولایت فقیہ کے پابند ہیں۔

ج۔ ولایت فقیہ کو مورد اعتراض قرار دینا

ظاہر ہے کہ جو لوگ ولایت فقیہ کے قائل ہیں ان کے درمیان ان لوگوں نے نفوذ کرنے کا دوسرا طریقہ انتخاب کیا وہ اس طرح کہ لوگوں میں اس فکر کو رائج کیا جائے کہ ایران میں موجودہ ولایت فقیہ مخدوش (قابل اعتراض) ہے، اور اس پر تجدید نظر کی جانی چاہئے اور یہ ولایت فقیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ڈیموکریسی (جمہوریت) اور لیبرالیزم کے اصولوں سے میل نہیں کھاتی، ولایت فقیہ کو اس طرح ہونا چاہئے کہ دور حاضر میں موجودہ ڈیموکریسی سے ہم آہنگ ہو، اور آج کی دنیا میں جو اصول و ضوابط مسلم اور قابل قبول ہیں ان سے ولایت فقیہ متفق ہو، پس دشمن کی تیسری فکری سازش جمہوری اسلامی ایران میں ولایت فقیہ کو مخدوش کرنا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عالمی استکبار اور دشمن اسلام عملی اور فکری تین طریقوں سے اس اسلامی حکومت کو ضعیف کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے خاص پروگرام بھی بنائے اور آج بھی اس طرح کے پروگرام بناتے رہتے ہیں لیکن ان کی امیدیں آنے والی نسل تھی کہ جس لئے انھوں نے ایک لمبا فکری پروگرام بنا رکھا تھا۔

اور اس فکری پروگرام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دین کو سیاست سے دور ہونے کی فکر دے اس امید میں کہ ایک طبقہ اس کو قبول کرے گا۔

دوسرا نظریہ یہ پیش کیا کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کا ولایت فقیہ سے کوئی ربط نہیں ہے، یہ نظریہ بھی ایک طبقہ میں قابل قبول ہو سکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو لوگ ولایت فقیہ پر ایمان راسخ رکھتے ہیں ان میں یہ نظریہ رائج کریں کہ ولایت فقیہ مورد قبول ہے لیکن ایران میں جو ولایت فقیہ ہے اس کی فعلی صورت کو تبدیل ہونا چاہئے، خلاصہ دشمن ہر ممکن ذریعہ سے کوشش میں ہے کہ جوانوں کے درمیان شک و شبہ پیدا کرے تاکہ اسلامی حکومت کے سلسلے میں ان کا اعتقاد ضعیف و کمزور ہو جائے، اور اگر ایسا ممکن ہو تو پھر عالمی استکبار کے نفوذ کے لئے راستہ ہموار ہو جائے گا اور اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں نفوذ ہو جائے گا۔

جو لوگ ان تینوں نظریات میں سے کسی ایک کا شکار ہو گئے چاہے وہ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی مقام و منزلت پر فائز ہوں گویا انھوں نے عالمی استکبار کی مدد اور نصرت کی اور استکبار کو اپنے اغراض و مقاصد تک پہنچنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

۲۔ دشمن کی مذکورہ سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ

چونکہ دشمن نے مذکورہ سازشوں میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے لہذا وہ حضرات جو اس حکومت کو دل و جان سے چاہتے ہیں (اور الحمد للہ لوگوں کی اکثریت اس حکومت کو دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کا نمونہ وہ عظیم مظاہرے ہوتے ہیں جو بعض موقع پر ہوتے رہتے ہیں اور تمام دنیا کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں) ان لوگوں کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ دشمن ان تین طریقوں سے انکے درمیان نفوذ نہ کرے، اور ان کو ایسی کوشش کرنا چاہئے کہ جس سے لوگوں کا یہ عقیدہ راسخ تر ہو جائے کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے اور انہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ دوسرے یں اگر سیاست سے جدا ہوں تو ہوں، لیکن اسلام سیاست سے جدا نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنے دلوں میں یہ نظریہ راسخ کر لیں کہ حکومت اسلامی کا مطلب فقط یہ نہیں کہ پارلیمنٹ میں اسلامی قوانین بن جائیں یا یہ کہ وہ قوانین اسلام کے مخالف نہ ہوں، بلکہ اسلامی حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ قانون کو جاری کرنے والے اسلام کے دلسوز اور اسلام کی پہچان رکھنے والے ہوں اور احکام الہی کو جاری کرنے میں اپنی پوری توجہ صرف کریں، ورنہ اگر قانون کاغذ پر لکھے جائیں اور اس کو جاری کرنے والے ہی ان قوانین کا پاس و لحاظ نہ رکھیں تو اس سے لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا؟

کیا شاہ کے زمانے کے قوانین اساسی میں ایران کا رسمی مذہب شیعہ نہیں تھا؟ لیکن یہ قوانین کچھ بھی کارگر ثابت نہ ہوئے کیونکہ شاہ کی حکومت کافر اور دشمنوں سے بے حد متاثر تھی جس کی وجہ سے اسلامی قوانین پر عمل نہیں ہوتا تھا۔

اگر قوانین صرف کاغذ پر لکھے ہوئے ہوں اور ان کا جاری کرنے والا مومن و متدین اور قدرتمند نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، لہذا اگر اسلامی پارلیمنٹ میں اسلامی قوانین بنائے جائیں لیکن جو شخص ان قوانین کی نظارت کر رہا ہے وہ اسلام کا دلسوز نہ ہو اور اس

قدر قدرت نہ رکھتا ہو کہ ان قوانین کو جاری کر سکے، تو ایسے قوانین کو جاری ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، لہذا دوسری ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم روز بروز ولایت فقیہ کے اعتقاد کو پختہ تر کریں، تاکہ ہمارے یقین میں بھی اضافہ ہو اور ہماری نسلوں میں بھی یہ عقیدہ باقی رہے کہ ولایت فقیہ کے بغیر اسلامی حکومت ناممکن ہے۔

ان دوسروں کے بعد تیسرے مرحلے کی باری آتی ہے کہ یہ ولایت فقیہ کی موجودہ شکل و صورت جو اس وقت ایران میں تقریباً ۲۰ سال سے ہے یہ وہی شکل و صورت ہے جس کو اہل بیت علیہم السلام نے بیان کیا ہے یا یہ کہ اس کی شکل و صورت کو عوض ہونا چاہئے؟

یہ تیسرا مرحلہ ایک فرعی مرحلہ ہے کہ جو گزشتہ دوسروں کے بعد ہے لہذا پہلے ان دوسروں پر بحث کرنا ضروری ہے اور انہیں دو مسئلوں کی بنیاد پر ہماری بحث اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت تشکیل پاتی ہے۔

۵۔ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں بہت ریزاستوں کا انتخاب

مذکورہ مطالب سے واضح ہو جاتا ہے کہ دشمن نے اپنی تمام تر طاقت اپنی مندرجہ ذیل سازشوں میں صرف کر دی:

۱۔ دین و سیاست میں جدائی کرنا۔

۲۔ اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ میں جدائی کرنا۔

۳۔ ایران میں ولایت فقیہ کی کارگردگی میں شک و تردید کا ایجاد کرنا۔

لہذا طبعی طور پر ہمارا بھی تین گروہوں سے مقابلہ ہے پہلا گروہ وہ ہے کہ جس نے یہ قبول کر لیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے یعنی مساجد، اما مبارگاہ جدا ہیں اور سیاست و حکومت جدا ہے، لہذا ان لوگوں سے بحث کرنے کے لئے ہمیں ایک خاص راستہ اپنانا پڑے گا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اسلامی حکومت کو تو قبول کیا ہے لیکن اس کے احکام کے مجری کے سلسلے میں چوں و چرا کرتے ہیں، ان لوگوں سے بحث کرنے کا انداز دوسرا ہونا چاہئے، کیونکہ اگر فرض کریں کہ کوئی خدا ہی کا قائل نہیں ہے تو اس سے بحث اس طرح شروع کی جائے تاکہ خدا کا اثبات ہو سکے اور اس کے بعد نبوت عامہ (تمام انبیاء کی نبوت) اور نبوت خاصہ (حضرت محمد مصطفیٰ کی نبوت) کے بارے میں بحث کی جائے لیکن اگر کوئی خدا اور بعض انبیاء کو قبول کرتا ہو لیکن حضرت محمد مصطفیٰ کی نبوت کا منکر ہو تو اس سے نبوت خاصہ کے سلسلہ میں بحث کی جائے گی۔

بہر حال جو لوگ خداوند عالم کو قبول کرتے ہیں لیکن پیغمبر اکرم کی نبوت کو قبول نہیں کرتے تو آنحضرت کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ پہلے خدا کے اثبات سے بحث شروع کی جائے کیونکہ اس کے لئے یہ طے شدہ ہے کہ کوئی خدا ہے اور

اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجا ہے اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی مناسب راستہ اپنانا چاہئے اور جس سلسلہ میں ہم بحث کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے اصول اور مقدمات پر موقوف ہے کہ بعض لوگ قبول کرتے ہیں اور بعض لوگ ان کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے۔

لہذا مذکورہ بحث کے سلسلہ میں ہمیں بھی چند طریقوں سے بحث کرنا ہوگی اور اس کے لئے مختلف روش درکار ہیں یعنی ممکن ہے بعض جگہ فقط عقلی دلیلوں کے ذریعہ اپنا مدعی ثابت کریں اور جس چیز کو انسان کی عقل درک کرتی ہے اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا سہارا نہ لیں، ایسی صورت میں عقلی برہانوں کے ذریعہ بحث کو آگے بڑھائیں گے بالکل اسی طرح کہ اگر کوئی خدا کو نہ مانتا ہو اور اس کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہو تو ایسے موقع پر قرآن اور معصومین علیہم السلام کی احادیث کے ذریعہ اثبات کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ وہ ابھی خدا کو ہی نہیں مانتا، تو قرآن و حدیث کو کس طرح قبول کر سکتا ہے؟!

اس کو سمجھانے کے لئے فقط عقل سے کام لینا پڑے گا اور اس کو عقلی دلیلوں کے ذریعہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا، اسی طرح جن لوگوں نے اسلامی حکومت کو قبول کیا ہے وہ لوگ ایک قدم آگے ہیں تو ان لوگوں سے بحث کرنے کے لئے ایسا راستہ اپنانا پڑے گا جو دینی باتیں قبول کرتے ہیں ان کے سامنے وہ دلیلیں بیان کریں جو محتوائے دین کو بیان کریں یعنی ان سے بحث کرنے کے لئے قرآن و حدیث اور تاریخی شواہد کو مدد رک قرار دینا ہوگا۔

لیکن اگر حکومت کی کارگردگی کی بحث کی جائے تو تاریخی شواہد و مدارک کو مد نظر رکھ کر بحث کی جائے یہاں پر عقلی نقلی و تعبیدی (قرآن و سنت) بحث نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ہماری بحث بھی مختلف پہلو رکھتی ہے لہذا ہماری بحث بھی مختلف طریقوں سے ہوگی، بعض جگہ عقلی طریقہ سے بحث ہوگی اور بعض جگہ قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث ہوگی، اور بعض دوسری جگہ پر تاریخ کا سہارا لیا جائے گا، یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بعض افراد بحث کے درمیان ہم پر اعتراض نہ کریں کہ یہ بحث عقلی ہے یا شرعی؟ اس وجہ سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب سمجھا کہ ہماری بحث کے مختلف طریقے ہوں گے، بحث کو اس کے مناسب طریقہ سے مورد تحقیق و بررسی قرار دیا جائے گا۔

۶۔ دین کی تعریف اور اس کے حدود

یہاں پر ایک دوسرا مہم مسئلہ بھی ہے جس پر مستقل طور پر جداگانہ بحث ہو سکتی ہے لیکن اس وقت صرف اس کی طرف اشارہ کریں گے:

یہاں پر بحث یہ ہے کہ دین کے حدود کھان تک ہیں؟ جس وقت ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ حکومت و دین میں کیا ربط ہے اور دین و سیاست کا جدا کرنا صحیح ہے یا نہیں۔

تو سب سے پہلے خود دین کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے کہ دین کیا ہے دین کی صحیح تعریف ہمارے پاس ہونا چاہئے تاکہ اس کی بنیاد پر ہم اس کے حدود معین کر سکیں، اس سلسلے میں بعض لوگوں نے سعی فرمائی ہے مگر ایک دوسرے عنوان سے، وہ اس طرح کہ آیا انسان کو دین کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس چیز کو مورد بحث قرار دیتے ہیں اور اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دین کی انسان کی زندگی میں کیا دخالت ہے اس مرحلہ کی تحقیق و بررسی کے بعد ان لوگوں نے اس بحث کو مورد بحث قرار دیا کہ اسلام میں سیاست، دین کا جز ہے یا نہیں؟ بہر حال ان لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت سی بحثیں کی ہیں، جیسا کہ آپ حضرات بھی ان بحثوں سے کم و بیش واقف ہیں۔

”مثلاً دین سے ہماری امیدیں“ یعنی دین سے ہماری امیدیں حد اقل درجہ پر ہیں یا حد اکثر درجہ پر (یعنی کیا دین انسان کی تمام زندگی کے مسائل کو شامل ہوتا ہے؟ یا یہ کہ انسان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو شامل ہوتا ہے، بقیہ امور میں انسانی زندگی کے اکثر مسائل کو عقل و علم اور لوگوں کی مرضی کے مطابق حل ہوتے ہیں) وہ حضرات جو دین کو حکومت سے الگ گردانتے ہیں جس وقت انھوں نے دین کی تعریف فرمائی تو ایسی تعریف کی جو سیکولرزم کے عقیدہ کے موافق تھی مثلاً دین کی یوں تعریف فرمائی کہ: دین یعنی انسان کا خدا سے معنوی رابطہ یا اس سے ایک قدم اور آگے رکھا اور کھادین وہ چیز ہے کہ جو انسان کی آخرت (اگر آخرت کو قبول کرتا ہو) کی زندگی میں موثر اور کارگر ہو، یعنی دین کا کام یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو آخرت سے ہم آہنگ کرے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ اگر دین کی اس طرح تعریف کی جائے تو پھر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دین کا سیاست سے کیا رابطہ؟ سیاست کا خدا سے انسانی رابطہ کا کیا دخل؟ سیاست تو صرف انسانوں کے درمیان ایک دوسرے سے رابطہ کو بیان کرتی ہے، اور سیاست دین سے الگ ہے، سیاست انسان کی دنیاوی زندگی سے متعلق ہے اور اس کا عالم آخرت سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اگر دین کے حدود صرف یہ ہوں کہ جہاں انسان کی عقل سمجھنے سے قاصر رہے اور جہاں عقل خود فیصلہ اور قضاوت نہ کر سکتی ہو تو پھر وہاں دین سے کوئی رابطہ نہیں کیونکہ دین کے حدود وہاں تک محدود ہیں کہ جہاں پر عقل کی رسائی اور پہنچ نہ ہو۔

لہذا اگر ہم نے دین کی مذکورہ تعریف کے مطابق اس کے حدود کو محدود کر دیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ جن مسائل کو ہماری عقل حل کر سکتی ہے وہاں دین کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور ہم کو دین کی ضرورت وہاں ہے کہ جہاں ہماری عقل مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہو، چنانچہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے اور انسان ترقی کر رہا ہے دین کی ضرورت کم ہوتی جا رہی ہے چونکہ اس بنیاد پر دین کی ضرورت وہاں ہے کہ جہاں عقل ان مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہے۔

چونکہ شروع میں انسان علم و تمدن نہیں رکھتا تھا، لہذا اس کو دین کی ضرورت بہت زیادہ تھی اور چونکہ انسان خود اپنی عقل سے مسائل کو نہیں سمجھ سکتا تھا لہذا اس کو دین کی ضرورت تھی اور اہستہ اہستہ اس کو دین کی ضرورت کم ہوتی گئی، اور اس آخری زمانہ میں انسان کو دین کی ضرورت تقریباً نہیں ہے، ہاں بعض ان جزئی مسائل میں ہے جن کو عقل انسان ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہے اور کوئی امید بھی نہیں ہے کہ ان کو جلد ہی حل کر لیا جائے گا، ان مسائل میں ابھی بھی دین کی ضرورت ہے، (افسوس کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور پھر یہ اعتراض اور اشکال کرتے ہیں کہ اس وقت چونکہ عقل بشری کامل ہو گئی ہے، لہذا اب دین و وحی کے قوانین کی ضرورت نہیں ہے) بہر حال مذکورہ دین کی تعریف کے مطابق نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاست کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور جب ہم عقلی کوششوں اور عقلی استدلالوں کے ذریعہ تمام سیاسی مسائل کو حل کر سکتے ہیں، تو پھر دین کیا ضرورت ہے؟

المختصر یہ کہ اب تک جو ہم نے بیان کئے وہ اس سلسلے کے چند اعتراضات اور اشکالات تھے، اور اب ہم اس کا مختصر جواب عرض کرتے ہیں اور شروع ہی گوش گزار کر دیں کہ دین کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر دین کو فقط اضروی زندگی سے مربوط اور خدا سے انسانی رابطہ مانتے ہیں ہماری نظریں باطل اور بے نیاد ہے، اور یہ نظریہ کہ دین سے سیاسی مسائل کا یعنی انسان کے سیاسی مسائل کا خدا سے کوئی ربط نہیں، یہ ساری چیزیں انسان اور خدا کے روحانی رابطہ سے جداگانہ ہیں، یہ بھی بے نیاد اور بے ہودہ گفتگو ہے اور اس کا حقیقت دین سے کوئی ربط نہیں، یہ دین کی نامکمل تعریف ہے، بلکہ دین وہ طریقہ ہے جو انسان کو صحیح رفتار و کردار پر گامزن رکھے یعنی اس طرح انسان کو بنادے کہ جس طرح خدا چاہے، یعنی اگر انسان اپنے اعتقاد اور اپنی فردی و اجتماعی زندگی میں خدا کی مرضی کے مطابق قدم اٹھائے تو ایسا شخص دیندار ہے اور اسکے مقابل اگر انسان کا عقیدہ خدا کی مرضی کے مخالف ہو اور ان عقائد کو قبول کرے جو خدا کو ناپسند ہیں اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے اعمال و رفتار خدا پسندانہ نہ ہوں، تو اس کا دین بھی ناقص ہوگا، خلاصہ یہ کہ دین تمام مذکورہ چیزوں کو شامل ہے۔

۱۔ دینی طریقوں سے دینی معرفت کی ضرورت

اگر ہم دین کی تعریف کرنا چاہیں تو ہمیں دیندار اور دینی بزرگوں کی تعریف دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات نے دین کی کس طرح تعریف کی ہے؟ اور اگر ہم خود اپنے ذہن سے دین کی تعریف کریں اور من گھڑت تعریف کی بنا پر کھیں کہ سیاسی اور اجتماعی مسائل دین سے خارج ہیں یا یہ کہ سیاسی و اجتماعی مسائل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے جیسا کہ دین کی ہم نے تعریف کی ہے نہ جیسا کہ خدا نے دین کو بھیجا ہے، پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ دین خدا کی معرفت اور اسکو سمجھنے کے لئے خود اپنے طور و طریقہ اور اپنی فکر کے مطابق

دین کی تعریف نہ کریں بلکہ دین کی معرفت اور شناخت کے لئے ضروری ہے کہ دینی منابع و مآخذ کے ذریعہ دین کے بارے میں تحقیق کریں۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے: میں دین کو نہیں مانتا، کیونکہ اسلام کے صحیح ہونے پر جو دلیلیں قائم ہوئی ہیں وہ ضعیف ہیں یا (نعوذ باللہ) یہ کہے کہ ہمارے پاس اسلام کے جھوٹ اور باطل ہونے پر دلیل موجود ہے، اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے، تو یہ دعویٰ منطقی اور صحیح نہیں ہے، البتہ اگر کوئی اسلام کو قبول کرے، اور پھر وہ کہے کہ جو میں کہتا ہوں وہی دین ہے نہ یہ کہ جو قرآن، پیغمبر اور ائمہ (ع) کہتے ہیں اور جس کے مسلمان معتقد ہیں، اگر کوئی اسلام کے حق یا ناحق ہونے کے بارے میں بحث کرے چاہے وہ اس کی طرفداری کرے یا اس کی رد کرے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اسلام کی معرفت اور پہچان حاصل کرے اور بے شک اسلام کی پہچان کے لئے خدا کے فرمان کی طرف رجوع کرے، جس نے اسلام کو بھیجا ہے، لہذا قرآن کے ذریعہ اسلام کو پہچانا جائے، اس حقیقت کے پیش نظر ہم نے کھا کہ دین کی پہچان، اس کی تعریف اور اس کی فرمانروائی کے دائرے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی منابع، یعنی قرآن و سنت کی طرف رجوع کریں، نہ یہ کہ اپنی مرضی کے مطابق یا کسی امریکن اور یورپین (کہ جن کی باتیں ہمارے نزدیک غیر معتبر ہیں) کے کہنے کے مطابق دین کی تعریف کریں۔

لہذا اگر کوئی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو اسے چاہئے کہ اس اسلام کے مطابق گفتگو کرے جس کو قرآن، پیغمبر اور ائمہ علیہم السلام نے بیان کیا ہے، اور اسی اسلام کی بنیاد پر جس کی اصل قرآن و سنت ہے دین کی تعریف اور اس کے فرمانروائی کے دائرے کو سمجھیں نہ یہ کہ کسی مستشرق (مشرقی زبان دان اور ماہر علوم)، مولف اور سیاست مدار کی غرض کے تحت اسلام کی تعریف شدہ تعریف کو اپنائیں یا کسی (یورپی) دائرۃ المعارف (معلومات عامہ کتاب) کے مطابق اسلام کی تعریف کریں ایسے اسلام سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اسلام حقیقی کے طرف رجوع کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ دین کی فرمانروائی کا دائرہ انسان کی عقل و فہم پر ختم نہیں ہوتا بلکہ عقل، اسلامی شناخت کے طریقوں میں سے ایک ہے، اور اگر کوئی عربی زبان سے تھوڑی بھی واقفیت رکھتا ہو (اور قرآن کی تفسیر سے چاہے اجمالی و مختصر تفسیر سے آشنا ہو) جس وقت قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے اجتماعی مسائل کو نہیں چھوڑا اور ان کو بیان کیا ہے، پس کس طرح یہ کھا جاسکتا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے۔

اگر دین کے معنی قرآن کے مطابق کئے جائیں تو دین میں اجتماعی اور سیاسی مسائل شامل ہیں اور اس میں عبادت و ذاتی اخلاقیات کے علاوہ قوانین مدنی، قوانین جزائی (جرائم) اور عالمی قوانین موجود ہیں، اور گھریلو زندگی، شادی بیاہ، تربیت اولاد، کاروبار اور تجارت وغیرہ جیسے مسائل کو بیان کیا ہے، پس کون سی چیز ایسی ہے جو دین سے خارج ہے؟ معاملات، تجارت، اور رہن

(گروی رکھنا) کے بارے میں قرآن مجید میں بڑی بڑی آیات موجود ہیں، اگر اسلام کو قرآن کے ذریعہ پہچانے تو پھر کس طرح کوئی کھ سکتا ہے کہ اسلام کا اجتماعی سے کیا ربط؟

اگر نکاح و طلاق دین کا جز نہ ہوں، اگر تجارت، رہن خرید و فروخت اور سود دین سے مربوط نہ ہوں، اسی طرح ولایت کا مسئلہ اور ولی امر کی اطاعت دین کا جز نہ ہوں تو پھر دین میں کیا باقی بچتا ہے؟! اور آپ کس دین کی باتیں کرتے ہیں؟ قرآن کریم نے مسلسل ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

اگر کوئی یہ کھے کہ جس دین میں اجتماعی و سیاسی مسائل کو شامل کیا جائے ہم اس دین کو نہیں مانتے! ٹھیک ہے نہ مانتے، اسلام کو نہ مانتے والوں کی تعداد کوئی کم نہیں ہے، اس وقت بھی بہت سے لوگ دین کو نہیں مانتے، ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں، لیکن اگر وہ چاہتے ہیں تو آئیں اور ہم سے بحث کریں تاکہ اس اسلام کامل کو ان کے لئے ثابت کریں اور اگر نہیں چاہتے تو جو راستہ چاہیں اپنائیں:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾^(۱)

”(اے رسول) تم کھدو کہ سچی بات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے“

لیکن اگر وہ کہیں کہ ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں لیکن پھر اسلام کو ان مسائل پر شامل ہونے کا انکار کرتے ہیں، اور اسلام کے اکثر اجتماعی مسائل پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ کیا جو کچھ قرآن و سنت میں موجود ہے اسلام نہیں ہے؟ کہ تم لوگ نہ نماز کو قبول کرتے ہو اور نہ ہی دوسری عبادتوں کو؟ تمہارا ایمان نہ اسلام کے اجتماعی مسائل پر ہے اور نہ ہی اس کے سیاسی مسائل پر، نہ تم اسلامی نکاح کو قبول کرتے ہو اور نہ ہی طلاق کو، اور اسی طرح دوسرے احکام کو قبول نہیں کرتے، تو پھر اسلام میں کیا چیز باقی ہے کہ جس اسلام کا تم دم بھرتے ہو وہ کیا ہے؟ یہ باتیں صرف سادہ لوح افراد کے لئے موثر ہو سکتی ہیں لیکن دانشمند اور پڑھے لکھے افراد کے لئے بے مایہ اور فضول ہیں، بہر حال دین یعنی انسانی زندگی الہی رنگ و ڈھنگ کے ساتھ ہونا:

﴿صِبْغَةُ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً﴾^(۲)

”(مسلمانوں سے کھدو کہ) رنگ تو خدا ہی کا رنگ ہے جس میں تم رنگے ہوئے ہو“

انسانی زندگی الہی رنگ و ڈھنگ میں بھی ہو سکتی ہے اور شیطانی رنگ و ڈھنگ میں بھی، لیکن اگر انسانی زندگی الہی رنگ و ڈھنگ میں ہو تو پھر واقعاً اسلام کامل ہے، اگر ہم چاہیں کہ الہی رنگ و ڈھنگ اور اس کی مرضی کے بارے میں گفتگو کریں تو پہلے ہمیں دینی منابع کو پہچاننا ضروری ہے اور اسلام کی شناخت کے لئے قرآن، سنت اور عقل کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اور یہی طریقہ اسلام کے تمام عبادی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی مراحل کو شامل ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے کھا کہ قرآن پر ایک سرسری نظر کافی ہے تاکہ ہمارے لئے یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ دین جو قرآن میں موجود ہے اور قرآن دین کا اصل منبع ہے، ممکن نہیں کہ اس اسلام میں سیاسی اور اجتماعی مسائل کو چھوڑ دیا گیا ہو اور قوانین کا مجموعہ سیاسی اور اجتماعی مسائل سے خالی ہو، یہاں تک کہ عبادی مسائل سے بھرپور ہو، اور یہ سلسلہ اسلام سے مرتبط نہیں ہے، کیونکہ وہ اسلام جو قرآن نے بیان کیا ہے ہم اس اسلام کا دفاع کرتے ہیں اور یہ اسلام سیاسی، اجتماعی اور عبادی مسائل کو شامل ہے اور سیاست اسلام کے مہم ارکان اور اس کے فرمانروائی کے اصل دائرے میں سے ہے، اور امریکن اور یورپین رائٹروں کے مطابق اسلام سے ہمارا کوئی ربط نہیں ہے اور اس کو حقیقی اسلام کی حقیقت سے دور اور اجنبی مانتے ہیں۔

حوالے

۱ سورہ کھف آیت ۲۹

۲ سورہ بقرہ آیت ۱۳۸

دین میں سیاست کی اہمیت

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

”اسلام کے سیاسی نظریہ“ کی توضیح کے ضمن میں اسلامی منابع و مآخذ یعنی قرآن، سنت اور عقل کے تحت ہم نے بیان کیا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے اجتماعی و انفرادی مختلف مسائل میں نظریات بیان کئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دنیاوی زندگی میں دخالت رکھتا ہے، اور ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ مختلف نظریات رکھنے والوں سے بحث کا طور و طریقہ بھی مختلف ہونا چاہئے، جو لوگ ہمارے ساتھ بعض عقیدوں میں شریک ہیں ان سے بحث کا طریقہ الگ ہے لیکن جو لوگ ہمارے اعتقادات کے مخالف ہیں ان سے بحث کا طریقہ الگ ہے اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ مد مقابل کو قانع کرنے کے لئے کبھی برہانی اصولوں کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور کبھی جدلی طریقہ اپنانا پڑتا ہے اور ہم اس کتاب میں دونوں طریقوں سے استفادہ کریں گے، اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ اسلام سیاست کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہچانیں اور اس کو عملی جامہ پہنائیں، انقلاب اسلامی کے ارکان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسلام سیاسی مسائل میں دخالت رکھتا ہے، اسی وجہ سے ہمارا یہ انقلاب ”اسلامی انقلاب“ کے نام سے مشہور ہوا۔

اسی طرح ہم نے گذشتہ بحث میں بیان کیا کہ اسلام کے سیاسی نظریہ اور اس کے سیاسی پہلو سے دفاع کرنے میں ہمارے مقابل دو گروہ ہیں:

پھلا گروہ: ان لوگوں کا ہے کہ جو اسلام کو نہیں مانتے یا یہ کہ کسی بھی دین کو نہیں مانتے، ان لوگوں کے جواب کے لئے آیات و روایات سے دلیل پیش کرنا بے فائدہ ہے بلکہ ان سے مناظرہ کرنے کے لئے عقلی طریقہ اپنانا پڑے گا، اور سب سے پہلے اسلام کو ثابت کرنا پڑے گا تاکہ ثابت ہو سکے کہ خدا، دین، پیغمبر اور قیامت ہے، اور یہ مسلم ہے کہ اس گروہ سے (جو دین سے بے گانہ ہے) بحث کرنا صرف اعتقادی بحث ہوگی۔

دوسرا گروہ: ان لوگوں کا ہے کہ جو مسلمان ہیں اور دین کو قبول کرتے ہیں یا اگر اسلام پر اعتقاد نہیں ہے، مگر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اسلام، سیاست سے بے گانہ ہے اور اسلام کا سیاست سے کوئی ربط نہیں ہے، اس گروہ کے مقابلہ میں ہم کو چاہئے کہ اس اسلام کی تحقیق و بررسی کریں جس کے مسلمان معتقد ہیں اور دیکھیں کہ یہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اس گروہ کے مقابلے میں ہمیں صرف عقلی روش سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی شناخت کے لئے اسلامی اصولوں پر توجہ کریں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور اس کے بعد اسلامی منابع یعنی قرآن، سنت اور

رعقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کریں کہ قرآن، سنت اور سیرت رسول اور ائمہ کی سیرت اور ان کے فرمان کے مطابق اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے یہ کہ اسلام کی سیاسی دخالت پر بزرگان دین کی سیرت موجود ہے یا نہیں ؟

۲۔ سیاست کی تعریف اور اسلام میں تین طاقتوں کی اہمیت

ہم پہلے سیاست کی واضح و روشن تعریف کرتے ہیں تاکہ واضح و روشن ہو جائے کہ قرآن مجید میں سیاست کے بارے میں گفتگو موجود ہے یا نہیں ؟

سیاست یعنی قوم و ملت کو ادارہ کرنے کا طور و طریقہ، یا معاشرہ کو اس طرح تنظیم کیا جائے کہ اس کی ترقی اور پیشرفت ہو سکے، اور اس کے تمام مصالح اور ضروریات کو پورا کر سکے، یا بہ الفاظ دیگر: سیاست یعنی ملکی نظام چلانے کا قانون۔ البتہ سیاست سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ جس کے اثرات منفی ہوں یعنی جس میں فریب کاری، جیلہ بازی اور دوسروں کو دھوکہ دینا پایا جائے۔

سیاست اور ملکی نظام کے سلسلے میں ”مانشکیو“ کے زمانے سے حاکم گروپ کو تین طاقتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ ”قوة مقننه، قانون گذار پاور (پارلیمنٹ)

۲۔ ”قوة مجریہ“، قانون کو جاری کرنے والی طاقت (صدر یا وزیر اعظم)

۳۔ ”قوة قضائیه“، (عدالت یا کورٹ پاور)

قانون گذار پاور کی ذمہ داری یہ ہے کہ ملت کو ادارہ کرنے، اور ان کی مناسب و بہت رزندی کے لئے قانون بنائے تاکہ عدل و انصاف برقرار رہے اور معاشرے پر نظام حکومت کر سکے، اور کوئی ایک دوسرے کے حقوق کو پامال نہ کر سکے، پوری قوم ترقی اور کامیابی کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی نظر آئے، اور قوہ مجریہ کا وظیفہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں بنائے گئے قوانین کو نافذ کرے اور بھی گروہ حکومت کی شکل پاتا ہے، قوہ قضائیه کا کام یہ ہے کہ کلی قوانین کے تحت لوگوں کے درمیان موجودہ اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔

مذکورہ تقسیم بندی کے تحت جو وظائف تینوں طاقتوں کے لئے شمار کئے گئے ہیں ان کے بارے میں قرآن کے نظریات کیا ہیں اور شرعی لحاظ سے ان کی اہمیت کس قدر ہے اور کیا اس سلسلے میں قرآن اور اسلام نے کچھ خاص قوانین و دستورات بیان کئے ہیں ؟ البتہ توجہ رہے کہ قوانین سے ہماری مراد اجتماعی قوانین ہیں نہ کہ انفرادی احکام و قوانین کہ جو دین میں مسلم ہیں۔

اجتماعی قوانین میں مدنی (شہری) قوانین، عدالتی قوانین، تجارتی قوانین اور حکومت کا لوگوں سے روابط کے ضوابط نیز بین الاقوامی قوانین شامل ہیں، اگر ہم صحیح معنوں میں قرآن پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں مذکورہ تمام قوانین مل جائیں گے قرآن مجید میں شہری

قوانین، نکاح و طلاق کے احکام، تجارت و معاملات کے قوانین، قرض و رہن اور عدالت کے مسائل (یہ تمام چیزیں اس چیز کی حکایت کرتی ہیں کہ اسلام نے معاشرہ کو ادارہ کرنے کے لئے یہ احکامات پیش کئے ہیں) کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص حقوق بیان کئے ہیں تاکہ خاص مواقع پر زمان و مکان کے پیش نظر کچھ احکام وضع کریں اور مومنین کو بھی حکم ہوا ہے تاکہ آنحضرت کی اطاعت و پیروی کریں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾^(۱)

”اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے اس کام (کے کرنے یا نہ کرنے) کا اختیار ہو“

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی تصمیم و ارادہ پر اعتراض کریں، پس معلوم یہ ہوا کہ خدا کے مسلم قوانین کے علاوہ اسلامی حکومت میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے پیغمبر اسلام کے بنائے ہوئے قوانین بھی لازم الاجراء ہیں، یعنی رسول اکرم کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے اور کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ آنحضرت کی نافرمانی کرے، کیونکہ جو شخص آنحضرت کے قوانین کی مخالفت کرے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

۱۔ یا تو وہ پیغمبر کو خدا کا رسول نہیں مانتا، ایسے شخص سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے، ہم تو اس سے گفتگو کرتے ہیں جو آنحضرت کو خدا کا رسول مانتا ہو اور اس چیز کا بھی قائل ہو کہ آنحضرت کو خدا کی طرف سے قانون بنانے کا حق دیا گیا ہے، اسی وجہ سے خدا نے یہ نہیں فرمایا ﴿وَمَا كَانَ لِكَاْفِرٍ وَلَا كَاْفِرَةٍ﴾ بلکہ خداوند عالم کا ارشاد تو یہ ہے ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ﴾^(۲)

۲۔ یا یہ کہ آنحضرت کی نبوت کا اعتقاد رکھتا ہے لیکن رسول اسلام کو اس طرح کا حق ملنے کے بارے میں بحث کرتا ہے؛ ایسے شخص کے لئے ہم قرآن مجید سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اسلامی حکومت میں رہنے والے ہر مومن اور رسول اکرم کی نبوت کا معتقد انسان خدا کے احکامات کو لازم الاطاعت جانتا ہے بالکل اسی طرح سے رسول اسلام کے بنائے ہوئے قوانین کو بھی لازم الاطاعت ماننا ضروری ہے اور تمام مومنین پر آنحضرت کی اطاعت و ولایت ثابت شدہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾^(۳)

”نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں“

پس قرآن کی نظر سے رسول اسلام کے لئے قانون کا بنانا اور اس کو اجراء کرنے کا حق مسلم الثبوت ہے،، لیکن یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا بھی مرتبہ رسول اسلام کے بعد کسی دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے یا نہیں؟ البتہ اس بحث کو کسی دوسری جگہ پر کیا جائے گا اس وقت ہماری بحث اسلام کے بارے میں ہے کہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟

۳۔ عدالتی احکام قرآن کی نگاہ میں

قضاوت اور عدالتی احکام یعنی خدا کے کلی احکام کو اختلافی اور جھگڑے وغیرہ جیسے مسائل پر منطبق کرنا، اس سلسلے میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَلَا وَرُؤُكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (۴)

”پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (بھی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش ان کو مان لیں“

آیہ مذکورہ میں نہ صرف یہ کہ حضرت رسول اکرم کے لئے قضاوت ثابت ہے بلکہ آنحضرت کی قضاوت و داوری کو قبول کرنا شرط ایمان ہے، چونکہ آیت کے شروع میں قسم کھائی گئی ہے لہذا اس مطلب کی مزید تاکید ہو جاتی ہے کہ مومنین کو چاہئے کہ اختلافی مسائل میں آپ کے فیصلے اور حکم کو دل و جان سے قبول کریں، اور آپ کے دئے ہوئے فیصلہ پر ناراض نہ ہوں، اور اگر آنحضرت کے فیصلہ پر اعتراض کیا اور اس کو دل و جان سے قبول نہ کیا تو پھر وہ حقیقی مومن نہیں ہے۔

جی ہاں حقیقی مومن وہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت اس کے برخلاف کوئی فیصلہ دے تو اس کو دل و جان سے قبول کرے اگرچہ یہ احتمال بھی ہو کہ اس کا حق ضائع ہوا ہے کیونکہ قاضی گواہوں اور دوسرے شواہد کی وجہ سے ظاہری حکم کرتا ہے جیسا کہ رسول اکرم نے بھی فرمایا:

”انما اقضى بينكم بالبينات والایمان“ (۵)

میں تمہارے درمیان قسم اور دوسرے شواہد کی بنا پر قضاوت اور فیصلہ کرتا ہوں، ممکن ہے کہ کوئی گواہ ظاہراً عادل اور معتبر ہو اور اس کی گواہی قبول ہو؛ اگر اس کی گواہی جھوٹ پر مشتمل ہو یا گواہ سے کوئی بھول چوک یا غلطی واقع ہوئی ہو لیکن اگر یہ طے قرار پائے کہ قاضی کے فیصلہ کو قبول نہ کیا جائے اگرچہ خلاف واقع بھی ہو تو پھر بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اسلامی حکومت نہیں چل پائے گی۔

قرآن سے جو نتائج نکلتے ہیں اور قرآن مجید کا جزائی امور جیسے دیت، قصاص اور تعزیرات (سزا دینا) وغیرہ کا بیان اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام سیاست و حکومت میں سب سے بڑی دخالت رکھتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ اسلام نے مجرم اور مفسد کے لئے ”حد“ (اسلامی سزا) معین کی ہے اور قاضی کو اس حد تک اجازت دی ہے کہ مفسد اور مجرم پر حد جاری کرے اگرچہ کوئی مخصوص شکایت کرنے والا نہ ہو، چونکہ ایسی صورت میں گویا حقوق الہی کو پامال کیا گیا ہے (لہذا اس کو سزا دی گئی ہے)

بعض مقامات پر تو اسلام نے بہت سنگین اور سخت سزائیں دی ہیں کہ جس کی بنا پر بعض لوگوں کے لئے ان کا قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں حکم ہوا کہ اگر اسلامی معاشرے میں کسی نے زنا کیا اور قاضی کے نزدیک چار عادل گواہوں نے گواہی دی اور وہ جرم قاضی کے نزدیک ثابت ہو چکا ہے تو زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک سو سوتازیاں لگائے جائیں، اور قرآن نے اس سلسلہ میں خصوصی طور پر تاکید کی ہے تاکہ قاضی عواطف و محبت سے متاثر نہ ہو، اور ان کے ساتھ مہربانی و محبت سے پیش نہ آئے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةً وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ﴾ (۴)

”زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو (سو) کوڑے مارو اور اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا رحم کا لحاظ نہ ہونے پائے“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی پر ایسی ”حد“ جاری ہو گئی تو اس کی عزت و آبرو ختم ہو جاتی ہے لیکن معاشرہ اور سماج ان تمام برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

چوری کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (۷)

”چور خواہ مرد ہو یا عورت تم ان کے کرتوت کی سزا میں ان کا (داهنا) ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ (ان کی سزا) خدا کی طرف سے ہے اور خدا تو بڑا زبردست حکمت والا ہے“

پس نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید نے رسول خدا کے لئے مقام قضاوت، قوم و معاشرے کی فلاح و بھبودی کے لئے حق قانون گذاری اور حد و سزا دینے کا حق معین فرمایا ہے، اگر کوئی شخص واقعاً انصاف رکھتا ہو اور قرآن اور معصومین (ع) کی معتبر روایت پر ایمان رکھتا ہو اس پر یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام سیاسی و اجتماعی مسائل میں دخالت رکھتا ہے، لیکن اگر کوئی بغض و عناد کی وجہ سے ان حقائق سے چشم پوشی اور ان کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چمکتے ہوئے سورج کا منکر ہو۔

۳۔ سلام کا ہمہ گیر ہونا اور اسلامی حاکم کی اہمیت

قرآن مجید نے وسیع سیاسی مسائل، حکومتی قوانین، قانون گذاری اور اس کو خاص موارد پر منطبق کرنا اور قوانین کے اجراء کرنے کے علاوہ فرعی اور جزئی قوانین کے بارے میں بھی وضاحت کی ہے مثلاً سال کے مہینوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ إِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَلِكَ

الَّذِينَ الْقِيَمُ﴾ (۸)

”اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا نے جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا (اسی دن سے) خدا کے نزدیک خدا کی کتاب (لوح محفوظ) میں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہے ان میں سے چار مہینے (ادب و) حرمت کے ہیں یہی دین سیدھی راہ ہے“
مذکورہ آیت میں سال کے بارہ مہینوں کی تقسیم تکوینی لحاظ سے اور خلقت کے نظام پر منطبق ہیں، اور اس طرح کے مطالب دین میں ذکر ہونا، دین کے صحیح اور مستحکم ہونے کی نشانی ہے، اسی طرح قرآن مجید میں چاند کو دیکھنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْهَلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (۹)

”(اے رسول) تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ کیوں گھٹتا بڑھتا ہے) تم کہہ دو کہ اس سے لوگوں کے (دینی) امور اور حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں“

اس وجہ سے اجتماعی و عبادی احکام تکوینی نظام پر منطبق ہوتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے حقوقی احکام ماہ رمضان کا آغاز، حج کا زمانہ اور دوسری عبادی احکام چاند دیکھنے پر متوقف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید دین کو فطرت اور نظام خلقت سے ہم آہنگ اور منطبق بتاتا ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ﴾ (۱۰)

”(تو) اے رسول) تم باطل سے کترا کے اپنا رخ دین کی طرف کئے رہو، یہی خدا کی بناوٹ ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی (درست کی ہوئی) بناوٹ میں (تغیر) تبدیل نہیں ہو سکتا“

اور چونکہ الہی قوانین فطرت الہی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں لہذا یہ قوانین مسلم ہیں اور ان میں تبدیلی نہیں آسکتی، البتہ یہاں توجہ رکھنی چاہئے کہ اسلام کے بعض احکام و قوانین ایسے ہیں جو کسی خاص زمان و مکان کے لحاظ سے تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن ان مسائل کو طے کرنا یا ان کو معین کرنا حاکم شرع کی ذمہ داری ہے، وہ حاکم شرع کہ جس کی مشروعیت اور طاقت خدا کی طرف سے ہے، قرآن مجید نے اس با عظمت منصب کو رسول اکرم کے لئے مقرر فرمایا ہے اور شیعہ عقائد کے لحاظ سے ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی یہ منصب ہے (جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے) اور ان کے بعد یہ مقام ولی فقیہ کے لئے معین ہوا ہے (ولی فقیہ کے بارے میں دوسرے موقع پر تفصیل سے بحث کریں گے، انشاء اللہ)

لہذا یہ اعتراض کہ دین کا اجتماعی مسائل سے کوئی مطلب نہیں، اور یہ کہ دین صرف آخرت سے مربوط ہے، یعنی انسان کے خدا سے رابطہ کا نام ہے یہ اعتراض بالکل ختم ہو جاتا ہے، اور نہ یہ اعتراض دین سے مربوط ہے، البتہ اس دنیا میں کوئی ایسا بھی دین

ہو سکتا ہے کہ جس پر مذکورہ اعتراض وارد ہو سکتا ہو، لیکن ہماری بحث اس دین سے نہیں ہے، بلکہ ہماری گفتگو اس دین کے بارے میں ہے جس میں سال کے مہینوں تک کو بیان کر دیا گیا ہو جس میں معاملات اور مالی روابط کے بارے میں اس طرح تاکید کی گئی ہو کہ اگر کوئی شخص ایک دوسرے کو قرض دے تو اس کو لکھ لیا جائے یا دو گواہوں کے سامنے قرض دیا جائے، اور اگر لکھنا یا گواہ لینا ممکن نہ ہو تو کوئی چیز گروی رکھ لی جائے، (قرآن مجید میں رہن کے جواز کے بارے میں جو بیان ہوا ہے وہ ایسے ہی مقامات کے لئے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قرض دے اور اس سے کوئی نوشتہ یا سند نہ لے سکے تو اس سے کوئی قیمتی چیز بعنوان گروی لے کر اس کو قرض دے دیا جائے)

لہذا ہم معتقد ہیں کہ دین اسلام سیاست، حکومت اور لوگوں کی مادی اور معنوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پروگرام رکھتا ہے۔

ہم نے گذشتہ جلسہ میں دین کی اس تعریف کو جس میں دین کو فقط انسان کے خدا سے رابطہ میں منحصر کیا گیا تھا اس کی رد کرتے ہوئے حقیقی دین کی تعریف کی تھی اور ہم نے عرض کیا تھا کہ دین کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی پر الہی جلوہ ہو جو انسان کے تکامل کا راستہ بیان کرے اور اس کو مبدا و معاد کی طرف متوجہ رکھے پس دین انہیں راستوں کے اختیار کرنے کا نام ہے اور بغیر کسی شک و شبہ کے ایسا دین زندگی کے کسی ایک حصہ مثلاً عبادت اور دوسرے عبادی کاموں میں منحصر نہیں ہو سکتا، بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق کی وجہ یہ ہے کہ انسان ابدی اور ہمیشگی سعادت کو حاصل کر سکے اسی بنا پر اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو الہی احکامات سے ہم آہنگ کرے، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی براہ راست عبادت اور اصطلاحی عبادت دین کا بعض حصہ ہے اور ہماری زندگی کے دوسرے فکری و عملی پہلو خدا کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے، اور جب ہمارے سارے کام مرضی معبود کے مطابق ہو جائیں گے تو یہ تمام کام بھی عبادت بن جائیں گے اور انسان اس طرح زندگی کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچ جائے گا:

﴿مَآ خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِعِبَادَتِي﴾ (۱۱)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں“

اس آیت کا مطلب یہ کہ انسان خدا کی عبادت و پرستش کی بنا پر کمال کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

لہذا انسان کے تمام اعمال و افعال اسی قاعدے اور قانون کے تحت ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اس کا سانس لینا بھی اسی قاعدہ کے تحت ہونا چاہئے اور اگر انسانی زندگی نے الہی رنگ کو اپنا لیا ہے اور اسی سانچے میں ڈھل گیا، تو وہ انسان واقعاً دیندار ہے اور اگر خدا کی عبادت اور اس کی پرستش کے دائرے سے خارج ہو گیا تو وہ شخص بے دین اور مرتد ہو جائے گا، وہ لوگ جن کی زندگی کا بعض حصہ خدا کی مرضی کے خلاف ہو اور خدا کی عبادت سے بے خبر رہتے ہیں، وہ لوگ واقعی دیندار نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ارتداد کی

سرحد پر رہتے ہیں ان لوگوں کا دین ناقص ہے، کیونکہ دین کے ناقص ہونے کے بھی درجات ہیں لہذا ہم کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جو حضرات واقعاً دیندار ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں احکامات الہی کی رعایت کرتے ہیں، پس وہ لوگ جو زندگی کے بعض حصوں میں احکام الہی کی رعایت کرتے ہیں وہ ان کے مرتبہ کے برابر نہیں ہیں، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ایمان اور دینداری کے بھی بہت سے مراتب اور درجات ہیں اور انسان ان میں ترقی کر سکتا ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾ (۱۲)

”اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا (قرآن کے ذریعہ) مزید ہدایت کرتا ہے اور ان کو پرہیزگاری عطا کرتا ہے“ جو لوگ ہدایت پا چکے ہیں خداوند عالم ان کی ہدایت اور تقویٰ میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (۱۳)

”سچے ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو انکے دل حل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں“

جی ہاں ایسے بعض حضرات موجود ہیں جن کے ایمان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تکامل کی طرف بڑھتے رہتے ہیں تاکہ ایمان کی بلند منزلوں تک پہنچ سکیں اور اولیاء الہی میں شمار ہونے لگیں، ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو پستی کی طرف جاتے رہتے ہیں اور دینداری میں پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اغیار و بے گانوں کے اعتراضات و اشکالات کو سن کر نامناسب ماحول کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور جس دین کو ماں باپ یا کسی استاد سے سیکھا تھا اس کو کھو بیٹھتے ہیں، کیونکہ جن لوگوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ مسائل کو اچھے طریقہ سے سمجھ سکیں اگر وہ اعتراضات و اشکالات میں وارد ہوتے ہیں تو منحرف ہو جاتے ہیں، قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي

حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ﴾ (۱۴)

”(مسلمانو!) حالانکہ خدا تم پر اپنی کتاب قرآن میں حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سن لو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جاتا ہے اور اس سے مسخر اپن کیا جاتا ہے تو تم ان (کفار) کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں غور کرنے لگیں اور تم بھی اس وقت ان کے برابر ہو جاؤ گے“

انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنے علم اور عقلی و فکری بنیادوں میں اضافہ کرے اور اعتراضوں کے جوابات اور ان کا تجزیہ و تحقیق کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے، اس کے بعد کسی کے اعتراضات و شبہات پر کان دھرے، اور دوسرے کے اعتراض کو

سن کر خود کو انحرافات کے خطرے میں نہ ڈالے، اسلام یہ نہیں کہتا کہ کسی سے کشتی نہ لڑو، بلکہ اسلام کی نظر تو یہ ہے کہ پہلے کشتی کے فن سے واقف ہو جاؤ بعد میں کشتی لڑو، اور اگر چاہو کہ کسی بھاری پہلوان سے کشتی لڑو تو پہلے اپنے وزن اور پرکٹس میں اضافہ کرو اسی طرح اسلام یہ نہیں کہتا کہ دوسروں کے اعتراضات کو نہ سنو بلکہ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جس قدر اشکالات و اعتراضات کی تجزیہ و تحقیق اور تشخیص کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو، وہاں تک اشکالات کو سنو، یعنی پہلے معارف الہی حاصل کرو پھر شبہات کے جوابات دینے کا طریقہ سیکھو اس کے بعد دوسروں سے بحث و مناظرہ کرو تا کہ دشمن تم کو شکست نہ دے سکے اور اپنے عقائد کو تم پر تحمیل نہ کر سکے۔

۵۔ مذکورہ بحث کا خلاصہ

ہماری بحث و گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام، تمام سیاسی پہلوؤں پر شامل ہوتا ہے لہذا ہماری تمام زندگی دین کے مطابق ہونا چاہئے، زندگی کا کوئی بھی گوشہ دین سے خارج نہ ہو؛ چاہے وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، خاندانی زندگی ہو یا ازدواجی مشترکہ زندگی، ماں باپ سے اولاد کے روابط ہوں یا امت اور امام کا رابطہ، یہاں تک کہ دوسرے مذاہب سے رابطہ کیسا ہونا چاہئے کن افراد سے رابطہ رکھنا صحیح ہے اور کن لوگوں سے رابطہ رکھنا صحیح نہیں ہے، اور اگر ہم قرآن مجید کی آیات پر ایک نظر ڈالیں (درحالیکہ روایات کی طرف رجوع بھی نہ کریں)

تو جو شخص تھوڑا بھی انصاف رکھتا ہو اس کے لئے واضح و روشن ہو جائے گا کہ سیاست اسلام کا متن (اصلی رکن) ہے اور ہم بغیر سیاست کے اسلام نہیں رکھتے، اور کچھ لوگ اسلام کو سیاست سے جدا تصور کریں تو گویا ان کا دین دوسرا ہے اور اس کو اسلام کا نام دے دیا ہے وہ اسلام کہ جس کی اصل قرآن و سنت ہے اس کا سیاست سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔

حوالے:

(۱) سورہ احزاب آیت ۳۶

(۲) سورہ احزاب آیت ۳۶

(۳) سورہ احزاب آیت ۶

(۴) نساء آیت ۶۵

(۵) وسائل الشیعہ ج ۲۷ ص ۲۳۲

(۶) سورة نور آیت ۲

(۷) سورة مائده آیت ۳۸

(۸) سورة توبه آیت ۳۶

(۹) سورة بقره آیت ۱۸۹

(۱۰) سورة روم آیت ۳۰

(۱۱) سورة الذاریات آیت ۵۶

(۱۲) سورة محمد آیت ۱۷

(۱۳) سورة انفال آیت ۲

(۱۴) سورة نساء آیت ۱۴۰

چوتھا جلسہ

دین میں سیاست کی اہمیت

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ جلسوں میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد، اسلام دشمن طاقتیں اپنی پوری جدوجہد اور تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہونچیں کہ اس اسلامی حکومت سے مقابلہ کئے لئے انقلاب کی بنیادی اور مرکزی چیز کا مطالعہ کیا جائے جو ”ولی فقیہ“ کی ولایت و سرپرستی ہے، اور اس کو اپنے پروپیگنڈے کی تیز دھار کا نشانہ بنایا جائے، چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ گذشتہ چند سالوں سے عصر حاضر تک اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ پر دنیا بھر سے مختلف اعتراض ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح دشمن طاقتوں کے نمائندے ملک میں ولایت فقیہ کے برخلاف تمام تر کوششوں میں مشغول ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود اگرچہ ہماری قوم و ملت ولایت فقیہ کی حکومت پر بھرپور اعتماد و ایمان رکھتی ہے، اور اس حکومت کی ہر اعتبار سے حمایت کرتے ہیں لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ مذکورہ مسائل کے بارے میں تفصیلی بحث کی جائے تاکہ اس حکومت کی نظری اور فکری بنیادیں عوام اور بالخصوص جوان نسل کے لئے واضح و روشن ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس سلسلے میں تین طرح کے اعتراض کئے جاتے ہیں:

پہلا اعتراض:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور ایک سیاسی نظام کسی بھی صورت میں دینی نہیں ہو سکتا، گذشتہ جلسہ میں ہم نے اس اعتراض کا جواب دیا کہ اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اسلام ایک دین اور مذہب ہونے کے عنوان سے کسی سیاست سے منسلک ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب کیلئے قرآن مجید کا اور اس میں بیان کئے گئے احکام و قوانین کا ایک سطحی اور سرسری مطالعہ کافی ہے اور حقیقت میں جو شخص مسلمان ہے اور قرآن پر اعتقاد رکھتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو مسلمان نہیں ہے، لیکن اسلام کی شناخت اور معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہئے، تب اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ دین اور سیاست کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے۔

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلام کی پہچان کا صحیح طریقہ قرآن مجید ہے، جس طرح اگر ہم چاہیں کہ کسی ایک موضوع کے بارے میں عیسائیت کا نظریہ معلوم کریں تو اس کیلئے ہمیں انجیل کا مطالعہ کرنا پڑے گا، البتہ ہم نے جو کچھ بیان کیا یہ ان لوگوں کیلئے ہے جو مسائل کو سمجھنے کیلئے صحیح اور منطقی طریقہ اپنائیں چاہے بحث و گفتگو ہو چاہے مطالعہ تحقیق و بررسی ہو، صحیح طریقہ کا

انتخاب کریں، لیکن دشمن بحث و گفتگو کیلئے صحیح اور منطقی طریقوں سے دور بھاگتا ہے کیونکہ ان کا مقصد صرف مومن لوگوں میں اعتراضات اور شبہات پیدا کرنا ہوتا ہے، تاکہ ان کے ایمان کو ناقص کر دیں چونکہ ان کی بحث و گفتگو منطقی نہیں ہوتی کہ ہم اس کا جواب دیں، لیکن پھر بھی اپنا وظیفہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اعتراضات اور شبہات کا منطقی جواب دیں۔

۲۔ کیا دین سیاست سے جدا ہے؟ (مذہبی و غیر مذہبی لوگوں کا نظریہ)

جن لوگوں نے دین کو سیاست اور حکومت سے ہونے میں غیر مذہبی نظریہ کو انتخاب کیا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں۔ ہم کو قرآن سے کوئی مطلب نہیں اور اسلام پر غیر مذہبی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہم اسلامی منابع و ماخذ کی تحقیق و بررسی کریں یا یہ دیکھیں کہ قرآن سیاست سے متعلق کیا کہتا ہے، یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کو دین کی کیا ضرورت ہے؟ اور کن مسائل میں اس کو دین کی راہنمائی کی ضرورت ہے؟

انہوں نے اس مسئلہ سے متعلق اپنے خیال خام میں دو نظریہ فرض کیے ہیں، پہلا فرض یہ ہے کہ انسان تمام چیزوں میں اور زندگی کے تمام امور میں دین کی ضرورت رکھتا ہو، مثلاً کس طریقہ سے غذا آمادہ کی جائے اور کس طرح سے کھائی جائے، یا کسی طرح مکان بنایا جائے، شادی بیاہ کئے کیا طریقے ہیں اور حکومت اور جامعہ کی تشکیل کو ایک ہی صف میں رکھا ہے، اور اس طرح کہتے ہیں، کیا دین کیلئے ضروری ہے کہ ان تمام مسائل کو حل کرے، اور انسان کو علمی اور دقیق مسائل کی تحقیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ہم کو اکثر مسائل میں دین کا منتظر نہیں اپنا چاہئے کہ ہر چیز کی وضاحت دین ہی سے طلب کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کوئی لباس بنانا چاہیں تو پہلے یہ معلوم کریں اسلام کا نظریہ کیا ہے، اور اگر کھانا کھانا چاہیں تو دیکھیں کہ اسلام نے کن کھانوں کی اجازت دی ہے، اور اگر بیمار ہو جائیں اور ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو دیکھیں کہ اسلام نے اس سلسلے میں کیا وصیت کی ہے؟ نیز اس طرح اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں کیا نظریہ پیش کیا ہے۔

دوسرے فرض یہ ہے کہ دین فقط بعض چیزوں میں دخالت رکھتا ہے اور دین سے ہماری توقعات حداقل درجہ پر ہونی چاہئے اور یہ بات طبعی ہے کہ دین ہر اعتبار سے انسان کی ضروریات میں نظر نہیں رکھتا، بلکہ کوئی بھی دین یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ انسان کی تمام ضروریات پورا کر سکتا ہے۔

اور جب ہم نے یہ مشاہدہ کر لیا کہ دین ہم کو کھانا بنانا، علاج کرنا، ہوائی جہاز اور کشتی بنانا وغیرہ نہیں سکھاتا تو اب ہم کو یہ دیکھنا ہوگا، وہ مسائل کہ جن کو اپنے سے بیان کیا ہے ان کا دوسرے مسائل سے بھی کیا امتیاز ہے، اور اصلاً دین نے کس کس میدان میں وارد ہوا ہے۔

یہ لوگ اپنے خیال خام میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک دوسری قسم کو انتخاب کریں اور وہ یہ ہے کہ دین فقط ان امور میں دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہیں۔

اور دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے اور ہم کو چاہئے کہ جن کے ذریعہ فقط ان چیزوں اور طریقوں کو پہچانیں کہ جن کے ذریعہ آخرت میں کامیابی، جنت میں جانے، دوزخ سے نجات حاصل کی جاسکے۔ جیسے نماز پڑھنا، روزہ، رکھنا، حج کو انجام دینا اور دوسرے عبادی امور کو دین سے حاصل کریں،

ان لوگوں نے اپنے خیال خام میں دین و سیاست کے ربط کو اس طرح حاصل کیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے اور یہ کھا کہ سیاست کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اور یہ کہ سیاست کا دائرہ و نیوی امور میں ہے، اور دین کا دائرہ آخرت سے مربوط ہے، نہ دین کو سیاست میں دخالت کرنا چاہئے اور نہ ہی سیاست کو دین میں دخالت کرنی چاہئے،

لہذا وہ سیاست کہ جس کا تعلق دنیا اور علم سے ہے، لہذا سیاست کو فقط علم اور انسانی ترقی میں دخالت کا حق ہے چاہے وہ علم فیر کی ہو یا زیت شناسی روا شناسی ہو یا جامعہ شناسی طب یا دوسرے علوم میں دین کی کوئی دخالت نہیں ہے، اور دین کی دخالت صرف اخروی ادر میں ہے۔

ان مسائل کا تاریخچہ چند صدی پہلے مغربی ممالک کی طرف پلٹتا ہے کہ جس وقت کلیسائی پادریوں اور علم و سیاست کے لوگوں کے درمیان اختلاف اور تضاد پیدا ہوا، اور آپس میں مدتوں تک اسی سلسلے میں جنگ جدال ہوتی رہی، اور آخر میں ان کی یہ جنگ وجدال ایک بے لکھی صلح پر تمام ہوئی، جس میں یہ طے پایا کہ دین فقط آخرت سے تعلق رکھتا ہے دین بھی انسان کا خدا سے رابطہ، اور دنیاوی کاموں میں دخالت کرنا اہل سیاست اور اصل علم افراد کے سپرد کیا گیا۔

یہ تمام نظریات مغربی ممالک کے تھے، لیکن بعد میں جو لوگ ان کے تحت تاثیر قرار پائے ان کا کہنا ہے کہ ہمارے اسلامی ممالک میں بھی اس طرح تقسیم ہونا چاہئے مثال کے طور پر اس طرح ہونا چاہئے کہ دین کی باگ ڈور فقط دینی علماء کے ہاتھوں میں ہو اور ان کا نام صرف ضروری کاموں میں حق دخالت ہو، اور دین یا دینی علماء دنیاوی کاموں کو بالکل دخالت نہ کریں، لہذا سیاست کو اہل سیاست حضرات پر چھوڑ دیا جائے اور دینی علماء اور فقہاء کو سیاست میں دخالت کا کوئی حق نہیں، اور اس سلسلے میں بہت سی تقریریں ہوئی، مقالات لکھے گئے، اور اپنے اس نظریہ کی تائید کیلئے ہر ممکن کوشش کی گئی تاکہ ہمارے جوانوں کے درمیان اس اعتراض کو رائج کریں اور اس نظریہ کو تقویت پہنچائیں کہ دین سیاست سے جدا ہیں۔

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ بعض پڑھے لکھے افراد نا خواستہ طور ان کے نظریہ کے تحت تاثیر قرار پائے، اور اہستہ اہستہ یہ نظریہ لوگوں کے ذہن میں اپنا مقام بناتا جا رہا ہے، کہ دین، دنیا کے مقابلہ میں ہے یعنی دین انسانی زندگی کے بعض مسائل کو حل کر

سکتا ہے اور دنیاوی امور کا دین سے کوئی رابطہ نہیں، اور جب یہ اعتراضات اور شبہات ہمارے پڑھے لکھے اور مولفین اور مقررین حضرات کے ذریعہ بیان ہوتے ہیں تو واقعاً یہ ہماری ملت اور جامعہ کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

۳۔ دنیا اور آخرت میں چولی دامن کا رابطہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ہماری یہ زندگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے دنیاوی زندگی، افروی زندگی، یعنی دنیا میں ہماری زندگی کا ایک حصہ روزپیدائش سے شروع ہوتا ہے اور موت پر ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد دوسری زندگی عالم برزخ اور عالم قیامت میں شروع ہوتی ہے، البتہ اس کے علاوہ بھی ایک دوسری زندگی فرض کی جاسکتی ہے اور وہ ہے عالم جنین (لیکن زندگی کی تقسیم کا ملازمہ یہ نہیں ہے کہ ہماری چال چلن دو حصوں میں تقسیم ہو جائے اور دو نظریوں سے دیکھا جائے، بہر حال اس وقت ہم دنیا میں ہیں اور اس دنیا میں دن بھر ہم بہت سے امور انجام دیتے رہتے ہیں دین اس وجہ سے آیا ہے تاکہ ہمارے امور کو سلیقہ عطا کرے، اور اپنے دستوری اور تشریعی نظام کے ذریعہ ہماری رہنمائی کرے، نہ یہ کہ دینی قوانین صرف مرنے کے بعد کیلئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہماری ۵۰ یا ۶۰ سال کی عمر کا بعض حصہ دنیا سے مربوط ہو اور بعض حصہ آخرت سے، بلکہ ہماری نظریں دنیا کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو آخرت سے مربوط نہ ہو، بلکہ ہمارے تمام دنیاوی امور ایک طرح سے آخرت سے مربوط ہو سکتے ہیں یعنی دنیاوی امور اس طرح سے انجام پائیں کہ آخرت میں مفید ثابت ہوں، اور ہو سکتا بھی اعمال ہمارے آخرت کے لئے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوں، بہر حال گفتگو یہ ہے کہ ہمارے اعمال و افعال آخرت کیلئے موثر ہیں اور دنیاوی طور پر اسلامی نظریہ بھی یہی ہے کہ آخرت کی زندگی کو اسی دنیا میں سنوارا جاتا ہے:

”الیوم عملٌ ولا حساب وغداً حسابٌ ولا عمل“^(۱)

آج کا دن عمل کرنے کا دن ہے حساب کا نہیں اور روز قیامت حساب کا دن ہے وہاں عمل کی جگہ نہیں ہے۔

”الدنیا مزرعة الاخرة“^(۲)

دنیا آخرت کی کھیتی ہے (جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے لہذا جو کام ہم دنیا میں کریں گے آخرت میں اسی طرح بدلا ملے گا، اور ایسا نہیں ہے کہ دنیاوی زندگی کا اخروی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں ہے یا ہماری زندگی کا کچھ حصہ دنیا سے اور کچھ حصہ آخرت سے متعلق ہے، یعنی ہماری زندگی کے الگ شعبے نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں ہمارے کام اس طرح ہونا چاہئے تاکہ ہمیں آخرت میں سعادت اور کامیابی نصیب ہو مثلاً ہمارا اٹھنا بیٹھنا، سانس لینا، دیکھنا، سننا، گفتگو کرنا، کھانا پینا، میاں بیویوں کے تعلقات اور اجتماعی روابط اس طرح ہوں کہ ہماری آخرت سنور جائے، اور ہو سکتا ہے ہمارے بھی کام آخرت میں مضر اور نقصان دہ ہوں

یہ بات مسلم ہے کہ کھانا پکانا اور کھانا کھانا دنیا سے مربوط ہے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کھانے کا بھی طریقہ جنت میں جانے کا باعث بنے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے لینے باعث عذاب ہو

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلُونَ سَعِيرًا﴾^(۲)

”بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق چٹ کر جایا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں اور عنقریب واصل جہنم ہوں گے“

جو شخص اپنے پیٹ کو یتیموں کے مال سے بھرتا ہے اگرچہ وہ ظاہراً کھانا کھاتا ہے او اس سے لذت بھی اٹھاتا ہے لیکن بھی کھانا جو کھا رہا ہے اس کے لئے جہنم کا عذاب بن جائے گا، جس طرح اگر انسان خدا کی عبادت کرنے کے لئے کھانا کھاتا ہے تو اس کا بھی کھانا آخرت میں ثواب و اجر کا باعث ہے اسی طرح اگر انسان خدا کی خوشنودی کے لئے گفتگو کرتا ہے تو جنت میں اس کے لئے ایک درخت لگایا جاتا ہے۔

حضرت رسول اکرم (ص) نے اپنے اصحاب سے فرمایا: جو شخص بھی تسبیحات اربعہ پڑھے، خداوند عالم اس کے لئے جنت میں ایک درخت اگاتا ہے (یہ سننے کے بعد) بعض لوگوں نے کہا: تب تو ہمارے لئے جنت میں بہت سے درخت موجود ہوں گے، کیونکہ ہم تسبیحات اربعہ کو مکرر پڑھتے رہتے ہیں، اس موقع پر حضرت رسول اکرم نے ارشاد فرمایا: ٹھیک ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان کو جلانے کے لئے وہاں آگ نہ بھیجو۔

لہذا اگر ہمارے اعمال و کردار خدا کی خوشنودی کے لئے ہوں تو آخرت کی سعادت و کامیابی کا سبب ہوں گے، اور اگر ہمارے بھی اعمال خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو آخرت میں بد بختی اور عذاب جہنم کے باعث بنتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہماری یہ زندگی دو مستقل حصوں پر مشتمل ہو جس کا ایک حصہ آخرت سے مربوط ہو اور مسجد و عبادت گاہوں میں گزارا جائے اور دوسرا حصہ ہماری دنیا سے مربوط ہو جس کا آخرت سے کوئی سروکار نہ ہو۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ نظریہ (دین کے حدود صرف انفرادی، عبادی مسائل اور عبادت گاہ تک ہوں کہ جس کا ثمرہ آخرت میں ظاہر ہوگا اور دوسرے مسائل دین سے خارج ہیں) آخری چند صدی کے درمیان بعض مغربی لوگوں میں بعض ادیان کے ماننے والوں کی طرف سے رائج ہوا ہے اور اس نظریہ نے بہت سے لوگوں کے ذہن کو پرانہ کر دیا ہے، اور نہ صرف یہ کہ اسلام میں یہ مطلب موجود نہیں ہے۔

بلکہ کسی بھی آسمانی برحق دین میں یہ مطلب نہیں پایا جاتا ہے، ہر برحق دین کا نظریہ یہی ہے کہ انسان کی تخلیق اس وجہ سے ہوئی ہے کہ انسان اپنے لئے سعادت یا شقاوت (بد بختی) کو معین کرے، اور انسان کی ہمیشگی سعادت یا ہمیشگی شقاوت اس دنیاوی

زندگی کے زیر سایہ حاصل ہوتی ہے، یعنی اگر انسان کی رفتار، گفتار الہی قوانین کے تحت ہو تو ہمیشگی سعادت اس کے شامل حال ہوگی، اور اگر انسان کے کارنامے خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو ہمیشگی شقاوت و بد بختی اس کے دامن گیر ہوگی۔

وہ لوگ جن کا نظریہ یہ ہے کہ دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے، انھوں نے انسانی رفتار و گفتار کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے جس کا ایک حصہ دین سے متعلق ہے اور اس کا دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسرا حصہ دنیا سے متعلق ہے وہ دین سے خارج ہے، جیسے سیاسی اور اجتماعی مسائل، البتہ یہ نظریہ صرف ایک مغالطہ اور کج فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر دین سے ہماری توقعات حد اکثر ہو تو پھر ہمارے تمام امور دین کے مطابق ہونا ضروری ہیں یہاں تک کہ کھانا پینا مکان بنانا وغیرہ وغیرہ، چونکہ انھوں نے یہ سوچا کہ یہ نظریہ نہ تو صحیح ہے اور نہ ہی دین ان تمام چیزوں کو پورا کر سکتا ہے، لہذا یہ لوگ دین سے کم سے کم توقعات کے قائل ہو گئے۔

ان کی یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے اس مسئلہ کی صرف دو قسم تصور کی جب کہ تیسری قسم بھی موجود ہے اور یہی تیسری قسم صحیح ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم دین سے اتنی توقع نہیں رکھتے کہ تمام چیزوں کے بارے میں ہمیں بتائے یہاں تک کہ کھانا کھانے، کپڑے پہننے اور مکان بنانے کا طریقہ بتائے، کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا، اور یہ اس لئے ہے کہ دین نے بہت سے مسائل کے بیان کو سمجھنے کے لئے دنیاوی علوم پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن پھر بھی یہ مسائل کسی نہ کسی اعتبار سے دین سے متعلق ہوتے ہیں، اور یہ اس وقت ہوگا جب یہ مسائل خود ارزش مند اور پر اہمیت قرار پائیں۔

یعنی ان کے اندر وہ پہلو بھی کار فرما ہوں جو دین سے متعلق ہیں مثلاً کھانا کھانا دینی مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی مر رہا ہے، بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھانا واجب ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ دینی ہو جائے گا۔

۴۔ انسان کے دنیاوی اعمال و کردار کی اہمیت

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی سے ایک ربط رکھتی ہے اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ انسانی اعمال و کردار اس کے کمال یا پستی کے باعث ہوتے ہیں، اور ہمارا کردار سعادت اخروی میں موثر ہو سکتا ہے تو پھر ہمارے یہ افعال و اعمال پر اہمیت اور بار ارزش ہو جاتے ہیں لہذا ہم اب یہ دین کو حق دیتے ہیں کہ وہ ہمارے افعال و کردار کے بارے میں قضاوت کرے یا نہ لفاظ دیگر یہ کھا جائے کہ دین ہمارے حلال و حرام افعال کو بیان کرتا ہو دین ان کو انجام دینے کی کیفیت بیان نہیں کرتا، دین تو یہ کہتا ہے کہ بعض چیزوں کا کھانا حرام اور گناہ ہے۔

مثلاً خنزیر کا گوشت اور نشیلی چیزوں کا کھانا حرام ہے لیکن شراب کیسے بنائی جاتی ہے خنزیر کیسے پالا جاتا ہے یہ دین کا کام نہیں ہے، البتہ اسلام نے خنزیر کے گوشت کو حرام اس لئے کیا ہے کہ دینی عبادات و مسائل میں یہ مانع ہے اور دینی احکام چاہے واجب ہوں یا حرام یہ سب وجوب و حرمت مثبت اور منفی اثرات کی بنا پر جعل ہوئے ہیں یعنی احکام کے متعلقات میں انسان کی سعادت اور آخرت پائی جاتی ہے گویا احکام ابجالی و سلبی کے ذریعہ ہمارے افعال و کردار کی اہمیت پتہ چلتی ہے۔

بہ الفاظ دیگر اس طرح عرض کیا جائے کہ انسان کی ترقی اور تکامل کی راہ ایک نقطہ سے لاشناہی نقطے کی طرف شروع ہوتی ہے اس راہ میں جو چیز ہمارے لئے مفید ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کی طرف متوجہ ہوں اور انسانی معنویت کی بلندی کا ذمہ ہموار کریں، درجات کے اعتبار سے چاہے وہ احکام واجب ہوں یا مستحب یا اس کے بعد مباح، اور جو راہیں انسان کو منزل اور پستی کی طرف لے جانے والی ہیں اور انسان کو راہ کمال اور خداوند عالم سے دور کرتی ہیں ”حرام“ ہیں اس کے بعد مکروہات ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دین یہ نہیں کہتا کہ کون سا کھانا کھائیں کس طرح کھانا بنائیں بلکہ دین اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ مکان غصبی جگہ پر نہ بنایا جائے یا مکان کو اس طرح نہ بنائیں کہ جس سے دوسروں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو، دین یہ کہتا ہے کہ حلال پیسہ سے مکان بنائیں سود کے پیسہ سے مکان نہ بنائیں، درحقیقت مکان کی اہمیت اور اس کی کیفیت کو بیان کرتا ہے اسی طرح دین یہ کہتا ہے کہ ہمارا کھانا ایسا ہو جس سے ہماری ظاہری اور معنوی رشد و ترقی ہو اور وہ غذائیں جو حرام ہیں یا ”الکحل“ نشہ آور چیزوں سے پرہیز کریں جو خود ہمارے لئے ضرر رساں اور نقصان دہ ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا إِنَّمَا الْحَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقَعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْحَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۖ﴾ (۲)

”اے ایمان دارو! شراب اور جو اور بت اور پانسے تو بس ناپاک (برے) شیطانی کام ہیں تو تم لوگ اس سے بچے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ، شیطان کی تو بس یہی تمنا ہے کہ شراب اور جو کے بدولت تم میں باہم عداوت و دشمنی ڈلوادے اور خدا کی یاد سے باز رکھے“

نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی حلال اور حرام کردہ چیزیں انسانی کردار کو بیان کرنے والی ہیں، یعنی ان کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی کردار مثبت پہلو رکھتا ہے یا منفی، اور کیا یہ چیز ہماری سعادت اور کامیابی میں موثر ہیں؟ اور کیا یہ چیزیں خدا تک پہنچنے کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں؟ یا یہ چیزیں انسان کو بدبختی اور ہلاکت کی وادی میں پہنچا دیتی ہیں؟ خلاصہ یہ کہ دین، دنیاوی کردار کے ماورای اس کردار پر توجہ کرتا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان جنتی یا جہنمی ہوتا ہے۔

۵۔ انسان کے کردار کی اہمیت کو سمجھنے میں عقلی طاقت کی شعائیں

ہمارے افعال و کردار کی اہمیت ایجاب و سلب کے لحاظ سے (یعنی ہمارے افعال و رفتار و کردار کے لئے ارزش کا اثبات کرنا یا سلب کرنا) کبھی اتنا واضح و روشن ہوتا ہے کہ جس کو عقل بخوبی سمجھ لیتی ہے اور شارع مقدس کی طرف سے تعبیدی بیان کی ضرورت نہیں بلکہ عقل خود ہی خداوند عالم کے حکم کو مشخص کر لیتی ہے۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام مستقلات عقلیہ میں فرماتے ہیں: بعض مسائل میں عقل مستقل طور پر فیصلہ کر لیتی ہے اور افعال و اعمال کے حسن و قبح (اچھائی، برائی) کو معین کر لیتی ہے اور ہم عقل کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں کہ خداوند عالم کا ارادہ فلاں کام کے انجام دینے یا ترک کرنے سے متعلق ہے، ہم عقل کے ذریعہ یہ پتا لگا لیتے ہیں کہ خداوند عالم اس کام سے راضی ہے یا نہیں، ہم سبھی کی عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ کسی یتیم کا مال کھانا برا ہے،

اور اس سلسلے میں شارع مقدس کی طرف تعبیدی بیان آنا ضروری نہیں ہے، عقل کی تشخیص کے بعد قرآن و حدیث میں بھی اس بارے میں تعبیدی بیان آنا یہ حکم عقل کی تاکید کے لئے ہے، لیکن اکثر مقامات پر ہماری عقل ہمارے افعال و اعمال و رفتار و کردار کی اہمیت اور پھر ان افعال کی ہماری شقاوت و سعادت میں تاثیر کی مقدار کو درک کرنے سے قاصر ہے، اس طرح کہ ہم اپنے اعمال کے وجوب و حرمت اور استحباب و کراہت کو عقل کے ذریعہ پہچانیں، لہذا ایسے مقامات پر دین کو دخالت کرنے کا حق ہے چنانچہ اس وقت دین کو ہمارے اعمال و افعال کے انجام دینے کے احکام بیان کرنا ہوں گے۔

۶۔ دین کے حدود

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ چیزیں جو ہماری ہمیشگی سعادت یا شقاوت میں موثر ہیں صرف ان مسائل میں منحصر نہیں جو براہ راست خداوند عالم سے مربوط ہیں، بلکہ دین، عبادی مسائل کے علاوہ دنیاوی امور میں بھی حق دخالت رکھتا ہے اسی وجہ سے دین نے بعض کھانے پینے والی چیزوں کو حلال یا حرام ہونے کو بھی بیان کیا ہے۔

اور جب ہم دینی احکامات کو ملاحظہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پہنچتے ہیں کہ دینی حدود انفرادی مسائل میں محدود نہیں ہیں بلکہ اجتماعی مسائل مثلاً گھریلو مسائل، شادی، طلاق اور تجارت وغیرہ جیسے مسائل کو بھی شامل ہیں، اور ان مسائل کا حلال و حرام ہونا ان کی اہمیت کو بیان کرتا ہے، درحقیقت دین ان امور کی حقیقت کو بیان کر کے ان کی حرکت کی جہت و سمت معین کرتا ہے اور نشان دہی کر رہا ہے کہ ان کے ذریعہ کس طرح سے خداوند عالم کی سمت انسان حرکت کر سکتا ہے اور کون سے امور شیطان کی طرف مایل ہونے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

علم بعض چیزوں کے بیان کرنے سے قاصر ہے علم صرف یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز کو بنانے کے لئے کن چیزوں کو کس مقدار میں ہونا ضروری ہے اور فیزیکی اور شیمیائی چیزوں کو بیان کرتا ہے لیکن یہ بیان نہیں کرتا کہ ان چیزوں کو کس طرح استعمال کیا جائے تاکہ انسان حقیقی اور واقعی کمال اور سعادت تک پہنچ سکے، ایسے مقامات پر دین کو قضاوت اور فیصلہ کرنا ہوتا ہے لہذا جس طرح ہمارے اعمال ہماری سعادت و بدبختی میں موثر ہوتے ہیں اسی طرح سیاسی و اجتماعی امور میں ہمارے اعمال ہماری سعادت یا بدبختی میں موثر ہوتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ اس حصے میں اور زیادہ موثر ہوتے ہیں۔

اب رہی ہماری اصل گفتگو یعنی ”اجتماعی امور“ کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ معاشرہ اور ملت کا چلانا ہماری سعادت یا بدبختی میں کوئی اثر نہیں رکھتا؟ اور اس معاشرہ کے افراد جس طرح بھی چاہیں معاشرہ کے ادارے کے لئے جس کو چنیں، مختار ہیں اور ان مسائل میں دین کوئی دخالت نہیں رکھتا؟ کون ہے جو نہیں جانتا کہ معاشرہ میں عدالت اور انصاف کی رعایت سے انسان کی سعادت اور کامیابی ہے اور عدالت و انصاف سے کام لینا ایک بہت مہم اور ثبات پہلو رکھتا ہے اس سلسلہ میں اگر کوئی آیت یا حدیث نہ ہوتی تب بھی ہماری عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ عدالت و انصاف کی رعایت کرنے سے انسانی کمال اور سرفرازی میں شایان شان تاثیر رکھتی ہے، جو حضرات ان مسائل کو سمجھنے کے لئے عقل کو کافی نہیں سمجھتے، وہ قرآن و احادیث کی طرف رجوع کریں، البتہ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ سیاسی و اجتماعی امور کے بہت سے مسائل کی اہمیت کو عقل سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو بھی عقل سمجھیں وہ دین کے دائرے سے خارج ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ جو چیز مرضی خدا کو کشف کرتی ہے اور جو چیز خدا کی حکمت اور اس کے ارادہ کو بیان کرتی ہے اور ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس امر کو کس راستہ کے ذریعہ کشف کریں، بلکہ مہم یہ ہے کہ ہم خداوند عالم کے ارادہ تشریعی کو کشف کریں، چاہے یہ کشف قرآن و سنت کے ذریعہ ہو یا عقل کے ذریعہ، کیونکہ یہ تینوں دلیلیں خدا کے احکام اور دینی قوانین کو کشف کرتی ہیں اسی وجہ سے عقل کو احکام الہی کے منابع میں شمار کیا جاتا ہے اور فقہاء کرام نے عقل کو احکام شرعی کے اثبات کرنے والی دلیلوں میں شمار کیا ہے، چنانچہ شرعی مسائل کو ثابت کرنے کے لئے عقل سے بھی تمسک کرتے ہیں، لہذا ایسا نہیں ہے کہ عقل اور شرع کے درمیان کوئی حد موجود ہو کہ کچھ چیزیں عقل سے مربوط ہوں اور کچھ چیزیں شرع سے، بلکہ عقل ایسا چراغ ہے کہ جس کی روشنی میں خدا کی مرضی اور اس کے ارادہ کو تلاش کیا جاسکتا ہے، لہذا جو چیز اس طرح عقل کے ذریعہ کشف ہوگی وہ دینی ہے۔

جو کچھ ہم نے اجتماعی اور سیاسی امور کے بارے میں دین کی دخالت کے سلسلے میں عرض کیا اس پر توجہ رکھتے ہوئے اور مختلف قسم کی حکومتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جواب تک اس دنیا میں وجود پا چکی ہیں خصوصاً وہ حکومتیں جو اسلام کے نام سے یا اسلامی زمانے میں دوسرے ناموں سے جانی جاتی تھیں، یہ نہیں کھا جاسکتا کہ اسلام ان کے بارے میں مثبت یا منفی نظریہ نہیں رکھتا؟، اگر ہم معاویہ اور یزید کی فاسد اور ظالم حکومت کا حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی عدالت و انصاف و حکومت سے مقابلہ کریں تو کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ اسلام ان دونوں حکومتوں کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے؟

کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ ہر انسان آزاد ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی حکومت کے طریقہ کار کو اپنائے؟! اور اس میں دین کی کوئی دخالت نہ ہو، اور انسانی کردار اور اس کی سعادت یا بد بختی میں کوئی دخالت نہیں رکھتا، یعنی کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ نہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت انسان کی آخرت میں کوئی تاثیر رکھتی ہے اور نہ ہی معاویہ کا کردار انسان کی آخرت میں کوئی اثر رکھتا ہے؟! کیونکہ حکومت کا طریقہ کار دنیا اور سیاست سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے! کیا کوئی عقلمند انسان ان باتوں کو قبول کر سکتا ہے؟ کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ دین کی نظر میں یہ دونوں حکومتیں (حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت) مساوی و برابر ہیں؟ اور دین ان میں سے کسی ایک کی مدح یا مذمت نہیں کرتا؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اور حکومتی جیسے مسائل میں دین کی دخالت ضروری ہے، دین کو چاہئے کہ حکومت کے لئے مناسب ڈھانچہ پیش کرے، دین کو بیان کرنا چاہئے کہ حاکم وقت اپنی حکومت کے آغاز ہی سے کمزور اور غریب لوگوں کی فکر میں رہے نہ کہ اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کے چکر میں لگا رہے؟! نتیجہ یہ نکلا کہ دین میں بالخصوص دین اسلام میں سیاسی و اجتماعی مسائل کی ایک بڑی اہمیت ہے اور ان کو دین کے دائرہ سے خارج نہیں کیا جاسکتا، اور اس بات کا اعتقاد صحیح نہیں کہ ان سیاسی اور اجتماعی مسائل کا انسان کی شقاوت اور سعادت میں نہیں اگر انسان کا آخرت، حساب و کتاب اور ثواب و عذاب پر اعتقاد ہے تو کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ معاویہ اور یزید کی حکومت وہ تاثیر نہیں رکھتی! اگرچہ بعض اہل سنت برادران، معاویہ کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے ہیں، لیکن تاریخ میں ایسے بہت سے ظالم و جابر افراد گزرے ہیں جنہوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کمر کے رکھا ہے، کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ ان ظالم و جابر لوگوں کی حکومت، عدالت و انصاف و افراد کی حکومت کے برابر ہیں؟ اسی زمانہ کو لے لیجئے جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، کیا وہ حکومتیں جو عورتوں اور بچوں کو جن کو ہر مذہب و ملت میں بے گناہ مانا جاتا ہے ان کے سر و گردن میں جدائی کریں، ان پر ہم گرائیں اور ان کو زندہ درگور کریں، ان حکومتوں کے برابر ہو سکتی ہیں کہ جن کی تمام تر کوشش کمزور اور مظلوم لوگوں کی نجات کے لئے ہوتی ہیں؟ کیا یہ دونوں حکومتیں جنت میں جاسکتی ہیں؟ لہذا کس طرح سیاسی و اجتماعی مسائل کو دین سے خارج مانا جاسکتا ہے؟ اگر یہ طے ہے کہ

دین اسلام حلال و حرام، ثواب و عذاب اور دوسرے دینی مسائل میں اپنی خاص نظر رکھتا ہو تو بدرجہ اولیٰ سیاسی و اجتماعی مسائل وہ واضح و روشن مسائل ہیں کہ جن میں دین کا نظریہ ضروری ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظریہ جس میں دینی مسائل کو دنیاوی مسائل سے الگ کیا جاتا ہے اور دینی مسائل کو صرف خدا اور آخرت سے مخصوص کیا جاتا ہے، اور ان کو دنیاوی دائرہ سے خارج مانا جاتا ہے (یعنی انسان کے بعض امور، دانشمندی اور سیاسی لوگوں پر چھوڑ دئے گئے ہیں اور بعض امور، دینی علماء کرام پر چھوڑ دئے گئے ہیں) یہ نظریہ بالکل غلط اور باطل ہے اور کسی بھی طریقہ سے اسلامی نظریہ سے سازگار اور موافق نہیں ہے، اسلام انسان کیلئے جس زندگی کے بارے میں نظریہ رکھتا ہے اور اسلام جس طرز زندگی کو پیش کرتا ہے اور ہمیں اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس (گذشتہ) نظریہ سے ہم اہنگ و موافق نہیں ہے۔

چھوڑے ان لوگوں کو جو اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں یہ لوگ نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں اور نہ ہی قیامت پر، ان کی یہ باتیں صرف اور صرف اس وجہ سے ہوتی ہیں تاکہ علماء دین کو اس میدان سے باہر نکال دیں، لیکن ہم کو ان کے ذاتی عقیدہ سے کوئی مطلب نہیں ہماری عرض تو صرف یہ ہے کہ دنیاوی مسائل کو دینی مسائل سے جدا کرنے کا نظریہ اور دنیاوی مسائل کو دینی حدود سے خارج کرنے کا نتیجہ اسلام کے انکار کا سبب بنتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں رکھتا، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسان کا کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو ہماری سعادت یا بدبختی میں موثر نہ ہو، لہذا ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ ہماری تمام زندگی میں دین اپنا نظریہ دے سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو بیان کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول اکرم (ص) نے فرمایا ہے:

”ما من شی یقر بکم الی الجنة ویباعدکم عن النار ویباعدکم من النار ویباعدکم من الجنة الا وقد نھیتمکم عنه“ (۵)
 ”نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جو تمہیں جنت سے قریب کرے اور جہنم سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس کے کرنے کا حکم دیا ہے اور نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جو تمہیں جہنم سے قریب اور جنت سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس سے منع کیا ہے“
 اسلامی نظریہ کے مطابق سعادت کے معنی جنتی ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں اور بدبختی کے معنی جہنمی ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے:

﴿فَاَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا فِی النَّارِ وَاَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا فِی الْجَنَّةِ﴾ (۶)

”تو جو لوگ بدبخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اور جو لوگ نیک بخت ہیں وہ تو بھشت میں ہوں گے“

۸۔ دین کی جامعیت

پیغمبر اکرم کے فرمان کے مطابق ایک دوسرا نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہا کہ کوئی یہ کھے: ٹھیک ہے کہ دین حلال و حرام کو بیان کر سکتا ہے لیکن زندگی کے بعض امور کو خود پیغمبر اکرم نے بیان کر دیا ہے اور بعض دوسرے امور کو لوگوں پر

چھوڑ دیا ہے بعض وہ چیزیں جو آنحضرت کے زمانے سے متعلق تھیں وہ بیان کر دیں اور باقی چیزوں کو ہم لوگوں پر چھوڑ دیا تاکہ زمان و مکان کے لحاظ سے ہم خود طے کر لیں کہ کون چیزیں حلال ہیں اور کون چیزیں حرام۔

کیونکہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم نے سعادت تک پہنچنے والی تمام چیزوں کو بیان نہیں فرمایا جبکہ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جس کے ذریعہ تمہاری سعادت کی ضامن ہو مگر یہ کہ میں نے اس کو بیان کر دیا، البتہ آنحضرت کے فرمان کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے تمام چیزوں کی جزئیات بھی بیان کر دیں، بلکہ آپ نے کلی چیزوں کو بیان کیا ہے تاکہ آئندہ زمانے میں ائمہ (ع) اور مجتہدین جو ایسی صلاحیت رکھتے ہیں کہ جزئی احکام، اور حلال و حرام کو کلی عناوین پر منطبق اور مرتب کر کے ان کے احکام کو معلوم کر لیں، اور ان کو عناوین اولیہ یا عناوین ثانویہ یا حکومتی احکام کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کریں، بے شک مصادیق کی تشخیص اور جزئی احکام، انہیں کلی احکام پر منطبق ہیں کہ جو قرآن، سنت اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں ذکر ہوئے ہیں جن کو اصطلاحاً فتویٰ کھا جاتا ہے۔

حوالہ

(۱) بحار الانوار ج ۳۲ ص ۳۵۴

(۲) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۲۲۵

(۳) سوہ نساء آیت ۱۰

(۴) سورہ مائدہ آیت ۹۱، ۹۰۔

(۵) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۹۶

(۶) سورہ ہود آیت ۱۰۸، ۱۰۶

پانچواں جلسہ

اسلام میں آزادی^(۱)

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے اسلام میں سیاست کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ حکومتی اور سیاسی مسائل، معرف اسلامی کا ایک حصہ ہیں اس سے قبل ہم نے اشارہ کیا کہ بعض لوگوں نے جامعہ میں انحراف اور کج روی پیدا کرنے کے لئے نیز لوگوں کے ذہنوں کو پر اکندہ کرنے کے لئے اسلامی حکومت کے سلسلہ میں بہت سے اعتراضات کئے ہیں جن میں سے ایک شبہ یہ تھا کہ دین کا دائرہ دنیا کے دائرہ سے جدا ہے اور دین دنیاوی مسائل میں کوئی مداخلت نہیں کرتا اور یہ کہ دنیاوی امور میں دخالت کرنا دین کے شایان شان نہیں ہے دین کا کام صرف ان امور سے وابستہ ہے جو آخرت اور منویات سے مربوط ہیں اور انسان کا خدا سے رابطہ کا نام دین ہے، خلاصہ یہ کہ دین سے کم سے کم امید رکھیں اس سے پہلے جلسہ میں ہم نے اس اعتراض کا جواب عرض کیا اور ہم نے ”دین سے ہماری امیدیں“ کی بحث کے سلسلہ میں اس مغالطہ (کہ دین سے ہماری امیدیں زیادہ ہوں یا کم سے کم) کا جواب مفصل طور پر عرض کیا تھا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور اس سے متعلق دوسری واقفیتوں کے دو رخ ہیں: پھلارخ یہ ہے کہ سببی اور مسببی علت اور معلول رابطہ موجود ہے جیسا کہ یہ رابطہ تمام چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً کون کون سی چیزیں آپس میں مرکب ہوں تاکہ فلاں شیمیائی چیز وجود میں آسکے، اور ایک زندہ چیز کن شرائط کے ساتھ رشد و نمو کرتی ہے، یہ انسان جو ایک زندہ چیز ہے کس طرح زندگی کرتا ہے اور کس طرح اپنی صحت و سلامتی کو محفوظ کرتا ہے، اور جب مریض ہو جائے تو کس طرح اپنا علاج کرائے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ اس دنیا کی تمام حقیقوں کا انسان کی روح اور معنوی کمالات سے رابطہ ہے۔

۲۔ علم اور دین کے مخصوص دائرے

الکحل کو کس طرح اور کن چیزوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے اور الکحل کتنے طریقوں کا ہوتا ہے یہ ایک علم ہے اور ایسی چیزوں کی تحقیق اور بررسی کرنا دین کی ذمہ داری نہیں ہے دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ بیان کرے کہ الکحل کو پیا جائے یا نہیں؟ اور اس کا انسان کی روح اور معنوی پہلو کے لئے نقصان دہ ہے یا نہیں دوسرے الفاظ میں یوں کھا جائے کہ دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ بیان کرنا ہے کہ الکحل کا استعمال کرنا حلال ہے یا حرام؟ اس طرح دین دوسری چیزوں کے احکام کو بیان کرتا ہے، نہ کہ اس علمی اور تحقیقی پہلو کو بیان کرتا ہے دین ان چیزوں کی ترکیبات سے بحث نہیں کرتا بلکہ وہ تو ان چیزوں اور انسانی روح اور اس کی صلاح و

اچھائی کے رابطہ کو بیان کرتا ہے اور ان کی تحقیق و بررسی کرتا ہے، کس کارخانہ یا تجارتی گروپ کا منیجر کس طرح صحیح طور پر کام کر سکتا ہے اور کس طرح کے پروگرام بنائے جائیں تاکہ اچھے نتائج برآمد ہو سکیں ان سوالوں کا جواب علم دے سکتا ہے لیکن ان کارخانوں میں کیا چیز بنائی جائے اور کون سی چیز بنانا جائز ہے اور کون سی چیز حرام ہے اور کون سی چیز انسانی روح سے مربوط ہے یہ دین کا کام ہے۔

۳۔ دینی حاکمیت کا آزادی سے ٹکراؤ، ایک شبہ

لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ایک شبہ جو مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے البتہ یہ شبہ صرف ایک مغالطہ ہے، وہ شبہ یہ ہے کہ اگر دین انسان کے سیاسی اور اجتماعی کاموں میں مداخلت کرے اور لوگوں کو کسی خاص طریقہ کو اپنانے پر زور دے یا کسی کی اطاعت کا حکم دے تو یہ انسان کی آزادی کے خلاف ہے اور انسان چونکہ آزاد اور صاحب اختیار ہے کہ جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے، اور اس کو کسی کام پر مجبور کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے، اور چونکہ دین انسان کے لئے تکلیف معین کرتا ہے، اور اس کو کسی کی اطاعت کا حکم کرتا ہے اطاعت بھی اطاعت مطلق (یعنی چون و چرا) یہ سب کچھ آزادی سے میل نہیں کھاتا۔

۴۔ مذکورہ شبہ دینی انداز میں

مذکورہ شبہ کو مختلف شکلوں میں بیان کیا جاتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ شبہ کرنے والا اپنی دینداری کا ڈنکا بجاتا ہے اور خود کو قرآن کا ماننے والا کہتا ہے اور اپنے شبہ کو مومنین اور متدین افراد پر کارگر کرنے کے لئے اس کو قرآنی اور دینی محمل سے سجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام، انسان کی آزادی کا خاطر خواہ احترام کرتا ہے اور قرآن کریم دوسروں کے تسلط اور حکومت کی نفی کرتا ہے یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام کسی پر تسلط (حق حکومت) نہیں رکھتے تھے، اور کسی کو مجبور نہیں کیا گیا لہذا قرآن کے نظریہ کے مطابق انسان آزاد ہے اور کسی کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے۔

ان تمام شبہات اور مغالطوں کا مقصد، ولایت فقیہ کے اصولوں کو ضعیف اور کمزور کرنا ہے، اسی مقصد کے لئے یہ شبہ ایجاد کیا گیا ہے تاکہ ولایت فقیہ کی اطاعت کو انسانی آزادی کے خلاف قرار دیا جاسکے، اور یہ اسلامی نظریہ کے سراسر مخالف ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا خلیفہ ہے، ذیل میں ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو شبہ کرنے والوں نے اپنا مدرک بنایا ہے

(۱) خداوند عالم پیغمبر اکرم سے خطاب فرما رہا ہے:

﴿فَذَكِّرْهُمْ لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصِيطِرٍ﴾ (۱)

”تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو، تم کچھ ان پر داروغہ تو ہو نہیں“
اس آیت کے پیش نظر، پیغمبر اسلام سب سے بلند و بالا مقام رکھتے ہیں جب وہ تسلط نہیں رکھتے اور مسلمان آزاد ہیں ان پر پیغمبر کی اطاعت کرنا لازم نہیں ہے اور پیغمبر اکرم کو لوگوں کی زندگی کے بارے میں اظہار خیال کرنے کا حق بالکل نہیں ہے۔

۲۔ ﴿وَمَا جَعَلْنَاكَ حَفِظًا وَمَا أَنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ﴾ (۲)

”اور ہم نے تم کو لوگوں کا نگہبان تو بنایا نہیں ہے اور نہ تم ان کے ذمہ دار ہو“

۳۔ ﴿وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾ (۳)

”ہمارے (رسول پر) پیغام پہنچانے کے سوا (اور) کچھ (فرض) نہیں“

۴۔ ﴿إِنَّا هَدَيْنَاكَ السَّبِيلَ إِنَّمَا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (۴)

”اور ہم نے (انسان) کو راستہ بھی دکھادیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا“

۵۔ ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ (۵)

”(اے رسول) تم کھ دو کہ سچی بات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو

چاہے نہ مانے“

مذکورہ اعتراض کا جواب

اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ معترض نے جن آیات کے ذریعہ رسول خدا کے تسلط نہ ہونے اور آنحضرت کی اطاعت کو واجب نہ ہونے پر تمسک کیا ہے، ان کے مقابلے میں دوسری ایسی آیات موجود ہیں جو خود معترض کی غلط اور غیر صحیح برداشت کے منافی ہیں ذیل میں ہم ان آیات کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ (۶)

”اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کے اپنے اس کام (کے کرنے نہ کرنے) کا اختیار ہو“

مذکورہ آیت واضح طور پر خدا و رسول کی اطاعت کو لازم اور ضروری ہونے کو بیان کر رہی ہے کہ مومنین کو رسول خدا کی اطاعت سے سرپیچی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۲۔ ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ (۷)

”(اے ایماندارو) تمہارے مالک سرپرست تو بس یہی ہیں خدا اور اس کا رسول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں“

(۳)۔ ﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾^(۸)

”نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں“

دونوں صورتوں میں لوگوں کے بارے میں پیغمبر اکرم کی رائے خود اپنے بارے میں ان کی رائے پر مقدم ہے اس آیت کے سلسلہ میں تمام مفسرین قرآن اس بات پر متفق ہیں، لہذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ پیغمبر کی رائے کو اپنی رائے پر مقدم رکھیں اور پیغمبر کی رائے کی مخالفت کرنے کا حق نہیں رکھتے، البتہ مذکورہ آیت رسول خدا کی اصل ولایت کو بیان کر رہی

ہے، اور یہ بیان نہیں کر رہی ہے کہ آنحضرت کی ولایت کہاں تک محدود ہے، اور آنحضرت کی ولایت اور آپ کی رائے کا مقدم ہونا صرف احتمالی امور میں ہے یا اجتماعی امور کے علاوہ مشخص امور کو بھی شامل ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شبہ کرنے والے نے جن آیات سے تمسک کیا کہ رسول اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کی نفی کی گئی ہے ان دو طرح کی آیات کے تناقض (ٹکراؤ) کا جواب بھی دے ہو سکتا ہے کہ معترض ان آیات سے بالکل غافل ہو، یا ان آیات کے مطلب کو قبول ہی نہ کرتا ہو لیکن چونکہ ہم قرآن کریم کی آیات میں تناقض اور تعارض کے منکر ہیں لہذا ہمیں چاہیئے کہ ان آیات کے ظاہری تناقض کو حل کریں اس اہم امر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان دو طرح کی آیات کو پہلی اور بعد کی آیتوں نیز آیات کے لحن (طرز) اور ان کے مخاطبین کو ملاحظہ کریں تاکہ آیات کے حقیقی مطلب کو سمجھ سکیں۔

۵۔ قرآن پر مختلف توجہ کی دلیل

جس وقت ہم آیات کے پہلے اور دوسرے گروہ پر دقت کرتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آیات کا لحن ایک دوسرے سے مختلف ہے: آیات کا پہلا گروہ ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا ہے اسی وجہ سے خداوند عالم ان لوگوں کو حقیقت اسلام کی رہنمائی کرتا ہے اور اپنی اطاعت کے فوائد کو بیان کرتا ہے اور جب اپنے پیغمبر جو خدا کی رحمت و مہربانی کے مظہر ہیں مگر بعض لوگوں کے اسلام کو قبول نہ کرنے اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کرنے کی وجہ سے پریشان دیکھتا ہے کہ جس کے نتیجے میں یہ لوگ دوزخ کے راستہ کو اپنے لئے ہموار کرتے ہیں ایسے موقع پر خداوند عالم اپنے رسول کو نگران و پریشان دیکھ کر ان کی دلجوئی کرتا ہے کہ اے میرے حبیب ان لوگوں کے ایمان نہ لانے سے کیوں غمگین ہوتے ہیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں ہم نے اسلام کو اس لئے نازل کیا تاکہ لوگ اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اسے قبول کریں ورنہ اگر ہم چاہتے تو تمام لوگوں کی ہدایت کر دیتے اور اس کی قدرت بھی ہم میں ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآ مَن فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ا فَآ نْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾^(۹)۔

”(اے پیغمبر) اگر آپ کا پروردگار چاہتا ہے تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو تا کہ سب کے سب ایماندار ہو جائیں“

خداوند عالم کا انبیاء کو بھیجنے کا ہدف یہ ہے کہ لوگ حق کو پہچانتے ہوئے اپنے لئے سعادت کا راستہ اپنائیں اور اپنے اختیار سے دین حق کو قبول کریں نہ یہ کہ خداوند عالم ان کو ایمان لانے پر مجبور کرے وہ ایمان جو اکراہ اور اجبار سے حاصل ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور ہمارے پیغام کو پہونچانا تھا لہذا آپ ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان نہ ہوں، کیا آپ سوچتے ہیں کہ آپ نے اپنی رسالت کی ذمہ داری پر عمل نہیں کیا، آپ کی رسالت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو خوف اور اکراہ کے ذریعہ مسلمان کریں، کیونکہ ہم نے آپ کو کفار پر مسلط نہیں کیا ہے تاکہ طاقت کے زور پر ان کو مسلمان کر سکیں آیات کے پہلے گروہ کے مقابلے میں آیات کا دوسرا گروہ ان لوگوں کے بارے میں ہیں کہ جنہوں نے معرفت و شناخت کے ساتھ اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کیا ہے ان آیات میں ان افراد کو پیغام دیا جا رہا ہے کہ اسلامی احکامات پر عمل کریں اور اس پیغمبر کی اطاعت کریں کہ جس کے بارے میں اعتماد رکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر اور اس کے تمام احکامات خدا کی طرف سے ہیں اور اس پیغمبر کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور آنحضرت کے فرمان پر حق انتخاب بھی نہیں رکھتے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے انسان کو حق انتخاب ہے لیکن اسلام کو قبول کرنے کے بعد تمام شرعی احکامات کو تسلیم کرنا ہوگا اس بنا پر وہ لوگ جو خدا کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہیں خداوند عالم ان کی سخت مذمت کرتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيدُوْنَ اَنْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُوْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُوْنَ اَنْ يَتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ حَقًّا﴾^(۱۰)

”بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں سے انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں اور رکھتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس (کفر و ایمان) کے درمیان ایک دوسری راہ نکالیں یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں“

بعض احکام کو قبول کرنا اور دوسرے احکام قبول نہ کرنا اسی طرح بعض قوانین کو قبول کرنا اور دوسرے قوانین سے سرپیچی کرنا گویا اص دین کا انکار کرنا ہے، کیونکہ اگر دین کو قبول کرنے کا ملاک و معیار خداوند عالم کے احکامات ہوں تو احکامات الہی کے حساب سے عمل کیا جائے اور خدا کے احکامات تمام احکام و قوانین کو قبول کرنے کے لئے ہیں یہاں تک کہ اگر دین قبول کرنے کا معیار مصلح اور مفاسد ہوں کہ جن کو خدا جانتا ہے، اور اپنے احکامات میں ان کو ملاحظہ کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خداوند عالم تمام مصلح و مفاسد کو جانتا ہے، لہذا پھر کیوں بعض احکام کو قبول کیا جائے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے جو

پیغمبر کا بھی معتقد ہو اور آنحضرت کی قضاوت اور ان کے فرمان کو قبول کرے اور دل سے بھی اس پر راضی رہے حتیٰ ناراحتی کا احساس بھی نہ کرے۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾^(۱۱)

”پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش اس کو مان لیں“
حقیقی مومن، رسول خدا کی قضاوت اور فیصلہ کو دل سے قبول کرتا ہے اور ناراحتی کا احساس نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو پورا یقین ہے کہ یہ رسول خدا کا بھیجا ہوا ہے ان کا حکم خدا کا حکم ہے یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا
﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا رَاكَ اللَّهُ﴾^(۱۲)

(اے رسول) ہم نے تم پر برحق کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو“

اگر کوئی اسلام کو قبول کرنے کے بعد کھے، میں اسلامی احکام میں عمل کرنے سے آزاد ہوں اگرچاہوں عمل کروں اگرچاہوں عمل نہ کروں یہ اس حکومت کی طرح ہے کہ جو ڈیموکریٹک اور آزاد ہے وہ لوگ اپنی مرضی سے اس حکومت کے انتخاب میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے ووٹوں کے ذریعہ وزیر اعظم، رئیس جمہور اور ممبر آف پارلیمنٹ کو منتخب کرتے ہیں لیکن جب بھی حکومت کوئی قانون بناتی ہے تو اس پر عمل کرنے سے؟

اور جب یہ حکومت ٹیکس لگاتی ہے تو کیا کوئی کھ سکتا ہے کہ میں نہیں دوں گا اصل حکومت اور اس کے ووٹ دینے میں آزاد تھے لہذا اب بھی آزاد ہیں کہ اس کے قانون پر عمل کریں یا عمل نہ کریں ان باتوں کو کوئی بھی عقلمند قبول نہیں کر سکتا۔

جی ہاں: اسلام کو قبول کرنے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسلام دلی اعتقاد کا نام ہے اور طاقت کے زور پر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو اس وقت اس سے کھا جائے گا نماز پڑھو اور اگر کوئی کھے کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا یا اگر اس سے کھا جائے کہ زکاۃ دو لیکن زکاۃ دینے سے انکار کرے، اے ک تو کوئی بھی انسان اس کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اگر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے تمام احکام کو بھی قبول کرنا پڑے گا یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام تو قبول کر لے لیکن اس کے احکامات کو قبول نہ کرے، اور اپنی مرضی کے مطابق اعمال انجام دے کوئی بھی حکومت اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ انسان اس کو ووٹ دے لیکن عملی میدان میں اس حکومت کے قوانین کو قبول نہ کرے، اجتماعی زندگی میں بنیادی ترین اصل وظائف اور تعہد و پیمان اور وعدہ پر وفا دار نہ ہو تو اجتماعی زندگی بالکل ہی وجود نہیں پاسکتی۔

لہذا اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں اور پیغمبر پر ایمان رکھتا ہوں لیکن اسلام کے احکامات پر عمل نہیں کرتا اور اس کی حاکمیت اور ولایت کو قبول نہیں کرتا تو ایسے اسلام کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اسلام اور پیغمبر کو قبول کرنا اور اطاعت و پیروی نہ کرنے میں ظاہری تناقض پوشیدہ ہے۔

ہماری گفتگو سے یہ واضح و روشن ہو چکا ہے کہ اگر کوئی انصاف کی آنکھ سے آیات کو ملاحظہ کرے اور ان کی دلالت، لحن اور مابعد کو غور سے دیکھے تو قرآن کریم میں کوئی تناقض نہیں ملے گا اور مذکورہ شبہ کی اطاعت اور آزادی میں جو تناقض ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا جیسا کہ قرآن مجید نے بھی اسی کو صحیح کھا ہے)

لیکن جن کے دل مریض ہیں وہ قرآن کریم کو صداقت اور انصاف سے نہیں دیکھتے اگر یہ لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے تو اس وجہ سے کہ اپنی کج فکری اور منحرف نظریات کی دلائل تلاش کریں، اور اس وجہ سے کہ قرآن کی آیات کے بعض حصوں کو انتخاب کرتے ہیں اور سیاق و سباق (پہلی اور بعد والی آیتوں کو) نہیں دیکھتے اور قرآن کے مطابق محکمات قرآن کو چھوڑ دیتے ہیں اور متشابہات کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

﴿فَاَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ (۱۳)

”پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ انہیں آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فساد برپا کریں اور اس خیال سے کہ انہیں اپنے مطلب پر ڈھال لیں حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پایہ پر فائز ہیں ان کا اصلی مطلب کوئی نہیں جانتا“

متشابہات کی پیروی کے علاوہ آیات کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور آیت کے ایک جملہ کو اخذ کرتے ہیں اور مابعد کو چھوڑ دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کو قرآن مجید میں تناقض نظر آتا ہے جیسا کہ مذکورہ شبہ میں ان لوگوں نے آیات کے مابعد کو چھوڑتے ہوئے اعتراض کیا کہ پیغمبروں کی ولایت آزادی کے مخالف ہے۔

وہ آیات کہ جن میں رسول اسلام کے تسلط کا انکار کیا گیا ہے وہ کفار کے اسلام قبول کرنے سے پہلے نازل ہوئی تھیں جن میں کھا گیا ہے کہ رسول ان کو طاقت کے زور پر اسلام قبول نہ کروائیں یعنی آنحضرت کفار پر تسلط نہیں رکھتے، درحقیقت ان آیات کے مطابق احکام الہی میں عمل کی آزادی اسلام لانے سے پہلے ہے ورنہ تو اسلام قبول کرنے والے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیغمبر اور دوسرے اسلامی احکام کی پیروی کریں اور اس کا وظیفہ ہے کہ تمام اسلامی احکامات کی رعایت کریں، اسلامی اور الہی قوانین کی توہین نیز دین کی توہین یا تجاہر بہ فسق (کھلے عام گناہوں کا مرتکب ہونا) کرنے والوں کا شدت سے مقابلہ کرتی ہے یہ در

حقیقت جامعہ پر اسلامی حکام کی ولایت ہی تو ہے کہ جو ان کو موظف کرتی ہے کہ ایمان اور اسلام کے تمام لوازمات پر موید ہیں وہ اسلام ہے جو خود انھوں نے اپنی مرضی سے قبول کیا ہے۔

۶۔ مذکورہ شبہ غیر مذہبی طریقہ سے

اب تک اس شبہ کے جواب میں بحث کی گئی ہے جو قرآنی اور دینی لہجہ میں تھا، اور یہ شبہ اس شخص کی زبان سے تھا جو خود مسلمان اور دیندار کھلاتا ہے، اور آیات قرآن کو دلیل بناتا ہوا یہ نتیجہ اخذ کرتا تھا کہ اسلام کو الزام آور فرمان نہیں دینا چاہیے، یعنی اسلام کو لوگوں کی زندگی میں دخالت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ دخالت خود اسلام کی قبول کردہ آزادی کے خلاف ہے۔ اس وقت اس اعتراض کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ جو غیر مذہبی طور پر کیا جاتا ہے، اس اعتراض میں شبہ کرنے والے کی یہ فکر ہے کہ اسلام کے الزام آور احکام اور اس کی اطاعت و پیروی کو جوہر انسانیت سے ناسازگار اور منافی قرار دے، اگرچہ یہ شبہ چند طریقوں سے کیا گیا ہے، ہم یہاں پر بعض طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

منطق کی اصطلاح میں ”اختیار“ انسان کی فصل اور مقوم ہے اور اسی سے جوہر انسانیت کی وجود پاتا ہے، لہذا اگر ہم انسان سے اختیار اور اس کی آزادی کو سلب کر لیں اور اس کو مجبور کریں تو گویا ہم اس سے انسانیت کو سلب کر رہے ہیں اور گویا اس کو ایک حیوان کی مانند قرار دے رہے ہیں، اور اس کی گردن میں لگام ڈال کر ادھر ادھر کھینچ رہے ہیں، لہذا انسان کی اہمیت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کو ”حق انتخاب“ دیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اس کے لئے الزام آور احکام بیان نہ کرے، اور اگر اس کو پیغمبر، ائمہ اور نائبین ائمہ کی اطاعت کے لئے مجبور کرے، تو اس صورت میں انسانیت کا احترام اور اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور گویا ہم اس کو حیوان کی طرح قرار دیکر ادھر ادھر لے جا رہے ہیں۔

۷۔ ”ہیوم“ کا اعتراضات اور ان کے جوابات

اول: ہم مذکورہ اعتراض کے دو جواب پیش کریں گے اور چونکہ معترض کا اعتراض ہیوم کے اعتراض کی طرح ہے، ہیوم کا اعتراض یہ ہے کہ عقل نظری ”استھا“ (ہے) کو درک کرتی ہے اور عقل عملی ”بایدھا ونبایدھا“ (فلاں چیز ہونی چاہئے اور فلاں چیز نہیں ہونی چاہئے) کو درک کرتی ہے اور چونکہ عقل نظری کا، عقل عملی سے کوئی ربط نہیں ہے لہذا عقل عملی کی درک شدہ چیزوں (بایدھا ونبایدھا) کو عقل نظری کی بنیاد قرار نہیں دی جاسکتی۔

ہیوم کا اعتراض مغربی فلاسفہ کی قابل توجہ قرار پایا اور انھوں نے اس کو بہت سی علمی چیزوں کی بنیاد قرار دیا، جمہوری اسلامی ایران کے انقلاب کے بعد بہت سے مغربی دانشمندوں نے یہ اعتراض کیا کہ ہم ”استھا“ سے ”بایدھا“ کا نتیجہ نہیں نکال سکتے

مثلاً اگر کوئی شخص ایک خاص صفت رکھتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں لیا جاسکتا ہے کہ اس طرح ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ”استھا“ کی درک کرنے والی عقل نظری ہے اور ”بایدھا“ کو درک کرنے والی عقل عملی ہے، جبکہ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔

ھیوم کے اس اعتراض کو ماننے والے یہ کہتے ہیں: لوگوں کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی انسانیت کے خلاف ہے، لہذا دین کو الزام آور احکامات پیش نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ انسان مختار اور آزاد ہے، پہلے یہ کہتے ہیں کہ انسان مختار ہے لہذا اس کو آزاد رہنا چاہئے، اور اس کو مجبور نہیں کیا جانا چاہئے اس بنا پر انسان کے مختار ہونے سے کہ جو ”استھا“ میں سے ہے اور جس کو عقل نظری درک کرتی ہے ”باید و نباید“ کہ جس کو عقل عملی درک کرتی ہے کا نتیجہ لیتے ہیں اور ان کی بنیاد بھی تناقض ہے کہ جس کو وہ خود قبول کرتے ہیں کہ ”استھا“ کے ذریعہ ”بایدھا“ کا نتیجہ نکلے۔

البتہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر استھا کسی چیز کی علت تامہ ہو تو اس وقت اس کا نتیجہ بایدھا لیا جاسکتا ہے لیکن یہ نتیجہ ہماری بحث میں نہیں لیا جاسکتا، کیونکہ انسان کا مختار ہونا، اس کے مکلف ہونے کی علت تامہ نہیں ہے، بلکہ اختیار تکلیف کے لئے راہ ہموار کرتا ہے، اور کسی کام پر تکلیف اور اس پر مجبور کرنا یا کسی کام سے روکنا کسی خاص مصلحت یا مفسدہ کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے ضمن میں کام ہوتا ہی ہے، لہذا کسی کام پر مجبور کرنے میں اس کی مصلحت چھپی ہوتی ہے اور کسی کام سے روکنے میں اس کا ضرر اور نقصان پوشیدہ ہوتا ہے۔

۸۔ دوسرا جواب: آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہے

اگر ہم اس شبہ کو مان بھی لیں اور کہیں کہ چونکہ انسان مختار ہے لہذا اس کو کسی کام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور کوئی بھی حکومت انسان کے لئے الزامی احکام نافذ نہیں کر سکتی کیوں کہ انسان آزاد ہے جس طرح چاہے عمل کرے اور آزادی کا سلب کرنا ہے اور آزادی کا سلب کرنا یا انسانیت کا سلب کرنا لہذا کوئی بھی قانون قابل اعتبار نہیں ہے اور جنگلی راج اور عسرو صرح کو قبول کر لیں۔

لیکن ہم یہ عرض کریں گے کہ کس چیز کے الزام اجبار ہی کے ذریعہ قانون قانون ہو سکتا ہے قانون اس وقت قانون ہوگا کہ جب اپنے ہمراہ الزام و اجبار لیے ہو کوئی بھی محکمہ ہو جب اس کے قوانین اور دستور العمل کو قبول کر لیا جائے تو اس کو ہر حال میں عمل کرنا ہی ہوگا یہ نہیں ہو سکتا کہ قانون تو قبول کر لے لیکن اگر وہ قانون اس کے نقصان کا باعث ہو تو اس پر عمل نہ کرے اور اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچے اس طرح تو وہ نظام محکمہ چل ہی نہیں پائے گا اور اس محکمہ کا دیوالیہ نکل جائے گا جب تک قانون قانون بنانے والے کی نظر میں مقید ہے سب لوگ اس کی اطاعت کریں یہاں تک کہ اگر اس قانون میں کوئی خامی ہو تو اس کی تلافی

کرنا قانون گذار کی ذمہ داری ہے، اور دوسروں کو قانون میں خامی کا بھانہ بنا کر اور اس پر عمل کرنے سے فرار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۹۔ حاکمیت اور انسان کے خلیفہ اللہی عظمت کے درمیان تعارض ایک شبہ

ایک دوسرا شبہ یہ کھا جاتا ہے کہ انسان قرآن کے مطابق خلیفہ اللہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان روئے زمین پر خدا کا جانشین ہے اور خدا کی طرح عمل کرتا ہے جس طرح خدا نے اس دنیا کو خلق فرمایا ہے اس طرح انسان بھی بہت سی چیزوں کو پیدا کرے اور جس طرح خداوند عالم اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے تو انسان بھی جس کے اختیار میں زمین ہے وہ بھی اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے۔

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پہلے خلافت الہی کے معنی صحیح طرح سے سمجھ لیے جائیں اور توجہ رہے کہ جس معنی میں حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ اللہ کھا گیا ہے

خداوند عالم اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيُهْلِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۱۴)

”یاد کیجئے اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے ملائکہ سے کھائیں روئے زمین پر جانشین (نمائندہ) بنانے والا ہوں تو اس وقت فرشتوں نے کھا کیا تو ایسے کو خلیفہ اور جانشین بنانے کا جو زمین پر خونریزی و فساد برپا کرے ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں تب اس وقت خداوند عالم نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے“

یہ مقام تمام اولاد آدم کے لئے نہیں ہے کیوں کہ قرآن بعض اولاد آدم کو شیطان کہتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ (۱۵)

”اور (اے رسول) جس طرح یہ کفار تمہارے دشمن ہیں اسی طرح (گویا) ہم نے (خود آزمائش کے لئے) شریر آدمیوں اور جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا“ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان ان افراد میں نہیں ہے کہ جس کو ملائکہ سجدہ کرتے اس موقع پر خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا

لَهُ سَاجِدِينَ﴾ (۱۶)

”اور (اے رسول وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کھا کہ میں ایک آدمی کو خمیر دی ہوئی مٹی سے جو سو کہ کر کھن کھن لوٹنے لگے پیدا کرنے والا ہوں تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پہونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا“

خلیفۃ اللہ ہونا بہت سے اہم شرائط رکھتا ہے جن میں سے کچھ شرائط مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ اسماء کا علم

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (۱۷)

”اور (آدم کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دئے“

۲۔ اللہ کا خلیفہ روئے زمین پر عدالت و انصاف کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو

لہذا وہ انسان جس کی عادت قتل و غارت اور خونریزی ہو اور کوئی بھی ظلم کرنے سے نہ گھبراتا ہو وہ خلیفہ اللہ نہیں ہو سکتا (معاذ اللہ) کیا خداوند عالم ظالم ہے کہ اس کا خلیفہ اور جانشین بھی ظالم ہو؟ اللہ کا خلیفہ وہ ہے جو اپنی فردی اور اجتماعی زندگی میں خدائی حفاظت کا اظہار کرے نہ یہ کہ جو دو پیروں سے انسانی شکل میں چلتا ہو وہ خلیفۃ اللہ ہے لہذا وہ افراد جو لوگوں کو گمراہ کرنے اور حکومت اسلامی کو درہم و برہم کرنے میں لگا ہو وہ افراد نہ یہ کہ اشرف المخلوقات نہیں ہیں بلکہ انسانی شکل میں شیطان ہیں جن کو خداوند عالم حیوانوں سے بھی بدتر کہتا ہے ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (۱۸)

”اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بھرے گونگے (کفار) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے“

معرض کہتا ہے کہ انسان کی عظمت و بزرگی اس کے کردار سے ہے اور جو چیزیں انسان کی آزادی میں مانع ہوں وہ قابل قبول نہیں ہے یہ ایک دھوکہ و المانعرہ ہے جو مغرب زمین میں لگایا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی اسے قبول کیا جاتا ہے جبکہ اس کے لوازمات اور اثرات پر توجہ نہیں کی جاتی اور نعرہ پرپاشی کی جاتی ہے بے شک اس نعرہ کے جواب میں کہ جس میں بہت سے اغراض و مقاصد پوشیدہ ہیں ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ بعد میں اس سلسلہ میں بحث کی جائے گی لیکن اس وقت اجمالی طور پر یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے کا مقصد کیا ہے اور کسی محدودیت کے قائل نہ ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی بھی قانون ضروری نہیں ہے؟

اس کو تو کوئی بھی عاقل انسان قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر کام میں آزاد ہے اور جو آزاد ہے وہ کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے کسی کی عزت بھی لوٹ سکتا ہے لوگوں میں نا امنی بھی پھیلا سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے نقصان یا ضرر خود اس نظریہ رکھنے والے کو پہونچ سکتا ہے اور کیا ایسی آزادی رکھنے والوں کے درمیان زندگی بسر کی جاسکتی ہے؟ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی آزادی نامحدود نہیں ہے اور انسان ایسا آزاد نہیں ہے کہ جو بھی چاہے اسے انجام دے اب جبکہ روشن ہو چکا ہے کہ آزادی محدود اور مشروط ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کے حدود کو کون معین کرے؟ اور آزادی کی حد کہاں تک ہے؟

اور اگر طے یہ ہو کہ ہر انسان آزادی کی حد کو معین کرے تو اس کا نتیجہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ ہر انسان اپنی مرضی سے عمل کرے اور یہاں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جو مطلق آزادی پر ہوتا ہے لہذا ضروری ہے کہ آزادی کی حد کو معین کرنے کے لئے ایک قانونی مرجع ہونا چاہئے اس صورت میں اگر کوئی قبول کرتا ہے کہ خدا ہے اور انسان کے لئے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور انسان کی زندگی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور وہ تو صرف اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے تو ایسے شخص کے لئے آزادی کی حد کو بیان کرنے کے لئے خدا کے علاوہ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اعتقادی اور فکری مسائل میں کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ مسلمان اس خدا کو مانتے ہیں کہ جو انسان کے لئے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور بہتر طور پر جانتا ہے کہ انسان کی بھلائی کس چیز میں ہے لہذا وہ اس آزادی کی حد کو بیان کرے لیکن اگر کوئی خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو یا اگر خدا پر ایمان تو ہو لیکن اس کو آزادی کی حد معین کرنے والا نہ مانے اور یہ کھے کہ انسان خود آزادی کی حد کو معین کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں ہزاروں مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ تمام انسان ایک نظریہ پر متفق نہیں ہو پائیں گے اور اگر اکثریت نے آزادی کی حد کو معین کیا اور اقلیت نے اس کو قبول نہ کیا وہ کس طرح اپنے حقوق تک پہونچ سکتے ہیں لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ اگرچہ آزادی ایک خوبصورت اور دل پذیر لفظ ہے لیکن مطلق اور نامحدود نہیں ہے اور کوئی بھی مطلق آزادی کو قبول نہیں کر سکتا۔

حوالے

(۱) سورہ غاشیہ آیت ۲۱، ۲۲

(۲) سورہ انعام آیت ۱۰۷

(۳) سورہ مائدہ آیت ۹۹

(۴) سورہ انسان آیت ۷۶

(۵) سوره کھف آیت ۲۸

(۶) سوره احزاب آیت ۳۶

(۷) سوره مائده آیت ۵۵

(۸) سوره احزاب آیت ۶

(۹) سوره یونس آیت ۹۹

(۱۰) سوره نساء آیت ۱۵۰ و ۱۵۱

(۱۱) سوره نساء آیت ۶۵

(۱۲) سوره نساء آیت ۱۰۵

(۱۳) سوره آل عمران آیت ۷

(۱۴) سوره بقره آیت ۳۰

(۵۱) سوره انعام؛ آیت ۱۱۲

(۱۶) سوره حجر آیات ۲۹ و ۳۰

(۱۷) سوره بقره آیت ۳۱

(۱۸) سوره انفال آیت ۲۲

۱- تاریخ انسان میں تحویل و تحول کی بنا پر ایک شبہ

یہ شبہ انسانی تاریخ، تمدن اور کلچر کے تحول و تبدل نیز اجتماعی نظام میں تغیر و تبدیلی کی بنا پر ہوتا ہے، اور یہ طے شدہ بات ہے کہ انسانی اجتماعی زندگی مختلف مرحلوں سے گزری ہے، اور ایک زمانہ میں ”غلامی“ کا مسئلہ رائج تھا، اور انسانی کی ترقی اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ کمزور اور ناتوان لوگ دوسروں کی غلامی کریں، اور ان کی ہر ممکن خدمتگداری کرتے رہیں، ظاہر سہی بات ہے کہ اس زمانے میں انسان و خدا جیسا غلام اور آقا کے درمیان ہوتا تھا، کیونکہ اس زمانے میں یہ رائج تھا کہ بعض طاقتور لوگ مولا اور آقا اور بعض کمزور لوگ ان کے بندے اور غلام بن کر رہیں، اور انسانوں کے درمیان رابطہ بھی عبد اور آقا کے لحاظ سے سمجھا جاتا تھا، اس بنا پر جس طرح ضعیف اور کمزور لوگ عبد اور بندے اور ذلیل و پست سمجھے جاتے تھے، اس طرح لوگ خدا کے عبد اور بندے سمجھے جاتے تھے، اور خداوند ان کا مولا و آقا، آج جب بندگی اور غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے، لہذا اس وقت کا قیاس اور معیار اس زمانے میں نہیں لانا چاہیے۔

آج انسان کسی بھی زبردستی کو قبول نہیں کرتا، اور اپنے کو آقا سمجھتا ہے نہ کہ بندہ، لہذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ہم بندہ ہیں اور خدا مولا، آج ہم خود کو اللہ کا خلیفہ مانیں، اور جو خدا کا جانشین ہو اس کو بندگی کا احساس کیسا، گویا خداوند عالم سے خدائی ختم ہو چکی ہے اور یہ حضرت اس کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور جو چاہیں کریں جس طرح کوئی حاکم کسی کو اپنا قائم مقام بنائے تو وہ اس کے تمام اختیارات کا مالک بن جاتا ہے، اور اس کے کام کے کام ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حاکم و فرمانبردار کا رابطہ نہیں ہے، اور قائم مقام کے کاموں کی کوئی باز پرس نہیں ہونا چاہیے۔

اس زمانہ میں جبکہ ماڈرن اور جدید تمدن کا دور دورا ہے، اور ہماری زندگی ایک بلند مرتبہ پر پہنچ چکی ہے تو ہم بندگی اور غلامی کی زندگی کے احکام (اطاعت و فرمانبرداری) کو قبول نہیں کر سکتے، اور آقا و مولیٰ کے پیچھے پیچھے گھومتے رہیں، تکلیف اور اطاعت کا زمانہ پیچھے رہ گیا ہے، اور اگر قرآن میں تکالیف اور دوسرے فرمان موجود ہیں تو وہ غلامی کے زمانے کے ہیں، کیونکہ جس وقت رسول اکرم مبعوث ہوئے، غلامی کا زمانہ تھا، اور اسلام کا پہلا دور، خدا و رسول اور لوگوں کے درمیان رابطہ کیلئے مناسب تھا۔

کبھی یہ کھا جاتا ہے کہ انسان تکلیف کا طالب نہیں ہے، لیکن حقوق کا طالب ہے اور اس کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آتا کہ اس پر کوئی فریضہ اور ذمہ داری ہے، تاکہ ان کو انجام دے سکے، انسان کو چاہیے کہ وہ خدا اور دوسروں سے اپنے حقوق کو حاصل کرے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ پیغمبر، آئمہ اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں یہ چودہ صدی پہلے کسی اجتماعی زندگی کا تھا، جبکہ آج کی اجتماعی زندگی بالکل بدل چکی ہے، اور فرائض اور ذمہ داری کی کوئی بات نہیں کرتا بلکہ انسانی حقوق کی باتیں ہوتی ہیں، انسان کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ تجھے یہ حق ہے کہ جس طرح بھی چاہے زندگی کمرے، تجھے اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہننے کا حق ہے، اور جس طرح بھی چاہے اجتماعی زندگی کو بسر کرے۔

۲- ہمارا جواب

ہم مذکورہ اعتراض کا جواب ”تکوینی“ اور ”تشریعی“ لحاظ سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے سامنے دو مقام ہیں: تکوینی مقام، تشریعی مقام، بعبارت دیگر مقام واقعیت اور ”ہست ہا“ (ہے) اور دوسرے مقام تکلیف ”باید ہا“ (ہونا چاہیے) یعنی عالم واقعیات، اور عالم ارزشا (قیمت اور اہمیت) (اگرچہ مذکورہ الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ مختلف لوگوں کو سمجھانے کیلئے مختلف الفاظ ہیں) اب ہمیں یہاں دیکھنا ہے کہ تکوینی لحاظ سے ہماری خدا سے کیا نسبت ہے، کیونکہ اگر کوئی خدا کو مانتا ہی نہ ہو، تو اس کی نظر میں خدا سے کوئی نسبت بے فائدہ ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص خدا پر اعتقاد رکھتا ہو یا کم سے کم یہ قبول کرتا ہو کہ اس کا پیدا کیا ہوا ہے، اور خدا کی خالقیت کو قبول کرتا ہے (خدا کو ماننے کا یہ سب سے کم درجہ ہے) اور اپنے کو خدا کی مخلوق جانتا ہو، البتہ خدا کی خالقیت پر اعتقاد رکھنے سے انسان موحد (خدا کو ایک ماننے والا) نہیں بنتا، لہذا خدا کی تکوینی اور تشریعی ربوبیت کا قائل ہونا ضروری ہے، توحید در خالقیت کی بنا پر کسی کا یہ کہنا کہ وہ خدا کا بندہ اور اس کا مملوک نہیں ہے خود اس کے خداوند عالم کی خالقیت کے اعتقاد سے ٹکراتا ہے، توحید کا پہلا قدم اپنے کو خدا کی مخلوق تسلیم کرنا ہے، اور ہمارا وجود خدا کا عطا کردہ ہے، اور یہ وہی عبودیت ہے، عبد یعنی مملوک، دوسری کی ملکیت ہونا، لہذا اگر کوئی اپنے کو مسلمان اور خدا کا معتقد کھلاتا ہے، لیکن اپنے کو خدا کی عبودیت اور مملوکیت نہیں مانتا، گویا اس کی گفتگو میں واضح تناقض ہے، کیونکہ خدا پر اعتقاد ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ہم خود کو اس کی مخلوق، عبد اور مملوک سمجھیں، اس وجہ سے تمام مسلمان اپنی بہت رین عبادت نماز میں کہتے ہیں ”اشھد ان محمدًا عبده ورسوله“ اور یہ بات مسلم ہے کہ انسان کیلئے سب بہت رین عظمت اور مقام خدا کا بندہ ہونا ہے، اس وجہ سے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا﴾^(۱)

”وہ خدا (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (آسمانی مسجد) تک کی سیر کرائی“

جی ہاں! خدا کی بندگی اور اس کی عبودیت کی اہمیت کے پیش نظر قرآن میں اس خوبصورت لفظ ”عبد“ اور اس کے دوسرے مشتقات کو استعمال کیا گیا ہے، اور انسان کیلئے بہت رین اور بلند درجہ کو ”عبودیت“ شمار کیا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾^(۲)

”اور کچھ لوگوں سے کھے گا) اے اطمینان پانی والی جان اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آتو اس سے خوش ہے وہ تجھ سے راضی ہے تو میرے (خاص بندوں میں شامل ہو جا“

تشریحی لحاظ سے دوسرا جواب

دوسرا جواب تشریحی لحاظ سے یہ ہے کہ انسان کا آزاد ہونا اور قانون ذمہ داری قبول کرنا آپس میں سازگار نہیں ہے کہ جس کا نتیجہ وحشت، ظلم و بربریت اور عسرد صرح ہے، اور یہ نتیجہ نکالنا کہ انسان آزاد ہے جس طرح چاہے عمل کر سکتا ہے، اگرچہ اس نے اس قانون کو ووٹ دیا ہو لیکن اس پر عمل کرنے سے انکار کرے، ایسا تو جنگل میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پر بھی حیوانوں کے عمل کرنے کے لئے خاص قوانین ہوتے ہیں۔

لہذا جب ہم تمدن اور مدنیت کا دم بھرتے ہیں تو ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ مدنیت کا سب سے پہلا رکن یہ ہے کہ انسان قوانین پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہے، اور ذمہ داری اور مسئولیت کو قبول نہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ تمدن جدید کا ادعا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اپنے کو وحشی گری کی سب سے نیچی کھائی میں غلطاں پائیں گے۔

دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جائے کہ انسان کی فصل مقوم عقل ہے، اور عقل کا حکم یہ ہے کہ انسان ذمہ داری کو قبول کرے، اور خدا امور کو انجام دینے کا مکلف سمجھے اور بعض چیزوں سے پرہیز کرے، لہذا اگر کوئی محلہ اور سڑک پر اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہنے یا لوگوں کے سامنے برہنہ آئے اور جو بھی منہ میں آئے وہ کھتا پھرے، تو اس صورت میں کیا کوئی اس کو عاقل تصور کر سکتا ہے؟ یا اس کو وحشی اور دیوانہ کھا جائے گا؟ اور اگر کوئی اس سے سوال کرے کہ تم ایسے کام کیوں کرتے ہو؟ اب اگر اس کے جواب میں کھے کہ میں چونکہ آزاد ہوں اور آزادی مقوم انسان ہے، لہذا میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہوں کروں، تو کیا کوئی انسان اس کی ان باتوں کو قبول کر سکتا ہے؟

لہذا چونکہ انسان کی فصل مقوم عقل ہے، اور اس کا عقلی لازمہ یہ ہے کہ انسانی ذمہ داری اور قانون کو قبول کرے، کیونکہ اگر قانون نہ ہو تو مدنیت نہیں ہو سکتی، اور اگر مسئولیت اور ذمہ داری نہ ہو تو انسانیت بھی نہیں آسکتی، انسان کے آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تکویناً انتخاب کی قدرت رکھتا ہے، نہ کہ تشریعاً قانون اور الزام آور اور امکانات کو قبول نہ کرے، اور اپنی

اجتماعی زندگی میں کسی حد و حدود کا قائل نہ ہو، پس نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ دین کی ولایت آزادی کے مخالف ہے کیونکہ انسان کی فصل مقوم آزادی ہے جس سے انسان کا خدا کا جانشین ہونا لازم آتا ہے!

۳- گذشتہ اعتراض، ایک دوسرے لحاظ سے

بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ انسان کی زندگی میں مختلف طریقوں سے ترقی اور پیشرفت ہوتی ہے، اور جیسا کہ انسانی جدید تمدن میں نئے طریقہ کی نظریات اور تفکرات پیدا ہوئے ہیں، ایسی صورت میں دین کو انسانی حقوق بیان کرنے چاہئیں، نہ یہ کہ دین تکالیف اور الزام اور احکامات بیان کرے، گذشتہ زمانے میں چونکہ غلامی، بردگی اور ظلم و جور کا زمانہ تھا اور جو بھی ذمہ داری اور مسئولیت ان کو دی جاتی تھی وہ اس کو قبول کرتے تھے، لیکن آج وہ زمانہ نہیں ہے آج ہر انسان اپنے کو آقا سمجھتا ہے، آج انسان ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے حقوق لینا چاہتا ہے۔

در حقیقت آج کا ماڈرن زمانہ ہمارے اور گذشتہ (غلامی اور بردگی کو قبول کرنے والے) لوگوں میں ایک بہت بڑی دیوار ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ آج ماڈرن انسان نے گذشتہ زمانے کی طرح ذمہ داری کو قبول کرنے کو بند کر دیا ہے، اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، آج تکالیف اور ذمہ داری کو قبول کرنے کی باتیں کرنا ماضی کی طرف پلٹتا ہے، آج کے اس زمانے نے جس میں حقوق بشر کا نعرہ لگایا جاتا ہے، ڈیموکراسی کی برکت سے انسان کو استشار اور غلامی کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے، آج کا دور وہ دور ہے کہ جس میں جو ادایان تکالیف اور ذمہ داری کی باتیں کرتے ہیں ان کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور حقوق بشر کا نعرہ لگانے والے دین کو تلاش کیا جاتا ہے۔

اعتراض کرنے والے اپنے ہدف اور مقصد تک پہنچنے کیلئے نیز سماج بالخصوص جوانوں کو اپنے طرف جذب کرنے کیلئے ایسی باتیں کرتے ہیں اور مختلف طریقوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی باتوں کو خوبصورت و دلنشیں انداز اور مختلف طریقوں سے جاشنی لگا کر پیش کرتے ہیں، لیکن ہم ان بے ڈھنگے سوالوں کا صحیح انداز میں جواب پیش کرتے ہیں۔

۴- ہمارا جواب

معرض کا مطلق طور پر یہ کہنا کہ آج کا انسان اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، تکالیف و ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتا، یہ بات بیحد و اور باطل ہے جیسا کہ فلاسفہ حقوق بھی کہتے ہیں! انسان اس وقت کسی چیز کا مستحق نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کیلئے کوئی کام انجام نہ دے، مثال کے طور پر اگر شہری حضرات کو صاف و سالم ہوا میں رہنے کا حق ہے تو دوسرے لوگوں پر ذمہ داری ہے کہ وہ ہوا کو آلودہ اور خراب نہ کریں، پر دوشن نہ پھیلانیں، اس طرح اگر کسی کو اپنے مال میں تصرف کا حق ہے تو دوسروں پر ذمہ داری

ہے کہ اس کے مال میں دست درازی نہ کریں، ورنہ اپنے مال سے کوئی بھی بھرہ مند نہیں ہو سکتا، لہذا اگر اس کے لئے کوئی حق ثابت ہوتا ہے تو وہ اس کے بدلہ کوئی کام انجام دے، اگر کسی کو یہ حق ہے کہ وہ سماج کی تیار کردہ چیزوں کو استعمال کرے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی کسی طریقہ سے سماج کی خدمت کرے، اور مسئولیت و ذمہ داری کو قبول کرے، اور دوسروں پر بار نہ بنے، لہذا حق اور تکلیف ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، لہذا یہ کہنا کہ انسان صرف حقوق کا طالب ہو، اور تکالیف کو قبول نہ کرتا ہو، یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

توجہ رکھنا چاہیے کہ الہی اور غیر الہی تمام دانشمندان اور فلاسفہ حقوق نے کلی طور پر ذمہ داری اور مسئولیت کی نفی نہیں کی ہے، بلکہ تکالیف اور ذمہ داری پر یقین رکھتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معترض کی تکلیف سے مراد الہی تکلیف ہے، جس کا نچوڑ یہ ہے کہ خداوند عالم کو ہم پر تکلیف و ذمہ داری نہیں کرنا چاہیے، ورنہ تو ان کی نظر میں حق کے مقابلہ میں تکلیف ہونے سے گریز ناممکن ہے کیونکہ تکالیف کو تمام عقلاء اور دانشمندوں نے قبول کیا ہے ہماری بات کی تائید یہ ہے کہ خود انھوں نے صاف صاف کھا ہے کہ عبد اور مولیٰ کے درمیان رابطہ اور مولیٰ کی طرف سے حکم صادر ہونا اور اس کی اطاعت کا ضروری ہونا غلامی اور بردگی کلچر کے مناسب ہے۔

۵۔ خدا کی نافرمانی تاریخ کی نظریں

صرف آج کا ماڈرن انسان ہی خدا کی اطاعت اور تکالیف سے فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ تاریخ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے شیطانی وسوسوں کی خاطر خدا کی نافرمانی اور قانون شکنی کی ہے، یہ کہنا کھ:

انسان حقوق کا طالب ہے تکالیف کا نہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ شروع ہی میں حضرت آدم (ع) کے فرزند قابیل نے خدا کی معصیت کی اور کھلے عام تکالیف اور الہی قوانین سے سرپیچی کی، اور قانون شکنی کرتے ہوئے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔

﴿وَأَنذَرْتُ عَلَيْهِمْ نَارَ ابْنِ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقْبَلُ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَا قُتْلُكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ - - - ﴿٣﴾﴾

"(اے رسول) تم ان لوگوں سے آدم کے دو بیٹوں (ہابیل و قابیل) کا سچا واقعہ بیان کر دو کہ جب ان دونوں نے خدا کی بارگاہ میں نذر پیش کی تو ان میں سے ایک (ہابیل) کی (نذر تو) قبول ہو آئی اور دوسرے (قابیل) کی (نذر) نہ قبول ہوئی تو (مارے حسد کے ہابیل سے) کھنے لگا میں تجھے ضرور مار ڈالوں گا، اس نے جواب دیا کہ (بھائی اس میں اپنا کیا بس ہے) خدا تو صرف پرہیزگاروں کی (نذر) قبول کرتا ہے"

قرآن مجید میں پیغمبروں کے واقعات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اکثر لوگوں نے اپنے زمانے کے بنی کو جھٹلایا، اور نہ صرف یہ کہ ان کی بات پر لیک نہیں کھا بلکہ ان پر تہمت و بہت ان لگاتے تھے اور ان کا مسخرہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو قتل بھی کر دیتے تھے، یا ان کو شہر بدر کر دیتے تھے اگر کوئی بنی ان کیلئے مفید باتیں بیان کرتا تھا، مثلاً قرآن کے مطابق لوگوں کو کم فروشی سے روکتا تھا، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ - - -﴾ (۴)

”اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو“ ان کے جواب میں کہتے تھے:

﴿قَالُوا يَا شُعَيْبُ اَصْلَاحُكَ تَا مُرْكَ اَنْ نَّتْرِكَ مَا يَعْبُدُ اَبَائُنَا اَوْ اَنْ نَفْعَلَ فِى اَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ - - -﴾ (۵)

”وہ لوگ کہنے لگے اے شعیب کیا تمہاری نماز (جسے تم پڑھا کرتے ہو) تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن (بتوں) کی پرستش ہمارے دادا کرتے آئے ہیں انہیں ہم چھوڑ بیٹھیں، یا ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں کر بیٹھیں“

ممکن ہے اس موقع پر کوئی کہے کہ تاریخ میں انبیا و اولیا الہی کے مقابلے کی وجہ بت پرستی، شرک اور شیطان کی پیروی تھی اور ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ انسان کسی بھی معبود کی اطاعت کی طوق اپنی گردن سے نکال دے، اور بتوں اور شیطان کی پیروی بھی نہ کرے، لیکن یہ کہنا بھی اولیا الہی کی نظر میں باطل اور مردود ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وحی الہی کے مطابق انسان ایسے راستہ پر پہنچ جاتا ہے کہ یا خدا کی اطاعت کرے یا طاغوت (شیطان) کی اطاعت کرے، اور وہ کسی کی بھی اطاعت نہ کرے اس کے لئے محال، اور اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ میں کسی کا بندہ اور غلام نہیں ہوں، درحقیقت ایسا شخص طاغوت اور اپنی ہوائے نفس کا غلام ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَائُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُوهُمْ مِّنَ النُّورِ إِلَى

الظُّلُمَاتِ - - -﴾ (۶)

”خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لاچکے کہ انہیں (گراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست شیطان ہیں کہ ان کو (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کی) تاریکیوں میں ڈال دیتے ہیں“

دوسری جگہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ اَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ، وَاَنْ اَعْبُدُونِى هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ - - -﴾

”اے آدم کی اولاد کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ یقینی طور پر تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور یہ کہ (دیکھو) صرف میری عبادت کرنا بھی (نجات کی) سیدھی راہ ہے“

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر شیطان کی عبادت چھوڑی جائے تو پھر کسی دوسرے کی عبادت اور اطاعت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو چاہیے کہ خدا کی عبادت کرے، جس طرح کہ کلمہ میں ”لا الہ“ کے بعد ”الا اللہ“ ہے۔

اس بنا پر جن لوگوں نے وحی پر توجہ کی اور خواب غفلت سے بیدار ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس خدا کی عبادت کریں جو ان کا خالق اور حقیقی مالک ہے، اور جس کے ہاتھ میں ان کی زندگی، موت، جوانی، پیری، اور صحت و سلامتی ہے، اس کی بندگی باعث افتخار ہے، اس کی تکالیف حکمت و رحمت کے سرچشمہ سے صادر ہوتی ہیں، اور ان پر عمل کرنا انسان کیلئے کمال اور سعادت کا باعث ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ تکالیف اور مسئولیت کو قبول نہ کرنا حیوانی درندگی صفت اور شیطانی پیروی کی وجہ سے ہے، کہ جو ہمیشہ تاریخ میں موجود ہے اور آج کے ماڈرن زمانے سے ہی مخصوص نہیں ہے، درحقیقت یہ ماڈرن انسان ہے کہ جس نے مدنیت سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، اور جاہلیت و وحشیگری کے زمانے کی طرف پلٹ گیا ہے، اور گزشتہ زمانہ کی طرف پلٹ رہا ہے، وگرنہ انبیاء کی تربیت شدہ افراد نے حیوانیت اور وحشیگری سے کنارہ کشی کر لی ہے اور لاقانونیت سے نکل کر قانون، تکالیف اور مسئولیت کو قبول کر کے صحیح معنوں میں مدنیت کو قبول کر چکا ہے۔

لہذا بعض لوگ کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماڈرن زمانہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان کسی بھی ذمہ داری کو قبول نہ کرے! یہ تمدن ہے یا وحشیگری؟ تمدن و محدودیت، قانون اور مسئولیت قبول کرنے میں ہے ورنہ وحشیگری سے کوئی فرق نہ ہوگا۔

لہذا جو لوگ قانون، تکالیف اور مسئولیت کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ مدیریت اور وحشیگری کے قدیم زمانے کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں اور یہ طے ہے کہ کوئی شخص اس نظریہ کے تحت، مقدس اور خلیفہ اللہ نہیں ہو سکتا، جس سے وہ ہمارے لئے نمونہ عمل قرار پاسکے، (اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مدنیت اور قانون کی طرف مائل ہونا جیسا کہ ہمارے سماج میں رواج پیدا کر چکا ہے، اس کا مطلب مدنیت اور قانون مندی کے کمال پر پہنچنا ہے تاکہ کسی بھی جگہ قانون کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اور نہ ہی یہ کوئی نیا حادثہ ہوا ہے اور نہ ہی ہمارا سماج انقلاب کے بعد ۱۹ سال تک وحشیگری کا شکار تھا اور آج مدنیت کی طرف مائل ہوا ہے، بلکہ ہمارا یہ انقلاب مدنیت اور اسلامی تمدن پر استوار ہے، اور انقلاب کے اصل اہداف میں سے ہے کہ تمام مقامات پر الٰہی قوانین کی رعایت کی جائے۔)

انبیاء علیہم السلام لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دیتے تھے اور طاغوت کی پیروی سے روکتے تھے اس سلسلے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾^(۸)

”اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو“

اس چیز کے پیش نظریہ بات قبول نہیں کی ہے کہ اسلام نے انسان کو اپنے علاوہ یہاں تک کہ خدا کی اطاعت سے بھی منع کر دیا ہے، اور یہ طے ہے کہ جو مذہب ہم کو خدا کی اطاعت کی دعوت نہ دے وہ باطل ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ انبیا علیہم السلام کا مقصد خدا کی مطلق طور پر اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے، ہماری موت و حیات اسی سے وابستہ ہے

﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ﴾^(۹)

”ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں“

ہم خدا کی طرف سے ہیں اور خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اب جبکہ ہم نے خداوند عالم کو اپنا مالک حقیقی مان لیا تو پھر کس طرح یہ بات قبول کی جاسکتی ہے کہ خدا کو ہمیں حکم دینے اور فرمان صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا مالکیت اس کے علاوہ ہے کہ مالک جس طرح بھی چاہے اپنی چیز میں تعریف کرے؟ لہذا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم نے اسلام تو قبول کر لیا ہے لیکن ہم خدا کی بندگی کے قید و بند سے آزاد ہیں، کیونکہ اس طرح کی مطلق آزادی نہ صرف یہ کہ اسلام قبول نہیں کرتا، بلکہ اس کو تو عقل بھی قبول نہیں کرتی۔

اسلام آزادی کا نعرہ لگاتا ہے لیکن غیر خدا اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے آزادی و رہائی کا نعرہ لگاتا ہے، خداوند عالم کی اطاعت سے آزادی کا نعرہ نہیں لگاتا، اگرچہ انسان آزاد و مختار پیدا کیا گیا ہے، لیکن تشریعاً و قانوناً خدا کی اطاعت پر مکلف ہے یعنی ہم اپنے ارادہ و اختیار سے خدا کی اطاعت کریں، اور یہ طے ہے کہ خلقت کے اعتبار سے میں ہر مخلوق پر بندگی اور عبودیت کی مہر لگی ہوئی ہے، تکوینی طور پر کوئی بھی مخلوق خدا کی بندگی کے لیل سے خالی نہیں ہے اور ہر موجود کی پستی اس کی عین بندگی ہے:

﴿تَسْبِيحٌ لَهُ السَّمَاوَاتِ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ

تَسْبِيحَهُمْ﴾^(۱۰)

”ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (سارے جہان) میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے (حمد و ثنا) کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے“

اس طرح خداوند عالم دوسرے موجودات کی عبادت اور بندگی کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرِ صَافَّاتٍ كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَ تَسْبِيحَهُ--﴾ (۱۱)۔

”(اے شخص) کیا تو نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ جتنی مخلوقات سارے آسمان اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلانے (غرض سب) اسی کی طرح تسبیح کیا کرتے ہیں، سب کے سب اپنی نماز اور اپنی تسبیح کا طریقہ خوب جانتے ہیں“

لیکن چونکہ انسان صاحب عقل و خرد ہے، مختار و آزاد خلق کیا گیا ہے، اگرچہ خداوند عالم نے ہدایت و گمراہی کے راستے دکھا دیئے ہیں لیکن اپنے لئے راستہ کے انتخاب میں آزاد ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَ إِمَّا كَفُورًا--﴾ (۱۲)۔

”خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا“

لہذا انسان کو اپنے ہدف خلقت کو مد نظر رکھ کر اور اس کو سوچ سمجھ کر خدا کی اطاعت و بندگی میں مشغول رہنا چاہئے، اور خداوند عالم کا تشریعی قانون بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ شیطان اور غیر خدا کی اطاعت میں قدم بڑھائے، بلکہ انسان کو خدا کی اطاعت اور الہی تکالیف کو انجام دے نا چاہئے، کیونکہ خداوند عالم نے اسی مقصد کے تحت اس کو پیدا کیا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ--﴾ (۱۳)۔

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“

اور چونکہ خداوند عالم کی عبادت نظام خلقت و ہستی کے ہمنوا ہے اور خداوند عالم کی تکالیف کو انجام دینا اور الہی وظیفہ و مسئولیت پر عمل کرنا نیز اس خالق کا شکر ادا کرنا خود ایک مہربانی ہے کہ جو ہم کو حیات و زندگی عطا کرتا ہے اور اس کی عنایت اور لطف و کرم سے ہم کو صحت و سلامتی اور دوسری بہت سی نعمتیں عطا کی گئی ہیں جیسا کہ خداوند عالم حضرت ابراہیم علیہم السلام کی زبانی فرماتا ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ، وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيُسْقِينِ، وَإِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ، وَالَّذِي يُمَيِّتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ--﴾ (۱۴)

”جس نے مجھے پیدا کیا (وہی میرا دوست ہے) پھر وہی میری ہدایت کرتا اور وہ شخص جو مجھے (کھانا) کھلاتا ہے اور مجھے (پانی) پلاتا ہے اور جب بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عنایت فرماتا ہے اور وہ شخص جو مجھے ماڈالے گا اس کے بعد (پھر) مجھے زندہ کرے گا“

کس طرح خدا کی اطاعت سے انکار کیا جاسکتا ہے، اور کیا واقعا یہ حق و انصاف سے بعید نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اب ماڈرن انسان تکالیف و اطاعت کا تابع نہیں ہے، اور اپنے حقوق کا طالب ہے؟

کیا اسلام اس فلسفہ کو قبول کر سکتا ہے؟ واقعا ایسے نظریہ کا اسلامی ہونا تو دور کی بات، یہ تو عقل اور انسانیت سے بھی خالی ہے۔

حوالہ

- (۱) سورہ اسراء آیت ۱
- (۲) سورہ فجر آیت ۲۹، ۲۷
- (۳) سورہ مائدہ آیت ۲۷
- (۴) سورہ ہود آیت ۸۵
- (۵) سورہ ہود آیت ۸۷
- (۶) سورہ بقرہ آیت ۲۵۷
- (۷) سورہ لیس آیت ۶۱، ۶۰
- (۸) سورہ نحل آیت ۳۶
- (۹) سورہ بقرہ آیت ۱۵۶
- (۱۰) سورہ اسراء آیت ۴۴
- (۱۱) سورہ نور آیت ۴۱
- (۱۲) سورہ انسان آیت ۳
- (۱۳) سورہ ذاریات آیت ۵۶
- (۱۴) سورہ شعراء آیت ۷۸-۸۱

ساتواں جلسہ آزادی کے حدود

۱۔ اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی کو محدود کرنے کا شبہ

چونکہ ہمارا اسلامی سماج، اسلامی قوانین اور ان متغیر قوانین پر کہ جو اسلامی دائرے میں وضع کئے جاتے ہیں، ادارہ ہوتا ہے لہذا ہماری حکومت بھی اسلامی قوانین پر ہونی چاہیے اور قانون کو جاری کرنے والے حضرات اسلامی دائرے سے خارج نہیں ہونے چاہیے اور ہم لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اسلامی قوانین پر عمل کریں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظریہ انسان کی آزادی سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ انسان اپنی زندگی کے قوانین اور ان کی کیفیت کو طے کرنے میں آزاد ہے، اگر اس سے کھا جائے کہ تمہیں اس دائرے میں چلنا ہے اور ان قوانین کی رعایت کرنی چاہیے تو کیا یہ انسان کی اصل آزادی جو انسان کی مسلمہ حقوق میں سے ہے، اس سے منافات تو نہیں رکھتا؟

ہم مندرجہ بالا سوال کو بیان کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور اس نکتہ سے ہم کو بعد کی گفتگو میں اس سے استفادہ کرنا ہے، اور یہ نکتہ غور طلب ہے: جس وقت عینی اور انضمامی چیزوں سے ہمارا واسطہ ہوتا ہے، تو ان کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا مثال کے طور پر جب ہم طبیعی علوم میں عینی چیزیں جیسے پانی، بجلی، اٹھنا، بیٹھنا، اسی طرح ڈاکٹری امور میں آنکھ، کان، ہاتھ، پیر، معدہ، دل، جگر کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ان چیزوں کو سمجھنا آسان ہے کیونکہ ہم تمام لوگ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں؟ ہاں بہت کم ایسے مسائل مبہم ہوتے ہیں جن کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے جیسے اگر پانی میں مٹی ملی ہو تو کیا پھر بھی پانی ہے یا نہیں؟

لیکن عینی اور انضمامی چیزوں کو سمجھنے میں غالباً کوئی خاص مشکل نہیں ہوتی، لیکن اگر ہمارے سامنے انتزاعی اور کسبی چیزیں ہوں (مثلاً فلسفی مفاہیم یا انسانی علوم مثلاً علم نفسیات، جامعہ شناسی، حقوق اور علوم سیاسی وغیرہ جیسی چیزیں) تو ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اور کبھی کبھی کسی لفظ کے مختلف معنی ہوتے ہیں اور ایک لفظ کے متعدد معنی ہونے کی وجہ سے ان کو سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے غالباً ایسے الفاظ کے بارے بحث کے بعد بھی انسان کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔

مثال کے طور پر ہم سبھی لفظ، فرہنگ (کلچر) سے آشنا ہیں اور یہ لفظ مدارس کی مختلف کلاسوں میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح اشعار، ادبیات اور روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتا ہے، اس کے بعد بھی اگر کسی سے سوال کیا جائے کہ فرہنگ کے کیا معنی ہیں؟ تو شاید ہزاروں میں ایک بھی ایسا شخص بھی نہ ملے جو فرہنگ کے معنی کرتے وقت کہے کہ اس لفظ کے ۵۰ سے ۵۰۰ تک معنی ہیں!

اور یہ مسلم ہے کہ جب اس مشہور اصطلاح میں اتنا ابھام پایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس ابھام کی وجہ سے بہت سے اجتماعی مسائل بھی تحت تاثیر قرار پائیں گے، اور جب توسعہ فرہنگی (کلچر کی وسعت) کی بات کی جائے گی تو سوال کیا جائے گا توسعہ فرہنگی یعنی چیست؟ اور اس کے مصادیق کیا ہیں؟ اور کس صورت میں اور کس طرح فرہنگ میں توسعہ ہوتا ہے اور اگر پارلیمنٹ میں توسعہ فرہنگی کیلئے بجٹ پاس کیا جاتا ہے اور اس کو خرچ کرنے کیلئے جگھیں معین کی جاتی ہیں، ہر وز اتخانہ میں اس لفظ کے معنی بیان کئے جاتے ہیں اور اس کے خاص موارد مشخص کئے جاتے ہیں اور بعض لوگوں کو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔

۲- آزادی کے بارے میں مختلف نظریات

ہم نے جو کچھ انتزاعی اور کسبی الفاظ کے بارے میں عرض کیا کہ جن کے خاص مصادیق بھی نہیں ہیں اور ان کی تعریف و حدود بھی مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی ایک انتزاعی مفہوم ہے جس کے بارے میں ہمیں بحث کرنا ہے، مثلاً اگر کوئی کھے ”آزادی“ تو سننے والے کو اچھا لگتا ہے، اور آزادی کیلئے تمام ہی مذاہب، ملت خاص احترام کے قائل ہیں، کیونکہ انسان فطری طور پر آزادی چاہتا ہے، اور بعینہ آزادی کی تلاش میں رہتا ہے۔

اگر کسی انسان سے سوال کیا جائے کہ آپ آذاد رہنا پسند کرتے ہیں یا غلام؟ لا محالہ سبھی حضرات جواب دیں گے: آذاد رہنا، اور کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ کسی کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ آزادی کے کوئی واضح معنی بیان نہیں ہوتے ہیں، جس کی بنا پر آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد جو دینی اختلافات کا شکار ہو جاتے ہیں کوئی کچھ معنی کرتا ہے تو دوسرا کچھ معنی مراد لیتا ہے، ایک شخص جب آزادی کا مطلب بیان کرتا ہے تو دوسرا کہتا ہے ہماری نظر میں آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں جو ہم کرتے ہیں، اسی طرح دوسرا شخص بھی یہی کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس بارے میں جو کچھ اب ہماری طرف نسبت دیتے ہیں، وہ ہماری مراد نہیں ہے۔

بلکہ ہماری مراد اس کے علاوہ ہے اگر ہم آزادی کے بارے لکھی ہوئی کتابوں، مضامین اور رسالوں کا مطالعہ کریں خصوصاً وہ کتابیں جو آخری سالوں میں لکھی گئی ہیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ مولفین اور صاحب نظر حضرات کے دھیان آزادی کا کوئی مشخص و معین معنی نہیں ہے، ایک شخص آزادی کا کچھ معنی کرتا ہے اور اسی کا دفاع بھی کرتا ہے، تو دوسرا شخص اس نظریہ کی تنقید کرتا ہوا ایک دوسرا معنی کرتا ہے، اور ظاہر میں بات ہے کہ اس قدر اختلاف کے باوجود آپس میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔

لہذا تفاهم اور سمجھوتے کیلئے آزادی کی ایک مشترک تعریف کی جانا ضروری ہے، تاکہ بحث کسی نتیجہ پر پہنچ سکے، اگر ہم سے کوئی سوال کرے کہ آزادی اور اسلام میں سازگاری ہے یا نہیں تو ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ پہلے ہمیں آزادی کو

سمجھنا پڑے گا، کہ آزادی کے معنی کیا ہیں، (اور جیسا کہ مغربی مولفین نے آزادی کے بارے میں حدوداً ۲۰۰ تعریف بیان کی ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سی تعریفیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، صرف ایک یا دو الفاظ کی وجہ سے اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن ان مقامات پر یہ تعریفیں ایک دوسرے کے منافی (اپوزٹ) ہیں تو اس طرح کے اختلافی موارد میں کس طرح یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ آزادی اسلام سے سازگار ہے یا نہیں؟

آزادی کی طرح ”ڈیموکراسی“ (جمہوریت) بھی ہے یہ ایک مغربی اصطلاح ہے جس کے معنی مردم سالاری، حکومت یا لوگوں کی حکومت کئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے کوئی خاص اور معین معنی موجود نہیں ہیں، اس میں یہ معین نہیں ہے کہ ڈیموکراسی ایک حکومت ہے یا اجتماعی زندگی کا ایک طریقہ ہے؟ کیا اس کا تعلق حکومتی اور سیاسی مسائل سے ہے؟ معاشرہ شناسی یا مدیریت سے اس کا ربط ہے؟ یہ جامعہ شناسی سے مربوط ہے یا اس کا ربط مدیریت سے ہے، اس سلسلے میں بھی بہت بحثیں ہو چکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ایسے الفاظ کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی مشکل میں اضافہ کرتا ہے۔

اس طرح لفظ ”لیبرالیزم“ بھی ہے کہ جس کا ترجمہ پہلے ”آزادی خواہی“ ہوتا تھا اور آزادی خواہی لفظ آزادی کی وجہ سے بہت جذاب اور خاص اہمیت کا حامل تھا اور اس بنیاد پر آخری دہائیوں میں شاہ کی پہلوی حکومت ”آزادی خواہ پارٹی“ کا نام اپنائے ہوئے تھی۔

لہذا چونکہ اس طرح کے انتزاعی مفہیم اچھی طرح واضح نہیں ہوتے ان سے بحث کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ واضح نہ ہونے کی بنا پر مطلب مشکل ہو جاتا ہے، اور قطعی طور پر ان کے معنی کی حد بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اس طرح کے الفاظ کی کوئی خاص حد نہیں ہوتی، کبھی ان الفاظ کی حد کم ہو جاتی ہے اور کبھی بڑھ جاتی ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ ان مشکلات کی وجہ سے بحث بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

لفظ آزادی کے بارے میں ان مشکلات، ابھامات اور مختلف نظریات (جیسا کہ ۲۰۰ سے زائد تعریفیں بیان کی گئی ہیں) کے پیش نظر اگر ہم اسلامی لحاظ سے آزادی کو سمجھیں اور الگ الگ تعریفوں کو اسلام کے ساتھ مقایسہ کریں تو واقعاً یہ ایک مشکل و پیچیدہ کام ہے، عمومی اور مختلف لوگوں کیلئے اس بحث کو بیان کرنا تو دور کی بات ہے، لہذا ضروری ہے کہ بحث کو تطبیقی لحاظ سے آگے بڑھایا جائے اور دیکھیں کہ آزادی کے طرفدار حضرات آزادی سے کون سے معنی مراد لیتے ہیں؟ اور آزادی سے کیا چاہتے ہیں، اس وقت دیکھا جائے گا کہ جو وہ لوگ چاہتے ہیں وہ اسلامی نقطہ نظر سے ٹھیک ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جو آزادی چاہتے ہیں اور آزادی کی طرفداری بھی کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس ملک میں آزادی نہیں ہے، آزادی کا کیا مطلب مراد لیتے ہیں؟ کیا میڈیا آزاد نہیں ہے؟ کیا لوگ انفرادی آزادی نہیں رکھتے؟ یا سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی آزادی نہیں رکھتے؟ آزادی کا نعرہ لگانے والے لوگوں کو کس صورت میں آزاد سمجھتے ہیں؟

اگر مصادیق کے بارے میں تھوڑی بحث کی جائے تو ایک واضح نتیجہ پر پہنچنا ممکن ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا رد مقابل کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے، اس صورت میں گفتگو کی روش مبہم نہ رہے اور دوسرے افراد بھی اس سے غلط استفادہ نہ کر سکیں گے۔

۳- آزادی، مطلق نہیں ہے، اور آزادی کے دین پر مقدم ہونے کا جواب

معمولاً خود عرض اور دھوکہ باز افراد آزادی جیسی انتزاعی اور مشکل چیزوں سے اپنے اہداف و مقاصد تک پہنچنے کیلئے آزادی جیسے الفاظ سے سوء استفادہ کرتے ہیں، اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کچھ سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت میں ان کے کہنے کا مقصد فی کچھ اور ہی ہوتا ہے، مغالطہ آمیز اور دھوکہ دینے والے الفاظ کے ذریعہ لوگوں کو فریب دیتے ہیں، مثال کے طور پر تقریروں، مقالوں اور اخباروں میں یہ سوال بیان کیا جاتا ہے کہ دین آزادی پر مقدم ہے یا آزادی دین پر مقدم ہے؟ کیا اصل، آزادی ہے اور دین آزادی کے تابع ہے یا اصل دین ہے اور آزادی اس کے تابع ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ سوال ایک علمی اور دقیق سوال ہے اور یہ سمجھنا واقعاً جذاب ہے کہ آزادی اصل ہے یا دین اصل ہے؟ اس کا درک کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے، لیکن جب ہم بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین اصل ہے تو جواب دیتے ہیں کہ اگر کوئی آزاد نہ ہو تو کوئی پھر کس طرح دین کا انتخاب کر سکتا ہے؟ لہذا انسان کو دین قبول کرنے میں آزاد ہونا چاہئے، پس نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی دین پر مقدم ہے اور جب یہ طے ہو جائے کہ آزادی دین پر مقدم ہے تو پھر یہ نتیجہ بھی آسانی سے نکل آئے گا کہ دین آزادی کو محدود نہیں کر سکتا، کیونکہ آزادی دین سے بالاتر ہے اور دین پر مقدم ہونے کا حق رکھتی ہے۔

قارئین کرام جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مغالطہ آمیز استدلال ظاہر آتو ٹھیک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ اگر کوئی انسان آزاد نہ ہو تو کس طرح دین کو انتخاب کر سکتا ہے، اس لئے انسان کو آزاد ہونا چاہیے، تاکہ اسلام کو دل سے قبول کر سکے، لہذا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی دین پر مقدم ہے، اور یہی اصل ہے بھی دین کو معتبر بناتی ہے، اور بنیادی طور پر دین کی علت وجودی ہے لہذا اپنی پیدا کی ہوئی چیز کے ذریعہ خود ختم یا محدود نہیں ہو سکتی، آخر میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہر انسان کا دینی ماحول بالکل آزادی کے ساتھ ہو گا۔

بعض دوسرے افراد یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو کسی کا غلام نہیں ہوتا بلکہ آزاد ہوتا ہے، لہذا زندگی اس کو میں آزاد ہونا چاہئے۔

اس طرح یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ اختیار اور آزاد ارادہ رکھنا ایک بہت اہم چیز ہے، اس بنیاد پر اگر انسان اس دنیا میں آئے اور اس کے ہاتھ پیر مفلوج ہو جائیں اور زبان سے گوٹکا ہو جائے تو اس کی کیا قیمت ہے؟ انسان کی قدر و قیمت اس وقت ہے

جب وہ آزاد ہو جہاں چاہے جائے جو کرنا چاہے اس کو انجام دے سکے، جو چاہے اپنی زبان سے کھے اور چونکہ انسان تکوینی طور پر آزاد خلق ہوا ہے تو پھر قانونی طور پر بھی انسان کو آزاد ہونا چاہیئے!

یہ وہی طبیعت گرانہ مغالطہ ہے کہ جس میں ”است“ (ہے) سے ”باید“ (ہونا چاہیئے) کا غلط نتیجہ نکالا گیا ہے، اگر ہم چاہیں کہ ان تمام مسائل کو دقیق اور جدی طریقہ سے بحث کریں تو ہم کو فلسفی اور دقیق بحث کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، اور بہت جلدی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم آزادی کے بارے میں بحث کریں تو پھر دسیوں تعریفوں سے تحقیق و بررسی کرنی ہوگی، اس وجہ سے مصادیق کے سلسلے میں ہی بحث کرنا مناسب ہے، اور آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد سے کہیں کھ: اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگا کر کھے میں آزاد ہوں؟! تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہر سی بات ہے کہ جواب منفی ہوگا اور اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا، اور جواب یہ ملے گا کہ آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تو دوسروں پر ظلم ہے لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی اس وقت تک مناسب ہے کہ جب تک دوسرے پر ظلم و زیادتی نہ ہو، یعنی آزادی مطلق نہیں ہے۔

اور اگر اس سے یہ کھا جائے کہ کوئی شخص تمہارے خاندان اور عورتوں کے بارے میں جو کچھ چاہے کھے، وہ تم کو مار تو نہیں رہا ہے بلکہ آپ کی بے حرمتی کر رہا ہے اور تمہارے یا تمہارے اہل خانہ کے بارے میں نازیبا الفاظ کھ رہا ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے گا، کیونکہ یہ بھی دوسروں کے حقوق کی پائمالی ہے، اور ناموس کی عزت بھی معاشرے میں محترم ہے، پس معلوم ہوا کہ عزت و ناموس پر تجاوز و زیادتی ظاہری چیزوں پر منحصر نہیں ہے۔

اور اگر کوئی شخص کسی اخبار میں اس کے خلاف کچھ لکھے اور مقالہ کے ذریعہ اس کی شخصیت اور آبرو کو داغدار کرے، تو اس صورت میں کیا یہ فیزیکی اور ظاہری طور پر اس کی بے حرمتی نہیں ہوتی ہے، یعنی زبان کے ذریعہ اس کی بے عزتی نہیں ہوتی ہے، کیا کوئی اس چیز کی اجازت دے سکتا ہے؟ ہرگز کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا، اور اس کام کو بھی دوسروں کے حقوق کی پائمالی اور اپنے لئے بے عزتی جانتا ہے، اور اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اس کی آبروریزی کرے، اور اس کے حقوق کو پائمال کرے، نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے اب تک تین قیود و شرط موجود ہیں اور اگر ان شرطوں کی رعایت نہ کی جائے تو دوسروں کے حقوق کی پامالی ہے۔

۳۔ ہر معاشرے کی مقدسات کی رعایت ضروری ہے۔

ایک دوسرا نکتہ کہ جس کے بارے میں بحث کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر معاشرہ کی مقدسات (قابل احترام چیزیں) الگ الگ ہیں، اور نسبی ہوتی ہیں مثال کے طور پر بعض معاشروں میں کسی کی بھن یا بیٹی سے آزادانہ رابطہ کرنا معیوب نہیں ہوتا، جیسا کہ یورپی

اور امریکائی ممالک ہیں کہ کوئی بھی شخص کسی بھی لڑکی یا عورت سے دوستی کرنا چاہے، تو چاہے اس دوستی کے نتائج کچھ بھی نکلیں کوئی مشکل نہیں ہے۔

کیونکہ دونوں کی مرضی سے یہ کام ہو رہا ہے لیکن اگر کوئی شکایت کرے اور کورٹ میں جا کر اس کے خلاف مقدمہ دائر کرے کہ طاقت کے بل بوتے پر مجھ پر ظلم ہوا ہے اور میں راضی نہیں ہوں، تو عدالت اس کی اس شکایت کو سنتی ہے لیکن صرف مرد و عورت کی دوستی کیونکہ اپنی مرضی سے ہوتی ہے، لہذا کوئی عیب نہیں ہے! لہذا اگر کوئی شخص کسی سے کچھ میری اور تمہاری بھن کی دوستی ہے اور کل رات فلاں جگہ تھے یورپی فرہنگ و کلچر میں برا نہیں سمجھا جاتا، اور کوئی اس بات پر خوش بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہی بات بری سمجھی جاتی ہے اور اس کو برا سمجھا جاتا ہے کسی کو ایسی باتیں کہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا، ان باتوں سے ایک دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ہر معاشرے میں کچھ خاص چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کو وہ محترم اور مقدس سمجھتا ہے، درحالیکہ بھی چیزیں دوسرے معاشرے میں نہیں پائی جاتیں، اب یہ دیکھنا ہے کہ ان مقدسات کا معیار کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر معاشرے کی مقدسات اس کی ثقافتی اور اجتماعی زندگی کی وجہ سے ہوتی ہیں، اور ظاہر سی بات ہے کہ یہ مقدسات معاشرے کی بنیاد، اس ماحول اور ملک کے ثقافتی معیار کی وجہ سے ہوتی ہیں لہذا اگر کسی معاشرے میں وہاں کی ثقافت کے وجہ سے کچھ چیزیں مقدس اور قابل احترام ہوں، تو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے اور ان کی بے احترامی نہیں ہونا چاہیے، اور کسی بھی معاشرے میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہے کچھ، جبکہ اس کو اس طرح کی باتیں کرنا چاہیے جن سے ان مقدسات کی بے احترامی نہ ہوتی ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے بہت سی قید و شرط ہیں کہ جن کی ہر معاشرہ کے لحاظ سے رعایت کرنا چاہیے اور آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کچھ، اور جس طرح چاہے کرے، ہاں اگر جس ماحول میں وہ زبان کھول رہا ہے اس میں اس کو بے احترامی نہیں سمجھا جاتا تو اس کا کہنا صحیح ہے لیکن جس معاشرے میں وہ کھ رہا ہے اگر وہاں اس کا یہ کہنا اس معاشرے اور مذہب کے مقدسات کی توہین ہے تو پھر کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ مقدسات کے ہدف کچھ کئے، اور جو چاہے انجام دے اور کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا، اگرچہ ہم نے جو کچھ بیان کیا، مغربی ممالک میں محترم اور با اہمیت نہیں سمجھا جاتا اور ہر انسان اپنی گفتار و کردار میں آزاد ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں چونکہ اسلامی حکومت ہے مغربی ممالک سے فرق ہے اور اس طرح کی آزادی نہیں ہے کہ جو چاہے لوگوں کی طرف نسبت دے اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے فرہنگ و ماحول میں یہ چیزیں با ارزش ہیں اور ہر قوم و ملت کے مقدسات کا احترام کرنا ضروری ہے اور آزادی کے بھانہ ان کی خلاف ورزی کرنا صحیح نہیں ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ آزادی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں اور اس قدر آزادی کو کوئی بھی عقلمند انسان قبول نہیں کر سکتا، لہذا آزادی کے اس طرح معنی بیان کرنے چاہئے جس سے دوسروں کی توہین اور ان کے حقوق کی پامالی نہ ہوتی ہو۔

لہذا جن باتوں سے لوگوں کے مقدسات کی توہین ہوتی ہو ان کا بیان کرنا ممنوع اور ناجائز ہے، اسلامی معاشرہ میں آزادی کا بھانہ بنا کر خاص طور سے جان سے زیادہ عزیز اسلامی مقدسات کی توہین کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

ہماری قوم و ملت نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے عزیزوں کی لاکھوں جانیں قربان ہو جائیں، لیکن اسلام باقی رہے، اب اگر مغربی کلچر میں کسی بھی طریقہ سے کسی کی توہین ہو (مثلاً یہ کھا جائے کہ آپ کی ناک بہت لمبی ہے، آپ کا قیافہ برا ہے) اس کو عدالت میں جانے اور مقدمہ دائر کرنے کا حق ہے، اسی طرح اگر ہمارے معاشرے میں کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں توہین کرے، وہ بھی اس بارے میں کہ جو ماں، باپ، بیوی اور اولاد حتیٰ خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو، ظاہر ہے کہ لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا حق ہے کہ آزادی کا بھانہ بنا کر ہمارے مقدسات کی توہین کیوں کر رہے ہو۔

۵۔ آزادی کے نعرہ میں ناجائز غرض

جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں اور آزادی نہ ہونے کا غم مناتے ہیں اور ایران میں آزادی نہ ہونے کا مرثیہ پڑھتے ہیں! کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ان میں سے بعض لوگوں نے مغربی ممالک کا سفر کیا ہے یا ان کے بارے میں سنا ہے یا وہاں کی فلموں کو دیکھا ہے، جو لوگ اس طرح کی زندگی چاہتے ہیں، لیکن ایران میں ان کو اس طرح کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسلامی حکومت کھان سے قوانین بناتی ہے؟ کیا اسلامی حکومت کے قوانین خدا، رسول اور آئمہ کی مرضی کے مطابق قوانین نہیں ہوتے ہیں؟ وہ لوگ الہی احکام کو قبول نہیں کرتے، ولی فقیہ پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور ولی فقیہ کے متعلق کینہ رکھتے ہیں جبکہ ولی فقیہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتا:

﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾^(۱)

”یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ (یہ) ظالم (حقیقتاً) خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں“

کیا مرجع تقلید اور فقیہ اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے؟ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے قرآن، احادیث سے اخذ کرتا ہے لیکن دشمن اس چیز کو قبول نہیں کرتا، امریکہ کی معتبر یونیورسٹیوں کی کھلی فضا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے سامنے ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کے بیان کرنے سے شرم آتی ہے، وہاں کے عیاش خانوں میں کیا کیا ہوتا ہے؟ تصور کریں اگر وہاں کے عیاش خانوں کی ویڈیو بنائی جائے اور اس کو اس ملت کے جوانوں کو دکھائی جائے تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ اور ظاہر ہے کہ

اگر کوئی جوان ایسی فلمیں دیکھنے گا، اور جب صبح اٹھ کر یونیورسٹی جائے گا تو پھر سکون سے نہیں رہ سکے گا، کیونکہ رات میں سویا ہی نہیں ہے، اور دوسری طرف اس کی شہوت تحریک ہو جاتی ہے، اور اس کا چین و سکون غائب ہو جاتا ہے، اب اگر ایسا جوان نعرہ لگائے کہ یہاں آزادی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو میں کرنا چاہتا ہوں، اس کو کرنے نہیں دیا جاتا اسلام کے مقابلہ میں اسی طرح کی آزادی کو لایا جاتا ہے۔

اور کھا جاتا ہے کہ آزادی مقدم ہے یا اسلام؟ اس آزادی کا مطلب ہی جنسی شہوات کو پورا کرنا ہے، لہذا شروع ہی سے یہ کھا جائے کہ آزادی سے ہم یہ چاہتے ہیں، ہر وہ چیز جو کچھ کفر و الحاد کے ماحول میں ہوتی ہے وہی معاشرے میں بھی جائز ہو جائے تو وہ مطمئن رہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ لوگوں نے اپنے عزیزوں کی جانیں قربان کی ہیں تاکہ اسلام کا رواج ہو، نہ کہ مغربی فساد اور بے ہودگی رائج ہو۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم واقعتاً مسلمان ہیں اور اس حکومت کو ووٹ دیا ہے اور ولایت فقیہ کے معتقد ہیں اور جیسی آزادی مغربی ممالک میں رائج ہے ایسی آزادی نہیں چاہتے، بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم لکھنا چاہیں اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے بے جھجک لکھ سکیں ہم تو آزادی بیان و قلم اور عملی آزادی کے خواہاں ہیں، ہم کو اپنی بات کہنے کی آزادی ملنا چاہیئے۔

یہ بات ظاہراً ٹھیک ہے کیونکہ حقوق بشر کے نشریات میں سے ایک حق جو تمام لوگوں کو ہے یہ بھی آزادی بیان اور میڈیا کی آزادی ہے اور اسی طرح کی آزادی کو ڈیموکریسی کی ایک اصل مانا گیا ہے، لیکن ہم ان سے یہ کہیں گے کہ آپ اپنی رائے کا اظہار کریں کہ ہمارے ملک کے حکمران کیسے ہیں لیکن کیا واقعتاً آپ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں شہر کا فلاں قاضی صحیح کام کرتا ہے یا نہیں یا فلاں شہر کا ڈی ایم (D-M) ٹھیک کام کرتا ہے یا نہیں یا فلاں ملازم کا کردار صحیح ہے یا نہیں؟ یا درحقیقت آپ اصل اسلام اور اسلامی مقدسات کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں اور ان تمام چیزوں کی نفی کرنا چاہتے ہیں؟ یا اسلامی مقدسات کی توہین کرنا چاہتے ہیں؟

۶۔ آزاد گفتگو کی حدود

اگر آزادی سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جس کام کا ہونا جائز نہیں ہے اس کے بارے میں لکھنا اور کہنا جائز ہونا چاہیئے، جیسا کہ ہم نے مثال میں عرض کیا تو جب کسی شخص کو آپ کے سلسلے میں کوئی توہین آمیز کلمات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے، یعنی وہ اتنی آزادی نہیں رکھتا لیکن جب اسلامی مقدسات کی بات آتی ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ آزادی بیان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو چاہیں لکھیں ہم جو چاہیں کہیں!

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں توہین آمیز کلمات زبان پر جاری کرے، اور اگر کوئی ایسا کرے تو آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور مقدمہ دائر کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، آپ اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ذاتی مسائل کو اخبار میں دیا

جائے تو پھر آپ کو اس ملت کے راز فاش کرنے کا حق کھان سے حاصل ہو گیا؟ کس طرح آپ کی نظر میں کسی ایک شخص کے راز کو فاش کرنا جائز نہیں ہے، لیکن ایک ملت کے راز کو فاش کرنا جائز ہو گیا! یعنی آپ کی نظر میں جب ایک شخص لاکھوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو کیا اس کے راز کو فاش کرنا جائز ہے؟ کیا ایک معاشرے کی نسبت اپنے مقالوں میں حدود کی رعایت کرنا ضروری نہیں ہے؟ کیا کچھ بھی لکھا اور کیا جاسکتا ہے، معاشرے کے بھی کچھ حقوق ہیں، اس کے مقدسات ہیں اور ان کا احترام باقی رہنا چاہیے اور مقدسات کو مجروح نہیں کیا جاسکتا۔

جس طرح آپ اپنی توہین کر برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اسی طرح آپ اپنی ناموس یا آپ کے گھریلو اسرار کے بارے میں تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے، تو پھر آپ کس طرح اجازت دیتے ہیں کہ اس عظیم معاشرے جس نے ہزاروں عزیزوں کو ان مقدسات کی حفاظت کیلئے قربان کر دیا ہے اس کی توہین کی اجازت دیتے ہیں؟!

کیا آپ کی نظر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے؟ اور آزادی کا بھانہ بنا کر قانون کی طرف سے کوئی حد و حدود نہیں ہونا چاہیے؟ کیا آزادی مطلق ہے؟ اور اگر آزادی مطلق ہو تو کسی کے بارے میں کچھ بھی کھنے کا حق حاصل ہونا چاہئے اور اگر اس ۶/ کروڑ والی ملت کی مقدسات مجروح ہوں اور کوئی تم پر اعتراض کرے تو آپ جواب میں کہیں: اظہار نظر کرنا آزاد ہے! اس سے بڑا مغالطہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے احترام کو مجروح کرنا جائز نہیں ہے لیکن ۶/ کروڑ والی ملت کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے، لیکن ایک عرب مسلمانوں کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے! یہ کونسی منطق اور فلسفہ ہے؟ اور صرف اس وجہ سے کہ حقوق بشر کے نشریات میں موجود ہے کہ بیان آزاد ہے مقدسات کی توہین کرنا بھی آزاد ہو جائے گا؟! آزادی کا ایک مبہم کلمہ استعمال کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کی تفسیر کر کے سوء استفادہ کرتا ہے۔

۱۔ الفاظ کے مفہوم اور مصادیق کو روشن کرنے کی ضرورت

ہم یہاں پر یہ مشورہ نہیں دیتے ہیں کہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو استعمال کرنے کے بجائے ان کے مصادیق پر تکیہ کریں اور کہیں کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً یہ کھنے کے بجائے کہ اسلام ڈیموکریسی کے موافق ہے یا نہیں؟ کہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور کون سا عمل انجام دینا چاہتے ہیں؟ کیا آپ خدا اور اس کے احکام کو نادیدہ کرنا چاہتے ہیں اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، اگر ڈیموکریسی کے یہ معنی کیے جائیں کہ انسان جس طرح کے قوانین بنانا چاہے بنا سکتا ہے اگرچہ خدا کے قوانین کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، تو چاہے پوری دنیا زور لگائے ہر گز ہم ایسی ڈیموکریسی کو قبول نہیں کر سکتے۔

لیکن اگر ڈیموکریسی کے یہ معنی کئے جائیں کہ لوگ اپنی سرنوشت اور زندگی میں موثر ہیں، کوئی شخص اپنے زور کے ذریعہ ان پر تسلط نہیں کر سکتا، افراد بھی اسلامی قوانین اور بنیادوں کے دائرے میں چلیں، تو اس چیز پر تو شروع انقلاب سے عمل ہو رہا ہے،

اور اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ایران کے برابر کسی بھی ملک میں لوگوں کی کا احترام نہیں کیا جاتا، تو شاید دعویٰ بے جا نہ ہوگا، اور شاید کھنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہمارے پاس اس حد تک ثبوت نہیں ہیں، لیکن پھر بھی ہمارا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں کھیں بھی اتنی آزادی نہ ہو، لہذا لفظ ڈیموکراسی پر بحث و مباحثہ کرنا کہ اسلام ڈیموکراسی کا موافق ہے یا مخالف ہے؟

اس سے بہت ریم ہے کہ پہلے اس کے مصادیق کو معین کر لیں، مثلاً کیا اسلام ہم جنس بازی کے آزاد ہونے کی اجازت دیتا ہے؟ چاہے تمام ہی لوگ ایسا نظریہ رکھتے ہوں، ظاہر ہے کہ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا اگر تمام ہی لوگ اس چیز کے موافق ہی کیوں نہ ہوں اور اس بارے میں ووٹ بھی دیں، لہذا اگر ڈیموکراسی اس حد تک بے لگام ہو تو پھر ہم اس کو نہیں مانتے، لیکن اگر ڈیموکراسی سے مراد یہ ہو کہ افراد انتخابی مہم میں آزاد ہیں پارلیمنٹ کے ممبران کو آزادانہ طور پر منتخب کریں، صدر کا انتخاب آزادانہ طریقہ پر ہو اور ان کو حق ہے کہ ممبران پارلیمنٹ یا دوسرے ذمہ دار افراد کی استیضاح^(۱) کرے تو ایسی آزادی ہونا چاہیے کہ الحمد للہ ہمارے یہاں یہ آزادی ہے، اور ہم بھی سو فیصد اس کی حمایت کرتے ہیں، لہذا اس کے لئے الفاظ کی بحث میں جانے سے بہت ریم ہے کہ ان کے مصادیق کے بارے میں بحث کی جائے، کھلے عام کھیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں تاکہ اس کا جواب بھی واضح طور پر دیا جاسکے۔

اور اگر الفاظ مبہم اور نامشخص استعمال کئے جائیں گے تو ان کے جوابات بھی مبہم دئے جائیں گے، درج ذیل الفاظ جیسے آزادی، ڈیموکراسی، لیبرالیزم، جامعہ مدنی، تمدن اور فرہنگ و ثقافت مبہم ہیں کہ جن کی مختلف تفسیریں کی جاسکتی ہیں لہذا ان کے بارے میں بحث و مباحثہ کرنا کبھی بھی عقلمندی نہیں ہے، صاف کھیں کیا چاہتے ہیں تاکہ ہم اس کا جواب دیں کہ آیا اسلام سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

^(۱) یعنی ممبر آف پارلیمنٹ کسی وزیر سے کسی سلسلہ میں توضیح مانگے اور نامطمئن جواب ملنے پر دوبارہ اس کے بارے میں ووٹنگ ہو اور اگر اس کے بارے میں اعتماد رائے باقی رہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو ہٹا دیا جاتا ہے۔

حوالہ

آٹھواں جلسہ

حکومت کے ڈھانچے کی وضاحت

۱۔ عنصری اور مصداقی تعریف کی اہمیت

ہم اس جلسہ میں اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل و صورت کے بارے میں بحث کریں گے، یہاں پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت امام خمینی کا ایک مختصر سا واقعہ بیان کریں:

انقلاب کے ابتدائی دور میں ایک بیرونی رپورٹر نے حضرت امام خمینی سے سوال کیا کہ آپ شاہ کی حکومت کو سرنگوں کرنے کے بعد کون سی حکومت تشکیل دیں گے؟ تو آپ نے فرمایا: ہم حضرت علی علیہ السلام کی طرح حکومت بنائےں گے، ظاہر ہے کہ اس خارجی خبر نگار کے لئے اسلامی حکومت کو سمجھنا مشکل تھا کیونکہ وہ اسلامی ثقافت کو سمجھنے سے قاصر تھا، اس کو سمجھانے میں گھنٹوں درکار تھے؛ لیکن حضرت امام خمینی نے اس کو ایک جملہ میں قانع کنندہ جواب دیدیا، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو دشمن اور دوست سبھی جانتے ہیں اور اس کے لئے زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت نہیں تھی، اور ساتھ ساتھ ہماری حکومت کی بھی شناخت ہو گئی۔

اس قسم کی تعریف و وضاحت؛ یعنی اس طرح کی سادہ اور مصداقی تعریف عوام الناس کو سمجھانے کے لئے بہت بہت رہے، کیونکہ انتزاعی اور فلسفی چیزیں عوام الناس کو سمجھانے کے لئے مشکل و دشوار ہوتی ہے، کہ جس میں خارجی مصداق سے سروکار ہوتا ہے، لہذا خارجی نمونہ پیش کر کے کسی کو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بجلی یعنی کیا؟ تو روشن بلب کی طرف اشارہ کر کے یا دوسرے الیکٹریک سامان کی طرف اشارہ کر کے اس کو سمجھایا جاسکتا ہے، کہ یہ سامان بجلی سے چلتے ہیں تو اس کی سمجھ میں بجلی کا مفہوم آجائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کسی چیز کی تعریف کرنا جس میں اس کی ذاتیات اور عوارض اور اس کی اصلی خصوصیت سے اجتناب کیا جاتا ہے، لیکن عملی اور اکیڈمیک اصطلاح میں اگر کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے تو اس کی ذاتی یا عرضی خصوصیات کو بیان کیا جاتا ہے کہ جن میں سے منطق کی مشہور تعریف ہے کہ جس میں جنس و فصل ذکر کی جاتی ہے، اس طرح کی تعریف میں پہلے ایک عام اور وسیع مفہوم کو تصور کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ایک خاص مفہوم کو ذکر کیا جاتا ہے تاکہ دوسری چیزیں اس میں شامل نہ ہو۔

کسی چیز کی پہچان اور تعریف کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے عناصر کو شمار کیا جاتا ہے؛ یعنی کسی ایک ماہیت کے لوازم اور خصوصیات کی تحقیق کی جاتی ہے اور ان سب کو ملا کر اس چیز کی تعریف قرار دیدی جاتی ہے، اور کوئی بھی شخص اس کی خصوصیات کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے کہ جو چیز بھی وہ خاص خصوصیات رکھتی ہوگی وہی فلاں چیز ہوگی۔

۲۔ اسلام اور تینوں قوتوں کے جدا جدا ہونے کا نظریہ

حکومت کے وسیع پیمانے پر تعریف کرنا اور اس کی ان خصوصیات کو بیان کرنا جن کو اسلام نے بیان کیا ہے، یا سیاست کے بارے میں اسلام کے نظریہ کو ایک جملہ میں اس طرح کھا جاسکتا ہے: کہ سیاست کے بارے میں اسلام کا نظریہ ہے کہ سیاست اور حکومت کے تمام امور الہی اور وحی سے الھام گرفته ہیں، اور بھی چیزیں حکومت اور نظام اسلامی بن جانے کی ضمانت ہوتی ہیں۔

مزید وضاحت اور اسلامی حکومت کو ایک جامع شکل پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ (حکومتی) قوتوں کے جدا جدا ہونے کے نظریہ کو بیان کیا جائے کہ جو ”حقوقی فلسفہ“ میں بیان ہوتی ہیں، ان آخری چند صدیوں میں مغربی حقوق داں فلسفی حضرات کے درمیان کافی کشمکش ہوتی آئی ہے کہ (حکومتی) قوتوں کو ایک جگہ ہونا چاہئے یا الگ الگ کہ ہر شخص یا ہر گروہ صرف ایک طاقت کا مالک ہو، اور آخر کار ”رئیس“ کے زمانے کے بعد بالخصوص ”منٹسکیو“ کے زمانے کے بعد (منٹسکیو نے اس سلسلہ میں ایک زخیم کتاب بنام ”روح القوانين“ لکھی کہ جس میں طاقتوں کے جدا ہونے پر بہت زیادہ تاکید اور اصرار کیا ہے)، حقوقی فلاسفہ نے اس بات پر اجماع و اتفاق کر لیا کہ حکومتی طاقتوں کو جدا جدا ہونا چاہئے اور یہ نظریہ پیش کیا کہ حکومت کی تینوں طاقتیں:

۱۔ ”قوہ مقننہ“ (قانون گذار طاقت یعنی پارلیمنٹ)

۲۔ ”قوہ مجریہ“ (یعنی صدر مملکت یا وزیراعظم اور ”قوہ قضائہ“ (عدالتی طاقت) ڈیموکریٹک اور جمہوریت حکومتوں کی اصلی^(۱) ستون سمجھے جاتے ہیں، اور ان تینوں طاقتوں کے لئے الگ الگ دائرہ اور مستقل میدان تصور کیا جاتا ہے، اس طرح کہ ایک طاقت کو دوسری طاقت میں دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں، اور ہر ایک ان میں سے مستقل ہوتی ہیں، اس نظریہ میں ہر قوت کو الگ الگ کرنے کے بعد اس کی تعریف بھی کی گئی ہے، کہ جن کو ہم یہاں پر مختصر طور پر بیان کرتے ہیں:

الف۔ قوہ مقننہ:

حکومت کا ایک اہم رکن قوہ مقننہ ہے کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت تغیر و تبدیلیاں پائی جاتی ہیں اور ہر زمانہ کے شرائط مختلف ہوتے ہیں لہذا ضروری ہے کچھ لوگ ان پر تبادلہ خیال اور غور و فکر کر کے مناسب قانون وضع کرتے ہیں، اور قوہ مقننہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے بنائے گئے قوانین معتبر اور واجب الاجراء ہیں۔

ب۔ قوہ قضائہ:

قوانین کو معتبر اور رسمی ہونے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کلی قوانین کو خاص موقع و محل پر مطابقت اور لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو روشن کیا جائے۔

(۱) عام اصطلاح میں کبھی کبھی ”حکومت“ تینوں طاقتوں پر استعمال ہوتا ہے، اور کبھی کبھی حکومت صرف ”قوة مجریہ“ پر اطلاق ہوتا ہے، البتہ یہ معنی خاص موقع پر استعمال ہوتے ہیں اور اکثر اوقات حکومت سے مراد وہی عام معنی ہیں جو تینوں طاقتوں پر استعمال ہوتا ہے۔

نیز اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے قوہ قضائہ کا ہونا ضروری ہے، یعنی قانون کے بننے کے بعد شہریوں کے اختلاف کی صورت میں یا گروہوں کے درمیان اختلاف یا عوام الناس اور حکومت کے درمیان اختلاف کو حل کرنے اور لوگوں کے حقوق کو پامال ہونے سے بچانے کے لئے اور قوانین کو مذکورہ موقع و محل پر مطابقت، قضاوت اور فیصلہ کرنے کے لئے قوہ قضائہ کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ صرف پارلیمنٹ میں قوانین پاس ہونے سے مشکل حل نہیں ہوتی، کیونکہ اختلافی صورت میں ہر ایک شخص اپنے کو حق سمجھتا ہے اور اپنے حق میں قانون کی تفسیر کرتا ہے۔

ج۔ قوہ مجریہ:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاشرہ اپنے اہداف و مقاصد تک پہنچنے کے لئے قانون کا محتاج ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تمام عوام الناس تمام قوانین کی رعایت کریں؛ کیونکہ مختلف وجہوں سے قانون کی مخالفت ہو سکتی ہے، قانون کے لئے ضرورت ہے کہ اس کے جاری ہونے کی ضمانت بھی ہو، اور یہ ضمانت اجرائی قوہ مجریہ کے ذریعہ ممکن ہے، (کہ جس کے پاس قوانین کو جاری کرنے کے لئے باندازہ کافی وسائل ہوتے ہیں)، لہذا قوہ مجریہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرائے اور خلاف ورزی سے روکے، اور اسی طرح قوہ قضائہ کے احکامات (سزا و کیفر) کو بھی جاری کرے، اور اس سلسلہ میں قوانین کو جاری کرنے اور خلاف ورزی کرنے والوں اور مجرموں کو سزا دینے کے لئے پولیس وغیرہ کا بھی سہارا لیا جاسکتا ہے۔

ہم نے مختصر طور پر جمہوریتی نظام میں تینوں طاقتوں کے جدا ہونے کے نظریہ کو بیان کیا، اگرچہ ہم اس سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کو بیان کرنے کے درپے نہیں ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی جمہوری ایران کے اساسی اور بنیادی قانون میں ان طاقتوں کو جدا ہونے کے نظریہ کو قبول کیا گیا ہے، لیکن یہ تینوں طاقتیں ولایت فقیہ کی زیر نظر ہوتی ہیں جس کی وجہ سے نظام اسلامی ہو جاتا ہے، چاہے اسلامی نظام میں تینوں طاقتوں کی مشروعیت اس چیز کی وجہ سے ہے کہ یہ سب کے سب الہی اور اسلامی ڈھانچہ رکھتے ہوں اور ان کا رابطہ خداوند عالم سے ہوں اور ولایت فقیہ کی وجہ سے ہی نظام الہی ہو جاتا ہے اور نظام کی مشروعیت کا ملاک و معیار بھی یہی ولایت فقیہ ہے۔

جس وقت ہم اسلام کے قوانین کی وضع اور ان کو جاری کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تمام قوانین اور مقررات الہی اور اسلامی ہونا چاہئے، تو ہم اس بات کو مسلم اور طے شدہ مان لیتے ہیں کہ اسلام کا خلاصہ نماز و روزہ اور دوسری عبادتوں میں نہیں ہوتا؛ بلکہ اسلام ایک کامل مجموعہ کا نام ہے کہ جس میں اجتماعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں۔

یعنی اجتماعی قوانین کے تمام شعبے اسلام میں شامل ہوتے ہیں، جیسے مالی مسائل، حقوق مدنی، تجارتی حقوق اور بین الاقوامی حقوق وغیرہ کہ جن کی معاشرہ کو ضرورت ہوتی ہے، لہذا ہم یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اسلام کے قوانین اجتماعی قوانین ہیں اور اسلام حکومت کو بھی ذمہ دار بناتا ہے کہ اس کے قوانین کو معتبر جانے اور ان کو عملی جامہ پہنائے، اور اگر کوئی حکومت اسلام کے قوانین کو معتبر نہ جانے اور ان کو جاری کرانے کی فکر میں نہ رہے، تو اسلام کی نظر میں اس حکومت کا کوئی اعتبار اور مشروعیت نہیں ہے۔

۳- اسلام معاشرہ کو ادارہ نہیں کر سکتا (ایک شبہ)

یہاں پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ آج کل انسان کی زندگی ترقی یافتہ دور میں بڑے پیمانے پر نئے نئے قوانین کا نیاز مند ہے اور ان سب کا جواب قرآن کریم یا سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کلام ائمہ معصومین علیہم السلام میں نہیں پایا جاتا، آج انسان کو اس طرح کے قوانین کی ضرورت ہے کہ جو صدر اسلام میں بالکل بھی موجود نہیں تھے تو ان کا حکم ہی کہاں سے بیان ہوا ہوگا، مثال کے طور پر فضائی اور ہوائی لائن کے مسائل کو پیش نظر رکھیں کہ کیا کوئی ہوائی جہاز کسی دوسرے ملک کی فضا میں بغیر اس ملک کی اجازت کے گذر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کے قوانین قرآن یا حدیث رسول یا کلام ائمہ معصومین علیہم السلام میں نہیں ہیں کیونکہ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا تصور ہی نہیں تھا تا کہ یہ مسئلہ پیش آتا کہ ہوائی جہاز دوسرے ملک کی فضا سے گذر سکتا ہے یا نہیں۔

اسی طرح ٹرافک اور ڈرائیورنگ کے مسائل، اس وقت میں بس یا گاڑی کا وجود ہی نہیں تھا کہ اس کے قوانین بیان ہوتے، اسی طرح دوسرے قوانین کہ جن کی انسان کو اس وقت ضرورت ہے مثلاً دریا اور سواحل کے قوانین، اور اس طرح کے دوسرے قوانین کہ جن کے بارے میں ابھی تک خاص قوانین نہیں بنائے گئے اور ضرورت ہے اس بات کی کہ حقوق داں اور قانون گزار حضرات اس سلسلہ میں بڑے غور و فکر سے ان کے لئے قوانین بنائیں۔

لہذا ان چیزوں کے پیش نظر قرآن اور حدیث میں ذکر کئے گئے قوانین انسان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے، تو پھر کس طرح یہ کھا جاسکتا ہے کہ معاشرہ میں اسلامی قوانین نافذ ہونا چاہئے جبکہ بعض چیزوں کے بارے میں اسلام کوئی قانون ہی نہیں رکھتا،!

لہذا انسان کے لئے ایسے قوانین کی واضح ضرورت ایک طرف، اور اسلام میں ایسے قوانین موجود نہ ہونا دوسری طرف، تو اس موقع پر کیا کیا جائے؟ اور ایسے موقع پر ہم کس طرح اسلامی قوانین پر پابند ہوں؟ اب تک جو ذکر ہوا یہ ان لوگوں کا نظریہ تھا جو

اسلام کو نہیں مانتے اور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین معاشرہ کو چلانے کے لئے کافی نہیں ہیں؛ اور ان کی جگہ بشریت کے بنائے ہوئے قوانین کی طرف رجوع کیا جائے، اعتراض کرنے والوں نے موضوع مشکل اور پیچیدہ کرنے کے لئے اس اعتراض کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اور لوگوں نے اپنے مختلف خواہشات کی بنا پر اس سلسلہ میں مختلف بیان دیا ہے۔

لیکن ان سب کا ہدف اور مقصد اسلامی حکومت کو کمزور اور متزلزل کرنے کے لئے ہے کہ اسلام معاشرہ کو ادارہ نہیں کر سکتا، لہذا اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کی باتیں کرنا اور ان پر اصرار اور تاکید کرنا بے فائدہ ہے، لہذا حکومت کو اسلامی ہونے کے نظریہ کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے کیونکہ یہ کام ہونے والا نہیں ہے، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض اسلامی انقلاب کے طرفدار اور اسلام کے معتقد افراد بھی اس شبہ کے تحت تاثیر واقع ہوتے جا رہے ہیں، لہذا ضروری ہے کہ اس اعتراض کا مناسب اور محکم جواب دیا جائے تاکہ اسلام کے قوانین پر پابند رہیں اور جن مسائل میں معاشرہ کی ضرورت کے تحت اسلام میں قوانین کو نہ پائے تو اس کے راہ حل کو پہچان لیں۔

۳۔ قوانین کی مختلف اقسام اور متغیر قوانین ہونے کی ضرورت

مذکورہ اعتراض کے جواب میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ”قانون“ کے ایک وسیع اور عام معنی ہیں اور ”تکوینی“ قوانین بھی اس میں شامل ہوتے ہیں؛ مثلاً فیزک اور شیمی کے قوانین اور قانون لاوازہ، جاذبہ نیوٹن اور نسبیت انیشٹین، اس طرح کے قوانین (کہ جو تکویناً موجود ہیں اور واقعیت بھی رکھتے ہیں) دانشمندوں کے ذریعہ کشف ہوتے ہیں اور بنائے جانے والے نہیں ہیں، اور یہ قوانین ثابت اور طبعی و واقعی چیزوں سے مربوط ہیں، اور حقوقی اور سیاسی مسائل سے ان کا کوئی ربط نہیں ہے، اسی طرح عقلی قوانین؛ مثلاً منطقی اور فلسفی قوانین اور ریتہ میٹھک کے مسائل سے ہماری بحث نہیں ہے، بلکہ ہماری بحث ان قوانین سے ہے کہ جو قابل وضع ہیں جن کو اصطلاح میں ”اعتباری قوانین“ کہا جاتا ہے، ان قوانین کا اعتبار اور ان کا جاری کرنا اس صورت میں صحیح ہے کہ کوئی معتبر مرکز ان کو وضع کرے، اور قوانین کی تین قسمیں ہیں:

الف۔ قانون اساسی

قانون اساسی (بنیادی قوانین) ان قوانین کو کہتے ہیں کہ معمولاً ثابت اور ہر ملک کی ثقافت کے اعتبار سے بنائے جاتے ہیں، یہ قوانین نسبتاً ثابت (غیر قابل تبدیل) ہوتے ہیں اور ایک طولانی مدت تک جاری رہتے ہیں، یہ روزمرہ والے قوانین نہیں ہوتے اور انہیں کو معاشرہ کو ادارہ کرنے کی اصل سمجھا جاتا ہے، یہ قوانین ثابت ہونے اور پیہم تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے کئی اور محدود ہوتے ہیں؛ اسی وجہ سے ہر ملک کے اساسی اور بنیادی قوانین چند اہم اور بنیادی اصولوں کو شامل ہوتے ہیں۔

لہذا جزئی اور وہ وقتی قوانین کہ جن کی ضرورت بھی زیادہ ہے لیکن زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، ان کو قانون اساسی میں رکھا جائے، اور قانون اساسی میں کئی قوانین اور ثابت قوانین پر ہی اکتفاء کی جائے اور اس میں جزئی قوانین کو بیان کرنے سے پرہیز کیا جائے، مگر وہ جزئی اور محدود قوانین کہ جو اہم ہیں اور ان کا ذکر ہونا ضروری ہو۔

ب۔ پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین

قوانین کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن کو پارلیمنٹ میں بنایا جاتا ہے، اگرچہ بعض مملکوں میں پارلیمنٹ کے علاوہ ”مجلس سنا“ بھی بنائی جاتی ہے یا اس کو کوئی دوسرا عنوان دیدیا جاتا ہے، اور اس کے قوانین بھی پارلیمنٹ کے قوانین کی طرح معتبر مانے جاتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی پارلیمنٹ کے علاوہ ایک ”مجلس شورای نگہبان“ ہوتی ہے کہ جو دوسرے ممالک میں مجلس سنایا قانون اساسی کورٹ کی طرح ہے جس میں کچھ فقہاء اور حقوق داں حضرات شامل ہیں، مجلس شورای نگہبان اسلامی پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین کو قانون اساسی اور قوانین شرعی سے تطبیق کرتے ہیں، اور اگر وہ قوانین قانون اساسی اور قانون شرعی سے موافق نہ ہوں تو ان کو لوٹا دیتے ہیں تاکہ ان پر نظر ثانی کی جاسکے۔

ج۔ انجمن حکومت کے بنائے گئے قوانین

ہر ملک میں پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین کے علاوہ دوسرے مرکوز کے ذریعہ بھی قوانین بنائے جاتے ہیں اور وہ بھی لازم الاجراء ہوتے ہیں، جس کا نمونہ انجمن حکومت (ھیئت دولت) کے بنائے گئے قوانین ہیں، قانون اساسی نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ حکومتی انجمن خاص موقعوں پر قانون بنائے، اسی طرح صدر مملکت بھی خاص موقعوں پر اپنے مرضی کے مطابق تصمیم گیری کرے، اور یہ حکومتی انجمن اور صدر مملکت کے بنائے گئے قوانین پارلیمنٹ میں نہیں جاتے بلکہ خود ہی قانونی اور لازم الاجراء ہوتے ہیں، اور اسی طرح وہ قانون دستاویز اور بخش نامے جو کسی وزیر کے ذریعہ بعض اداروں اور دوسرے مرکوز کو دئے جاتے ہیں، اور ان کو بھی ایک طرح کا قانون کھا جاتا ہے اور حکومت ان کو بھی جاری کرنے کی ضامن ہوتی ہے، لہذا ہمارے ملک اور اسی طرح دوسرے بعض ملکوں میں تین طریقہ کے قانون ہوتے ہیں:

۱۔ قانون اساسی۔

۲۔ پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین۔

۳۔ حکومتی انجمن یا صدر مملکت کے بنائے ہوئے قانون اور اسی طرح ان مرکوز کے قوانین جن کو قانون نے ہی اجازت دی

اور ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں کسی بھی زمانہ میں ممکن نہیں ہے کہ تمام قوانین و مقررات کو ایک جگہ اور ایک ہی زمانہ میں بنالیا جائے، چونکہ وضع شدہ قوانین اور اجرائی آئین نامے زمان و مکان کے بدلنے کے لحاظ سے ضرورت ہے کہ قانون تبدیل ہوں یا ان پر تجدید نظر ہو، مثلاً پارلیمنٹ آج کوئی قانون بناتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کل حالات بدل جائیں اور اس قانون کو بدلنے اور ان میں تجدید نظر کرنے کی ضرورت پیش آجائے، اسی طرح اجرائی مقررات اور قوانین بھی حالات کے لحاظ سے قابل تبدیل ہیں اور ان پر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح جب کوئی حکومت بدلتی ہے تو ایک محدود دائرے میں رہ کر کچھ قوانین کو بدل سکتی ہے، البتہ وہ لوگ جو معاشرہ کی بھبودی چاہتے ہیں ان کی ہمیشہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ قوانین کو اس طرح دقت اور غور و فکر کرنے کے بعد بنایا جائے کہ معاشرہ کے لئے بہت مناسب ہوں اور اس میں کم سے کم خامیاں ہوں، ظاہر ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قوانین کو اسلامی ہونا چاہئے تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ تمام قوانین چاہے قانون اساسی ہوں یا پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین، سب کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

۵۔ قوانین کا اسلامی ہونے کا مطلب

قوانین اور مقررات کے اسلامی ہونے اور ان کے معنی کی وضاحت کے بارے میں، عمومی قوانین کے اوپر نظر کرنا مفید ہے، نمونہ کے طور پر قوہ مجریہ یا پست حکومت اسی دائرے میں رہ کر قوانین کو بنا سکتی ہے کہ جن میں پارلیمنٹ نے اجازت دی ہو، یعنی ان کے دائرہ وسیع نہیں ہے، دوسرے الفاظ میں عرض کیا جائے کہ ان کے اختیارات کی حد، قانون اساسی اور قانون پارلیمنٹ معین و محدود کرتے ہیں، اور اجرائی قوانین بھی اسی کے تحت ہونا چاہئے، یعنی یہ قانون ان کئی احکامات کے مصادیق ہیں کہ جو قانون اساسی اور پارلیمنٹ کے قانون میں پاس ہو چکے ہیں، لہذا یہ قانون پہلے قانون اساسی اور قانون پارلیمنٹ میں بیان ہوتے ہیں، اس کے بعد پست حکومت یا دوسرے صاحب منصب حضرات خاص موارد میں ان کلیات کے مصادیق کو قانون کی شکل میں تنظیم کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ قانون صرف ان کے دل خواہ نہیں ہوتے بلکہ قانون اساسی اور قانون پارلیمنٹ کے موافق ہوتے ہیں، اور پارلیمنٹ کے قانون بھی شوریٰ نگہبان کے تائید شدہ ہونے چاہئے اور اسی صورت میں یہ قانون معتبر ہوتے ہیں اور ان کے جاری ہونے کی ضمانت ہوتی ہے، لہذا ان قوانین کا معتبر ہونا اور لازم الاجراء ہونا اس چیز پر موقوف ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے قوانین کے موافق ہوں، اور پارلیمنٹ کے قوانین کے معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ قانون اساسی کے موافق ہوں، اور قانون اساسی کے معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کے تشریعی ارادہ کے تابع ہوں، اس ترتیب کے لحاظ سے یہ قوانین ایک

دوسرے کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے معتبر ہونے میں اس طرح کا لحاظ ضروری ہے کہ یہ تمام قوانین، اسلام اور خداوند عالم کے تشریحی ارادہ پر ختم ہوتے ہوں؛ نہ یہ کہ تمام قوانین اور مقررات اور آئین نامے اور پارلیمنٹ کے قوانین سب کے سب قرآن مجید اور احادیث شریف میں موجود ہوں۔

اگر خداوند عالم نے پیغمبر اکرم (ص) کو اتنا اختیار عنایت کیا کہ خاص موارد میں خاص قانون بنا سکتے ہیں، اور چونکہ اس قانون میں خداوند عالم کی اجازت اور اس کا ارادہ شامل ہے، معتبر اور لازم الما ہے، رسول اکرم (ص) کی اطاعت اور ان کی پیروی خداوند عالم کے حکم سے واجب ہے اور اسی حکم خدا کے زیر سایہ پیغمبر اکرم کا بنایا ہوا قانون بھی معتبر ہے، اور ہم مسلمانوں پر ان کی اطاعت اور پیروی واجب ہے؛ ورنہ اگر ہم خدا کے حکم سے صرف نظر کر لیں تو پیغمبر کے دستورات خود بخود واجب نہیں رہ جاتے۔

لہذا وہ قوانین جو براہ راست خداوند عالم کی طرف سے ہوں اور قرآن مجید میں صاف صاف بیان ہوئے ہوں پہلا درجہ رکھتے ہیں اور خود بخود معتبر ہیں، اس کے بعد خدا کے حکم سے رسول اکرم کے بنائے ہوئے قوانین دوسرے درجہ میں قرار پاتے ہیں، اور آپ کے بنائے ہوئے قوانین خدا کے حکم کی وجہ سے معتبر ہیں، اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کے بنائے ہوئے قوانین اور احکامات خدا کے حکم کی وجہ سے معتبر ہیں؛ کیونکہ خدا اور پیغمبر نے ائمہ (ع) کی اطاعت کو واجب کیا ہے۔

اب اگر ہم اپنے کو حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے زمانہ میں کسی اسلامی منطقہ میں فرض کریں بے شک آپ کی اطاعت کو اپنے اوپر واجب جانتے، مثلاً آپ مالک اشتر کو اس شہر کا والی بنا کر بھیجتے اور یہ فرماتے کہ ان کے احکامات اور دستورات کے اوپر عمل کریں اور ان کی نافرمانی نہ کریں اور جس نے ان کی اطاعت کی میری اطاعت کی؛ اگرچہ مالک اشتر کے احکامات کا بذات خود کوئی اعتبار نہیں ہے اور وہ بھی دوسروں کی طرح ہوتے، لیکن چونکہ امام کا حکم ہوا ہے لہذا اس صورت میں ان کی طاعت واجب اور ان کے احکامات لازم الما ہے، کیونکہ یہ امام معصوم کی طرف سے مقام ولایت پر فائز ہیں اور خدا اور پیغمبر کی طرف سے منصوب ہوئے ہیں لہذا ان کی اطاعت واجب مانی جاتی ہے، جب کہ امام معصوم کی طرف سے منصوب شدہ والی اور حاکم کے دستور اور فرمان تیسرے درجہ میں حساب ہوتے ہیں، مثال کے طور پر اگر اسلامی پارلیمنٹ نے کسی صاحب منصب کو یہ اختیار دیدے کہ وہ کسی چیز کے بارے میں کوئی دستور العمل بنائے، اور چونکہ اس کے اس کام کا اختیار دیا گیا ہے لہذا اس کے بنائے ہوئے قوانین لازم الما ہے، اسی طرح قوانین پارلیمنٹ بھی قانون اساسی کی وجہ سے معتبر ہے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین قانون اساسی کی وجہ سے معتبر ہوتے ہیں۔

لیکن دوسرے ممالک میں قانون اساسی کا اعتبار لوگوں کے ووٹ اور رائے گیری پر ہوتا ہے، لیکن ہم قانون اساسی کا مقام اس سے بڑھ کر بلند مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قانون اساسی کا اعتبار خدا کی اجازت پر منحصر ہوتا ہو کہ پیغمبر یا امام معصوم یا کوئی

شخص مالک اشتر کی طرح اس قانون اساسی کی تائید کرے، اس وجہ سے قانون کا اعتبار خدا، رسول اور ائمہ علیہم السلام کے کلام کی وجہ سے ہے اور اس کے بعد اس شخص کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جو امام معصوم کی طرف سے معین ہو، اور بھی اسلام کا فلسفہ اور تھیوری ہے، امام معصوم (ع) کی غیبت کے زمانہ میں چونکہ ولی فقیہ عمومی اعتبار سے امام علیہ السلام کی طرف سے منصوب ہے تو اس کی ولایت امام معصوم (ع) کی طرف سے تائید شدہ اور معتبر ہے، اور ولی فقیہ کی تائید سے قانون اساسی معتبر ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ قانون اساسی بذات خود معتبر نہ ہوگا، اور اس پر سوالیہ نشان باقی ہے کہ اس کا اعتبار کہاں سے ہے اور کس حد تک یہ معتبر ہے، اور کن لوگوں کو حق ہے کہ وہ قانون اساسی کو بدل سکیں، وہ قویں جو اقلیت میں ہیں اور انھوں نے قانون اساسی کے بارے میں ووٹ نہیں دیا ہے کس وجہ سے یہ لوگ اس قانون اساسی کی پیروی کریں اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات، لیکن اگر ہمارا نظریہ یہ ہو کہ قانون اس صورت میں معتبر ہوگا جب امام معصوم کی طرف سے معین شدہ شخص اس کی تائید کر دے، تو پھر کسی سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۶۔ اسلامی حکومت میں قانون گذاری کا مسئلہ

اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قانون گذاری کے سلسلہ میں اسلامی حکومت کی تھیوری، یہ ہے کہ قانون کا اعتبار خداوند عالم کی طرف سے ہے اور اس کے بعد جس کو خداوند عالم یہ اجازت دیدے، مثلاً پیغمبر اسلام تو پھر ان کا کلام بھی معتبر ہے اور اسی طرح پیغمبر جس کو منصوب کر دیں ہمارے لئے معتبر ہیں جیسے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کو منصوب فرمایا لہذا ان کا کلام ہمارے لئے معتبر ہوا، اور اسی طرح اگر امام معصوم کسی کو عمومی یا خصوصی طور پر منصوب کر دیں تو اس کا کلام بھی ہمارے لئے معتبر ہے، وہ فرمان اور احکامات کہ جو درجات عالیہ سے صادر ہوتے ہیں الہی اور اسلامی ہیں کیونکہ خداوند عالم کی طرف سے تائید شدہ ہیں، البتہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ اسلامی حکومت میں کبھی کبھی یہ تائید چند واسطوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے، ولی فقیہ کے لئے امام معصوم کی تائید ہوتی ہے اور امام معصوم علیہ السلام کے ارادہ و اختیار کی تائید پیغمبر اکرم کی تائید سے ہوتی ہے اور آخر میں پیغمبر اکرم ہیں کہ جن کا اعتبار قرآن کریم کے صاف صاف بیان سے ہوتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا طِيعُوا اللَّهَ وَطِيعُوا الرَّسُولَ وَطِيعُوا أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾^(۱)

”اے ایماندارو خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے اولی الامر ہو ان کی اطاعت کرو“

اسی طرح یہ آیت بھی:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾^(۲)

”نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں“

بے شک مذکورہ رابطہ اسلام کے وضع شدہ اصول کے اعتبار سے ان لوگوں کے لئے مکمل طور پر قابل قبول ہے کہ جو خدا، پیغمبر اور امام معصوم کا اعتقاد رکھتے ہوں، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہم اس مسئلہ کو سادہ زبان میں ان لوگوں کے لئے بیان کریں کہ جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ ہی رسول خدا کو، اور امام معصوم کی حقانیت میں شک کرتے ہوں، ان کے لئے ایک دوسرے طریقہ سے بحث ہونا چاہئے: سب سے پہلے اسلام کے بنیادی اصول کو بیان کریں اور اس کے بعد دوسرے مسائل کے بارے میں بحث کریں جیسے حکومت و سیاست کے مسائل، البتہ ممکن ہے کہ اس بحث کو آزاد طریقہ سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی قانون گذاری بہت ر اور معاشرہ کے لئے مفید تر ہو سکتی ہے یا قانون گذاری کے دوسرے طریقے کہ جو رائج ہیں۔

۱۔ اسلامی حکومت میں قانون کے جاری کرنے والوں کو منصوب کرنا

اسلام کی سیاسی تھیوری میں قانون کو خدا کی طرف سے ہونے کے ساتھ ساتھ، ولایت کے زیر نظر قوانین اور مقررات اگر خدا، رسول خدا، امام معصوم اور ان کے خاص یا عام جانشینوں کی تائید حاصل ہو تو وہ قوانین معتبر ہو جاتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ قوانین کا اجراء کرنے والا بھی خداوند عالم کی طرف سے معین ہو، (البتہ قوہ قضائی بھی قوہ مجریہ سے مربوط ہوتی ہے، لیکن اس کی خاص اہمیت کی خاطر اور اس وجہ سے کہ اختلاف وغیرہ کو حل کرنے کا ایک بہت رین مرکز شمار ہو، اور قوانین کو جاری کرنے سے پہلے ان کے مصادیق پر منطبق کرے، اس کے لئے مستقل مقام اور خاص شرائط معین کئے گئے ہیں)

جس وقت پیغمبر یا امام معصوم حاضر ہوں تو وہ خود قانون کے جاری کرنے کے ذمہ دار ہیں یا یہ حضرات کسی کو اپنی طرف سے منصوب کریں کہ قانون کو جاری کرنے کا ذمہ دار ہو؛ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے جناب مالک اشتر کو مصر کا والی و حاکم منصوب کیا تاکہ وہاں جا کر قوانین کا نفاذ کرے، لیکن امام علیہ السلام کی غیبت میں کہ جب عوام الناس امام تک نہیں پہنچ سکتی، قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس شخص کی ہے کہ جس کو امام نے بطور عام منصوب کیا ہو، اور یہ وہی ولایت فقیہ ہے کہ ہم جس کے بارے میں بعد میں گفتگو کریں گے، (انشاء اللہ)

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام کی سیاسی تھیوری اور اسلام کے حکومتی ڈھانچے میں جس طرح قانون کو خدا کی طرف سے ہونا چاہئے (یعنی قانون یا قرآن مجید میں موجود ہو یا احادیث پیغمبر میں موجود ہو کہ جس کا اعتبار بھی خدا کی طرف سے ہے یا امام معصوم کی طرف سے کہ جن کا اعتبار پیغمبر اکرم کی وجہ سے ہے، یا اس شخص کی طرف سے ہو کہ جس کو خدا یا رسول یا امام نے قانون گذاری کی اجازت دی ہو،) یعنی اسی طرح قانون کا نفاذ کرنے والا بھی خداوند عالم کی طرف منسوب ہو، اور وہ خداوند عالم کی طرف سے خاص یا عام طور پر معین کیا گیا ہو۔

اسی طرح قوہ قضائہ بھی خداوند عالم کی طرف منسوب ہو یعنی قاضی یا تو براہ راست خداوند عالم کی طرف سے معین ہو یا غیر مستقیم طور پر معین ہو، اور اگر قاضی کسی بھی طرح خداوند عالم سے نسبت نہ رکھتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔
قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کو براہ راست قضاوت کے لئے منسوب کرنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (۳)

” (ہم نے فرمایا) اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر (اپنا) نائب قرار دیا تو تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو“
پیغمبر اکرم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَتَحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ﴾ (۴)

”جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو“
اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (۵)

”پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم اس وقت تک یہ لوگ سچے مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں“
نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی سیاسی تھیوری، حکومت، سیاست اور معاشرہ کی مدیریت اور تمام کئے تمام امور خداوند عالم کے تشریعی ارادہ پر ختم ہوتے ہوں۔

حوالہ

۱۔ سورہ نساء آیت ۵۹۔

۲۔ سورہ احزاب آیت ۶۔

۳۔ سورہ ص آیت ۲۶۔

۴۔ سورہ نساء آیت ۱۰۵۔

۵۔ سورہ نساء آیت ۶۵۔

نواں جلسہ

دینی نظام میں قوانین کا مقام

۱- اسلام کے سیاسی نظریہ کے اصول

اس بات کا خیال رہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ اور فلسفہ کی بحث سے متعلق اصول موجود ہیں، بعض افراد ان سب کو قبول کرتے ہیں اور کچھ لوگ صرف بعض کو قبول کرتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو ان میں سے کسی کو قبول نہیں کرتے ہیں، لیکن اس نظریہ کو ثابت اور بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اصول کو بیان کیا جائے اور اس اعتبار سے کہ ان میں سے کچھ اصول بہت واضح ہیں لہذا صرف اس کے اشارہ اور مختصر توضیح پر اکتفا کی جائے گی، اور واضح بحثوں کے ذکر سے اجتناب کیا جائے گا کیونکہ واضح اور روشن بحثوں کو کسی بھی علم میں بیان نہیں کیا جاتا، اور زیادہ تر اصولی بحث کی جائے گی تاکہ بحث کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

الف- قانون

ہماری بحث کے عناوین اور اصول میں بیان ہوا ہے کہ معاشرہ، قانون کا محتاج ہے جیسا کہ یہ بات بیان کی جا چکی ہے، اسلام کے سیاسی نظریہ کی دوسری اصل یہ ہے کہ قانون کو خدا کی طرف سے ہونا چاہیئے اور جیسا کہ یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اس کا نفاذ بھی خدا ہی کی طرف سے ہونا چاہیئے، قانون الہی سے مراد یہ ہے کہ یا خود خدا نے قانون بنایا ہو اور اس کو قرآن میں نازل کیا ہو یا پیغمبر اکرم اور معصوم (ع) اماموں کو قانون بنانے کی اجازت ملی ہو، تاکہ مختلف حالات میں اسی کے اعتبار سے قانون بنائیں، اسی بنا پر قانون کی تین قسمیں ہیں:

۱- وہ قانون جس کو خدا نے بنایا ہے اور پیغمبر اور امام (ع) اس کے بنانے میں شریک نہیں ہیں۔

۲- وہ قانون جس کو معصوم (ع) نے خدا کی اجازت سے بنایا ہے۔

۳- وہ متغیر قوانین جن کو کچھ افراد معصوم (ع) کی اجازت سے بناتے ہیں، یہ قوانین اسلامی معاشرے کے لئے معتبر قرار دئے گئے ہیں، اس لئے کہ آخر کار ان کی بازگشت حکم خدا اور اس کی اجازت کی طرف ہوتی ہے، اس بنا پر خداوند عالم خود قانون کو بناتا ہے اور خدا کے قوانین قرآن میں ذکر ہوئے ہیں لیکن قانون کا نفاذ کرنے والا خدا نہیں ہے قانون کا نفاذ کرنے والا ایسا شخص ہونا چاہیئے جو معاشرے میں موجود ہو اور لوگ اس کو دیکھتے ہوں، وہ لوگوں کو امر و نہی کرے اور قوانین کو نفاذ کرے، پہلے مرتبہ میں پیغمبر اور امام معصوم (ع) ہیں اور دوسرے مرتبہ میں وہ افراد ہیں جن کو پیغمبر یا امام معصوم (ع) کی طرف سے نفاذ قانون کی اجازت ملی ہو، اس بنا پر

کچھ حضرات پیغمبر اکرم یا امام معصوم (ع) کے زمانے میں اسلامی علاقوں اور صوبوں کے والی اور کارندہ کے عنوان سے اجراء قوانین کے لئے بھیجے جاتے تھے اور غیبت امام (ع) میں اس کام کے ذمہ دار فقہاء اور مراجع کرام ہیں جو بطور عام نصب ہوئے ہیں، اور قوانین کے اجراء کے ذمہ دار ہیں۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا اس حکومت کے کلیات تھے کہ جس کے دو حصہ تھے قانون گذاری اور قوانین کا نفاذ، اور جیسا کہ عدالت کا محکمہ در حقیقت اجرائی محکمہ کا ایک جزو ہے، انشائاً،،، ہم اس کی اہمیت کی خاطر الگ سے بحث کریں گے۔

۲۔ طبعی اور بنائے گئے قوانین کی اہمیت

یہ بات بیان جا چکی ہے کہ ہماری بحث کے اصول اور مسلمات میں سے ایک اصل یہ ہے کہ معاشرہ کیلئے قانون کا ہونا ضروری ہے، اور دوسری اصل یہ ہے کہ ہماری نظر میں ایسا قانون معتبر ہے جس کا بنانے والا بلا واسطہ یا بالواسطہ خدا ہو، اس نظریہ کے مقابلہ میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے یہ کھا ہے کہ معاشرہ قانون کا نیاز مند نہیں ہے خواہ وہ قانون خدا بنائے، خواہ دوسرے افراد، البتہ اس موجودہ دور میں اس نظریہ کے طرفدار موجود نہیں ہیں، کیونکہ جن حالات میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں سب قانون کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو معاشرہ کے لئے قانون کی ضرورت کا منکر ہو، اس دور میں یہاں تک کہ ایک مختصر سے دیہات کے رہنے والے بھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ ایسے قوانین اور دستورات ہونے چاہئیں کہ جنکی وہ پیروی کریں۔

لیکن گزشتہ زمانے میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ بہت سادہ تھا کچھ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ ہمیں قوانین بنانے کی ضرورت کوئی ضرورت نہیں ہے، ان کی نگاہ میں عقل خود بخود فطری قوانین کو پہچان کر ایک طرح کے فطری قوانین سے آگاہ ہو جاتی ہے اور پھر اسے اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ کوئی قانون بنائے گویا قدیم زمانہ میں فطری حقوق اور فطری قوانین کا نظریہ انسانی معاشرہ میں اس شکل میں بیان ہوا کہ جب لوگ یہ کھا کرتے تھے کہ کس قانون پر عمل کریں؟ تو جواب دیا جاتا تھا کہ اپنے اندر نگاہ کرو یا اس دنیا پر نظر ڈالو تاکہ تمہیں پتہ چلے کہ کون سا حکم اور قانون وہاں پر حکم فرما ہے وہی قانون اپنے معاشرے میں نافذ ہوگا۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہاں تک کہ فطری قانون کے نظریہ کی بنا پر بھی قانون کی ضرورت ایک مسلم بات ہے اور یقینی طور پر اس طولانی تاریخ میں ایسے مفکرین کا وجود نہیں ملتا جو یہ دعویٰ کریں کہ انسان کسی طرح کے قانون کا یہاں تک کہ قانون فطری کا بھی محتاج نہیں ہے اور اس سلسلے فلسفی حضرات کے یہاں جو بھی بحث پائی جاتی ہیں وہ اس بنا پر رہی ہیں کہ کیا قوانین عقلی، فطری اور قوانین الہی سے مراد وہی قوانین ہیں جن کو تمام انسان اپنی عقل سے درک کرتے ہیں اور وہی معاشرے کے لئے کافی ہیں یا خاص طور پر جو قوانین بنائے گئے ہیں اس کے بھی ہم محتاج ہیں، اور جیسا کہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اگر گزشتہ زمانہ میں فطری

قوانین یا عقلی قوانین یا مستقلات عقلیہ اپنی مختلف تفسیروں اور تعبیروں کے ساتھ کہ جن کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں، تو بغیر کسی شک و تردید کے، ہمارے زمانے کے حالات کے پیش نظریہ فریضہ قابل قبول نہیں ہے، یہاں تک کہ بیان و توضیح کے لائق بھی نہیں ہے۔

آج ہر فرد اپنے گمرد و پیش مشاہدہ کمرے سے یہ سمجھ جاتا ہے کہ ہر روز اپنے دقیق اندرونی، بیرونی اور بین الاقوامی روابط میں سیکڑوں اجتماعی اور بین الاقوامی قوانین کا نیاز مند ہے انہیں میں سے ایک معاشرہ اور اندرونی ملک کے قوانین اور دستورات میں ٹریفک اور ٹریفک سے متعلق قوانین ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اس زمانے میں قانون نہ ہوں تو ہر شہر اور علاقہ کے ٹرانسپورٹ اور ٹریفک کا نظام کیا ہوگا؟ اگر گاڑیوں کی رفتار، اور ان کے چلنے کی سمت (دائیں سمت چلیں یا بائیں سمت) یا ٹریفک کے دوسرے قوانین نہ بنائے جائیں تو کتنے حادثات رونما ہوں گے؟ دنیا کے کس علاقہ میں ایسا گمروہ مل سکتا ہے جو بغیر قانون کے ایک ساتھ ایک جگہ پر زندگی گزارتے ہوں، اور ان کے درمیان خطرات اور حادثات رونما نہ ہوتے ہوں، یہ بات صحیح ہے کہ تمام ممالک میں ٹریفک کا قانون ایک جیسا نہیں ہوا کرتا ہے مثال کے طور پر کچھ ممالک جیسے انگلینڈ، جاپان وغیرہ میں گاڑیاں بائیں سمت سے چلتی ہیں اور کچھ ممالک میں (جن میں سے ایک ایران بھی ہے) گاڑیاں دائیں سمت چلتی ہیں، بہر حال قانون بنایا جاتا ہے، اور انسان اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ رہتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ کس سمت حرکت کرنا چاہیے، مذکورہ مثال معاشرہ میں قانون کی ضرورت کا ایک نمونہ ہے، اور بے شک یہ ضرورت دوسرے مسائل از جملہ خاندانی اور بین الاقوامی حقوق میں بھی پڑتی ہے اور اس کا احساس ہوتا ہے۔

بین الاقوامی قانون بنانے کی ضرورت کا ایک نمونہ دریائے خزر سے متعلق مسائل ہیں جو اب بھی اس کے حاشیہ نشین ممالک کے درمیان اس سے بھرہ مند ہونے کے طریقہ میں اختلاف نظر آتا ہے، فطری طور پر یہ قبول نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شخص جس طرح سے چاہے دریا کے نیچے موجود تیل اور منابع اور دوسری ذخائر سے فائدہ اٹھائے اور تیل، گیس اور دوسری چیزوں کے نکالنے میں کوئی قانون نہ ہو، بلکہ ایسے قوانین بنائے جانے چاہئے جو یہ معین کرے کہ فلاں ملک کس حد تک دریاء کی گھرائی، موجودہ ذخائر سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جو مشکلات اس وقت پڑوسی ممالک کے لئے کھڑی ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ کوئی معین قانون موجود نہیں ہے، اور سب دریا کے ذخائر کے بارے میں ایک عادلانہ تقسیم کے لئے قوانین اور دستورات کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں لہذا بشر کی ضرورت کے پیش نظر قوانین و دستورات کی ضرورت پڑتی ہے، اور جیسا کہ کمیٹیاں اور موافقت نامہ اور دریا اور ساحل سے متعلق قوانین (فضاء، کنوین وغیرہ) چند صدی قبل موجود نہیں تھے، کیونکہ بشر کو اس کی ضرورت نہیں تھی، پھر افراد، گروہوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان ٹکراؤ اور اختلاف کی وجہ سے اس طرح کے قوانین کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ قانون ہر شخص اور معاشرہ کے دائرہ حقوق کو معین کرتا ہے، قرآن مجید اس اصول کی طرف کہ معاشرہ ہی زندگی قانون کی محتاج ہے خاص توجہ دلائی ہے، البتہ شایان ذکر ہے کہ قانون کا وجود عام طور پر سماجی زندگی سے مخصوص ہے بلکہ اگر ایک فرد بھی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو وہ کمال تک پہنچنے میں قانون کا محتاج ہے، البتہ فردی زندگی کے لئے اخلاقی قوانین، کافی ہوتے ہیں لیکن جس وقت اجتماعی مسائل میں لوگوں کے حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے تو نتیجہ میں اختلافات وجود میں آتے ہیں اور کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کسی نے حد سے زیادہ نھر کے پانی سے فائدہ اٹھالیا تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت میں اجتماعی قوانین بنانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

لہذا، یہ بات بالکل واضح اور روشن ہے کہ معاشرہ قانون کا محتاج ہے، اور ہر عقل مند انسان یہ جانتا ہے کہ بغیر قانون کے اجتماعی زندگی، انسان کا آرام و سکون اور اس سے بڑھ کر معنوی سعادت خطرے میں پڑ جاتی ہے، جو مثالیں ہم نے عرض کی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح کے مقامات کے لئے کافی نہیں ہیں، اور ہم قوانین کے محتاج ہیں اس لئے کہ عقل، عدل و انصاف کا حکم دیتی ہے، لیکن ایسی حکمت عملی اپنانے کے لئے جو عدل و انصاف قائم کرے ایک دوسرے قانون کے محتاج ہیں مثال کے طور پر عقل یہ حکم دیتی ہے کہ دریائے خزر کے ذخائر کو پڑوسی ممالک میں عادلانہ طور پر تقسیم ہونا چاہیئے، تو اس وقت یہ مسئلہ پیش آئے گا کہ عادلانہ تقسیم کسے کہتے ہیں؟ کیا عادلانہ تقسیم اس کو کہتے ہیں کہ جس ملک کا رقبہ زیادہ ہو وہ ذخائر سے زیادہ فائدہ اٹھائے، یا جس ملک کے پاس دریا کا ساحلی حصہ زیادہ ہو یا ساحل نشین کی تعداد زیادہ ہو وہ دریا سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ قانون ساز کے مرکز کو اس طرح کے سوالات کا جواب دینا چاہیئے، اسکے علاوہ دوسرے تمام مقامات کے لئے بھی قانون ساز کا ہونا ضروری ہے، دیکھنا یہ ہے کہ قانون ساز کون ہو؟

ب۔ قوانین کا مرضی الہی اور دین کے مطابق ہونا ضروری ہے

اسلام کا دعویٰ ہے کہ قوانین کو خدا نے بنایا اور پیغمبر اکرم کے ذریعہ لوگوں پر نازل کیا ہے لہذا پہلی اصل کو قبول کرنے کے بعد قانون کی ضرورت ہے دوسری اصل یہ ہے کہ دین کو قانون ساز کے مرکز کے عنوان سے قبول کریں، اس مرحلہ میں اسلامی حکومت میں ایسے لوگوں کا ہونا ممکن ہے جو دین کو نہ مانتے ہوں چہ جائیکہ ایک شخص غیر اسلامی حکومت میں دین کو قبول کرتا ہو، اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے خدا کے وجود میں شک ہے لہذا میں دین اور اس کے قوانین کو قبول نہیں کرتا ہوں تو پہلے مرحلہ میں آپ اس کے لئے یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ قانون خدا کو بنانا چاہیئے، اور بنیادی طور پر جو شخص خدا کو نہیں مانتا ہے وہ قانون الہی کو بھی نہیں مانتا ہے، پہلے فلسفی اور کلامی بحثوں سے خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا، پھر کلامی اعتبار سے یہ بات ثابت کرنی ہوگی کہ پیغمبر اور دین کا بھی وجود

بعد کے مراحل میں یہ بات بیان کی جائے گی کہ وہ قانون معتبر ہے جس کو خدا نے خود بنایا ہو یا خدا کے کسی وسیلہ کے ذریعہ بنا ہو، اس سے پہلے ہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ممکن ہے کوئی خدا، دین اور نبوت کو قبول کرتا ہو لیکن وہ اس بات کا معتقد نہ ہو کہ سماجی قانون خدا کو بنانا چاہیئے، اس کی نظر میں انسان کو خدا کی حمد و ثنا، عبادت اور اس سے راز نیاز کرنا چاہیئے مسجدوں اور عبادت گاہوں میں آمد و رفت رکھنا چاہیئے، لیکن انسان کی سماجی زندگی خدا سے متعلق نہیں کہ جس کے لئے خدا قانون بنائے، اس سے قبل کی بحثوں میں ہم نے عرض کیا تھا کہ اس طرح کا نظریہ اسلام کی رو سے صحیح نہیں ہے دین اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی یہ کہے کہ اصل دین یعنی قرآن، احادیث پیغمبر اسلام، متواتر روایات اور پیغمبر و ائمہ علیہم السلام کی سیرت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلام کے سماجی قوانین سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے؟

۳- دین کی ضروری باتوں کو قبول کرنا لازمی ہے

افکار و عقائد کے مجموعہ میں کچھ ثابت اور یقینی اجزاء ہوتے ہیں جن کو اصطلاح میں - ضروریات کہا جاتا ہے اور جو شخص بھی اس مجموعہ سے واقف ہے چاہے اس کو مانے یا نہ مانے، یہ جانتا ہے کہ وہ مجموعہ ان ثابت اجزاء پر مشتمل ہے دوسرے لفظوں میں ممکن ہے ہر مجموعہ کے سیکڑوں ممبر ہوں، لیکن اس کا ایک معیار ہونا چاہیئے، تاکہ وہ دوسرے مجموعوں سے الگ ہو سکے، اس بنا پر اگر کسی نے دین کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے قبول کیا ہے تو اسے یہ قبول کرنا ہوگا، کہ یہ مجموعہ مستقل، دائمی اور یقینی ممبر رکھتا ہے تاکہ تمام مجموعہ سے الگ پہچانا جائے، لیکن افسوس! کچھ افراد کہتے ہیں کہ ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اسلام ثابت اصول رکھتا ہے اور تمام اشیاء کو مختلف تفسیروں اور مختلف تعبیروں کے قابل جانتا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اسلام کے مخالف نہیں ہیں لیکن اسلام قبول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب نماز پڑھیں، وہ نماز کا عقیدہ رکھیں اور بعض افراد پڑھنے کے بھی عادی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص مسلمان ہے وہ ضرور نماز پڑھے اور نماز کو اسلام کے ثابت ارکان سمجھے!

روزہ کے سلسلے میں اور اسی طرح دوسرے تمام اجتماعی احکام کے بارے میں معتقد ہیں کہ پیغمبر اکرم، ائمہ معصومین علیہم السلام اور تمام مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اسلام کا دار و مدار اسی روزہ ہی پر ہے، اگر یہ نہ ہوں تو اسلام باقی نہیں رہے گا، یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کن بنیادوں پر قائم ہے کہ وہ اگر نہ ہوں تو اسلام باقی نہیں رہے گا؟ کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں توحید ایک اصل ہے کہ اگر کوئی اس کو قبول نہ کرے تو مسلمان نہیں ہے؟

تو آپ جواب میں کیا کہتے ہیں کہ ہماری فہم کے مطابق اسلام سے یہ مفہوم سمجھنا صحیح ہے ممکن ہے کہ دوسرا شخص اسلام سے ایک دوسرا مفہوم سمجھتا ہو، لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام سے صرف ہمارا سمجھنا صحیح ہے ممکن ہے دوسرا شخص اسلام سے یہ

سمجھے کہ خدا ایک ہے یا چند خدا ہیں یا دین اسلام میں خدا کا وجود بالکل ہے نہیں، - اور ہم ایسی دلیل پیش نہیں کرتے جو یہ ثابت کرے کہ ہم جو اسلام سمجھے ہیں وہ سب سے زیادہ صحیح ہے! اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور کسی کو دوسری تفسیر کرنے کا حق نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سمجھ ہماری نظر میں بہت رہے تو ایسا دوسرے کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

بے شک ایسے افراد صرف دھوکہ بازی اور چال بازی کا قصہ رکھتے ہیں ورنہ کسی علم اور علمی مرکز میں دو مجموعہ کہ جن کے ممبران آپس میں شریک ہیں ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے دو مجموعوں کو ایک دوسرے سے اس وقت جدا کیا جاسکتا ہے جب ان دونوں کے ممبران مختلف ہوں یا کم سے کم ان میں سے کچھ کے درمیان فرق موجود ہو ورنہ دونوں مجموعے میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکے گا، ہمیشہ دو قسم کے مجموعہ میں فرق ہونا چاہئے تاکہ ایک مجموعہ کو دوسرے سے جدا کیا جاسکے، اگر ان میں سے ایک مجموعہ کے تمام ممبران دوسرے مجموعہ کی جگہ قائم مقام ہو سکتے ہوں، مثلاً اس مجموعہ کا (الف) ممبر دوسرے مجموعہ کے (الف) ممبر کی جگہ آئے اور اسی طرح اس مجموعہ کا (ب) کا ممبر دوسرے مجموعہ کے (ب) ممبر کی جگہ آئے تو اس وقت ایک دوسرے کو مستقل سمجھنا درست نہ ہوگا۔

اگر کوئی مجموعہ دین اسلام کے عنوان سے پہچانا گیا ہو اس میں دوسرے دین کے مقابلہ میں کوئی خوبی ہونا چاہئے تاکہ اس سے الگ پہچانا جائے، یعنی اس میں ایسے ثابت اصول ہونے چاہئیں جن پر اسلام استوار ہے اور ایسی صورت میں اگر ایسے اصول جیسے توحید، نبوت، معاد یا نماز و عبادت کے اصول کے معتقد ہوں اور اسی کے ساتھ ان سب کو قابل تبدیل سمجھیں اور ان کے بارے میں مختلف تفسیریں بیان کریں تو ہم کسی بھی ثابت رکن کو ثابت نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ اصول اسلام کی ایک اصل ہے۔

لہذا اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام کے نام پر کوئی معین مجموعہ موجود نہیں ہے، تو ایسی شکل میں ہم کس چیز سے دفاع کریں؟ کس طرح سے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں، اگر ہم ان کو مسلمان ہونے کا طریقہ نہ بتائیں اور ان سے یہ کہیں کہ اسلام کو جس انداز سے اور جس طرح سے سمجھے ہو ویسے ہی اس پر عمل کرو اور اسلام سے اپنی فہم و ادراک کے مطابق عمل کرو! اگر تم اس نتیجہ پر پہنچے کہ نماز پڑھو، تو نماز پڑھو، اور اگر تم اس نتیجہ تک پہنچے کہ نماز نہیں پڑھنا چاہیے تو نماز نہ پڑھو، تم آزاد ہو، اور اپنی فہم کے مطابق عمل کرو!، تو اسلام سے اس طرح کا ادراک، مسیحیت یا دوسرے مذاہب کے ادراک سے کیا فرق رکھتا ہے؟ پھر کیوں لوگوں کو اسلام کی طرح دعوت دیں! اگر یہ طے ہے کہ ہر شخص اپنے فہم و ادراک کے مطابق عمل کرے اور کوئی اصول، اور ثابت کلیہ موجود نہ ہو تو ہم صرف لفظی طور سے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس فکر کی بنیاد پر پھر یہ فرق باقی نہیں رہ جاتا کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں یا مسیحیت کی طرف یا اصلاً بے دینی کی طرف دعوت دے رہے ہیں!

۳- اسلام، اصول اور ثابت معرفتیں

کسی شخص کا یہ کہنا دھوکہ بازی اور نفاق ہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اسلام سے ایک ثابت مفہوم کو درک نہیں کرتا ، اس کے تمام اصول قابل تبدیل ہیں اور مختلف تفسیریں ہیں، ایسی صورت میں اسلام سے وہی بات سمجھنا ممکن ہے جو مسیحیت سے سمجھی جاتی ہے تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور ایک مسلمان اور مسیحی میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا، مثلاً ہر ایک بلندنگ مستحکم اجزاء سے بنتی ہے جیسے ستون، دیوار اور چھت وغیرہ، اور پھر ایک مدت کے بعد ویرانہ میں تبدیل ہو جاتی ہے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ بلندنگ - کے اجزاء مستحکم نہیں ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک بلندنگ میں ستون، دیوار اور چھت ہیں تو بلندنگ ہے اور اگر نہیں ہے تب بھی بلندنگ ہے، اگر زمین، ہوا اور دریا میں ہو تب بھی بلندنگ اور اسمیں کسی طرح کی خصوصیت اور مستحکم و ثابت اجزاء موجود نہیں ہوتے ہیں، اسی طرح اسلام بھی ثابت اور معین اجزاء سے وجود میں آتا ہے اور اگر اسلام میں ثابت اور کلی اصول نہ ہوں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مجموعہ ہے اور وہ اسی طرح کا مجموعہ ہے۔

اس بنا پر اگر کوئی اسلام کو قبول کرے تو اسے چاہئے کہ اس مجموعہ سے ایک حصہ کو ثابت اجزاء کے عنوان سے قبول کرے البتہ ممکن ہے کہ اس مجموعہ کا ایک حصہ مشکوک بھی ہو، یا ایسا کھلا ہوا مجموعہ ہو کہ جس میں کچھ اجزاء کم و زیادہ ہو سکتے ہوں، لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک مجموعہ میں کسی طرح کے ثابت اجزاء نہیں پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ایک مشخص مجموعہ کے عنوان سے باقی رہے۔

اسلام کے بنیادی اور کلی عناصر کو دوست و دشمن سب جانتے ہیں توحید، نبوت اور معاد کے علاوہ اسلام میں دوسرے بھی سیاسی امور ہیں جو سب جانتے ہیں حد ہے کہ منکرین خدا بھی اس سے واقف ہیں، نمونہ کے طور پر نماز اور حج کو اسلام کے اصلی عناصر کا جزء سمجھا جاتا ہے دنیا کے تمام افراد یہ جانتے ہیں کہ مسلمان مخصوص دنوں میں حج کرتے ہیں، ایسی صورت میں کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ جس اسلام کو میں نے سمجھا ہے اس میں حج نہیں ہے، سبھی یہ جانتے ہیں کہ اسلام میں نماز ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اسلام سے جو میں سمجھا ہوں اس کی بنیاد پر نماز، اسلام میں نہیں ہے تو ایسا شخص یا اسلام کو نہیں سمجھا، یا جھوٹے طریقہ سے اپنے کو مسلمان کھلواتا ہے جبکہ منافق یا دھوکہ باز ہے، اور یہ اس لئے کرتا ہے کہ اپنے کو مسلمان بتا کر ایک مسلمان کی خصوصیت سے محروم نہ کرے، اور اسے اسلامی معاشرہ سے نکالنا نہ جائے، ورنہ نماز، روزہ اور حج اس مجموعہ کے ثابت ارکان میں سے ہیں، اور مسلماً تمام مسلمانوں کے نزدیک دن کے ضروری مسائل کا جزء ہیں۔

اگر کوئی اسلام سے واقف ہو تو کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام میں چوری سے روکنے کے لئے سزا کا قانون نہیں ہے جب کہ قرآن نے آیت:

میں اس مسئلہ کی صراحت کی ہے، اسی طرح دوسرے تمام مقامات پر بھی قرآن کی صریح نص موجود ہے لہذا اسلام کے ضروری احکام ثابت کر دیئے گئے ہیں اور اب ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم پھر سے انہیں سمجھیں اور ایک ایک کو ثابت کریں، اس بنا پر اگر یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام جس کی بنیاد قرآن پر ہے وہ خدا کی جانب سے آیا ہے اور حق ہے تو یہ قبول کر میں کہ جو کچھ بھی قرآن میں ہے وہ حق ہے اور قرآن ایک طرح کے محکم، قطعی اور ضروری امور پر مشتمل، البتہ کچھ آیتوں کی مختلف تفسیریں ہونا ممکن ہیں، لیکن ایک آیت سے صرف دو مختلف تفسیروں کا وجود اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ قرآن سے کسی ثابت اور قطعی امور کا استنباط نہیں ہو سکتا اور ہر شخص جو چاہے اس سے درک کرے۔

اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے اور قرآن کی طرف مراجعہ کرے تو وہ قرآن سے ایک ایسے مطلب کو درک کر سکتا ہے کہ جو انسان کے مختلف ادراکات سے کوئی ربط نہ رکھتا ہو، اور نہ ہی اس کا گزشتہ افکار و مسلمات سے کوئی رابطہ ہو، اور نہ ہی ہمارے ان قوانین کے تابع ہو جن کو ہم علوم سے درک کرتے ہیں مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے جو ہمیں نماز کا حکم دیتی ہے یا ایک ایسی آیت ہے جو چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتی ہے وہ شخص جو کسی زمانے میں عناصر چھارگانہ، ساتوں آسمان کا معتقد تھا آیت سے وہی سمجھ رہا تھا جو آج ”انیشنٹن“ کی نسبت کی تھیوری کے بعد سمجھ رہا ہے اور استنباط کر رہا ہے اور یہ نہیں کھا جا سکتا کہ آج انیشنٹن کی نسبت کی تھیوری پائی جا رہی ہے لہذا آیت کے معنی بدل گئے، ممکن ہے کہ ایسی آیت ہو جس کے کلمات لغات میں تبدیل اور دوسرے علمی مسائل سے مربوط ہوں، لیکن کچھ مطالب ایسے ہیں جن کا سمجھنا دوسرے مختلف علوم سے مربوط نہیں ہے اور فطری طور سے ان میں تبدیلی کا شبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

۵۔ قرآن کریم کے ثابت اور قطعی احکام و مفاہیم

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اسلام میں ایک طرح کے ضروری احکام موجود ہیں جو کہ ثابت ہیں خواہ کوئی مسلمان ہو نہ ہو یہ جانتا ہے کہ اسلام میں کچھ ضروری مسائل ہیں، اسی طریقہ سے ایک طرح کے قطعی مفاہیم قرآن سے بھی استنباط ہوتے ہیں چاہے کوئی قرآن کو قبول کرے یا نہ کرے، وہ قرآن سے ان مطالب کو درک کرتا ہے اور ان مطالب کا سمجھنا عربی سے واقفیت پر موقوف ہے، اس کے مسلمان ہونے پر نہیں، ہماری گفتگو ان چیزوں کے بارے میں ہے جو کسی اعتبار سے قابل تغیر نہیں ہیں اور نظریات کے اختلاف اور ادراک کے اختلاف کے باوجود اس کے معنی اور مفہوم اپنی جگہ پر ثابت اور قطعی اور قابل اعتراض ہیں مثلاً جملہ ﴿

کے معنی نماز کے واجب ہونے کے ہیں اور جملہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾^(۳) کے معنی روزہ کے واجب ہونے کے ہیں، چاہے جیسی علمی تھیوریاں ایجاد ہوں اور اس میں تجدید نظر ہو لیکن قرآن کے فہم و ادراک میں تبدیلی نہیں آئے گی اس کے احکام اپنی جگہ پر مسلم ہیں، جس وقت ہم دین کی ضروری مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ان کو یقینی، مستحکم ناقابل تبدیل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کو اسلام کے اصلی اور قطعی منابع یعنی قرآن اور احادیث سے حاصل کیا گیا ہے اور جو لوگ ضروریات دین کے منکر ہیں اور لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام سے مستحکم اور یقینی اصول نہیں سمجھا جاسکتا، تو یا تو وہ مسئلہ میں شبہ کے شکار اور جاہل ہیں یا تعصب کرتے ہیں اور اسلام پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، بلکہ مسلمانوں سے کھیلنے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی سیاسی حکمت عملی ثابت اصول اور ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ قانون خدا کی طرف سے بنے اور جو لوگ قانون الہی کے منکر ہو گئے ہیں دراصل وہ ضروریات دین کے منکر ہیں جس طریقہ سے قرآن کریم سے نماز پڑھنے کے وجوب کو سمجھا جاتا ہے، زنا کار مرد اور زنا کار عورت کا حکم سمجھا جاتا ہے اور جتنی صراحت کے ساتھ قرآن میں نماز و روزہ کا حکم ثابت ہے اتنی ہی صراحت کے ساتھ پیغمبر کی اطاعت بھی واجب ہے اور شریعت اسلام میں پیغمبر کے مقام کو ”مفترض الطاعة“ کے عنوان سے پہچانا گیا ہے۔ خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا طِيعُوا اللَّهَ وَ طِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾^(۴)

”اے ایماندارو! خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور جو تم میں سے اولی الامر ہوں“ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولَ فَخُذُوا وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾^(۵)

”ہاں جو تم کو رسول دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو“ جب تک مندرجہ بالا آیات کے مطالب کو تسلیم نہ کیا جائے جن میں اسلام کے ضروری احکام بیان ہوئے ہیں ورنہ اس وقت تک اسلام کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور ایسی شکل میں انسان کا ان لوگوں میں شمار کیا ہوگا جن کے قول کی خداوند عالم یوں حکایت کر رہا ہے:

﴿وَيَقُولُونَ نُوْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾^(۶)

”اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں“ اور اسی کے بعد خدا ان کے بارے میں یہ بھی فرماتا ہے:

﴿وَلَيْكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا﴾^(۷)

”یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں“

لہذا جو شخص اسلام کا معتقد ہے اس کو ایک سرے سے اس کے تمام قوانین اور احکام کو ماننا چاہیئے، اور یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اسلام کے تمام ضروری احکام علمی تبدیلیوں کے تابع نہیں ہیں کہ جو علمی نظریات یا نئی علمی تھیوریوں کی وجہ سے ان میں تبدیلی رونما ہو جائے ایسی شکل میں جو نماز سے مربوط آیت کو حق سمجھتا ہے اور چوری سے متعلق آیت کو حق جانتا ہے اگرچہ اسے قرآن میں متشابہ اور محمل آیات ملتی ہیں، جن کو وہ اسلام کے متغیر قانون کی حیثیت سے پاتا ہے، لیکن یہ یقین رکھتا ہے کہ قرآن اور اسلام میں ایسے مستحکم اور یقینی اصول موجود ہیں جو دوسرے تمام متغیر اصول سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

۶۔ اسلام مختلف تعبیر میں رکھتا ہے۔

(ایک اعتراض اور اس کا جواب)

یہ بات تواضع ہے کہ کچھ آیات سے مختلف طرح کے مطالب سمجھے جاتے ہیں اور مختلف طرح کی تفسیریں بیان کی جاتی ہیں اور اسلام کے کچھ احکام میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے جو اس بات کا باعث نہیں بنتا کہ اسلام کے سارے قوانین مشتبہ اور اختلافی ہیں، اسلام میں ایسے ہزاروں قطعی احکام موجود ہیں جن کے بارے میں تمام اسلامی فرقوں کا اتفاق نظر پایا جاتا ہے لیکن فرعی اور بہت مختصر احکام میں شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں، اور فقہ کے ایک عظیم حصہ میں فریقین کے یہاں اختلاف نظر نہیں پایا جاتا ہے اسی طرح سے شیعہ فرقے کے کچھ احکام میں فقہاء کے درمیان فتوؤں میں اختلاف کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تمام احکام میں اختلاف پایا جاتا ہے، جس طرح ایک مخصوص بیمار کے بارے میں دو ڈاکٹروں کی تجویز کا الگ الگ ہونا اور دونوں کے نسخوں کا فائدہ بھی ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ علم ڈاکٹری میں پائیدار اور استوار قوانین نہیں پائے جاتے ہیں۔

اسی بنا پر اسلام میں ایک طرح کے قطعی اور یقینی احکام موجود ہیں جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا ہے، اور بعض مقامات پر اختلاف نظر کا ہونا ہمیں اس بات کا سبق نہیں دیتا کہ ہم مسلم احکام نہیں رکھتے اور اس بھانہ سے ہم اسلام سے الگ ہو جائیں، اس کے باوجود آج جب اسلام کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو قلبی مریض اور قرآن کے ارشاد کے مطابق: ﴿الَّذِينَ فِي

قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ﴾^(۸)

”پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے“

کہتے ہیں کہ کونسا اسلام؟ وہ اسلام جس کو شیعہ بتاتے ہیں یا وہ اسلام جس کو سنی بتاتے ہیں؟ یا وہ جس کو فقہاء بتاتے ہیں یا وہ جس کو دانشور حضرات بتاتے ہیں؟ اس کے باوجود کہ ہم اعتقادات، اخلاقیات، فردی احکام، سماجی احکام، تجارت کے قوانین اور

بین الاقوامی قوانین میں ایک طرح سے ثابت حقوق اور ہزاروں متفق علیہ قوانین رکھتے ہیں، تو پھر کیوں وہ لوگ بجائے اس کے کہ یقینی اور مسلم قوانین کو اپنائیں اختلافات اور افتراقات کو اپنائے ہوئے ہیں؟ اور جب ان سے یہ کھا جاتا ہے ہماری یونیورسٹیوں کو اسلامی ہونا چاہئے تو کیوں روحی بیمار اور کج فکر لوگ پوچھتے ہیں کہ کون اسلام؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہی اسلام جو یہ لکھتا ہے کہ دوسروں کے حقوق کو پامال نہیں کرنا چاہیئے، عدالت کو قائم کرنا چاہیئے کیا ان چیزوں میں اختلاف پایا جاتا ہے؟

اگر آپ انہیں یقینی اور متفق علیہ قوانین کو جن کمرے بارے میں فریقین میں اختلاف نہیں ہے یونیورسٹیوں میں اپنائیں تو آپ نہایت خوش ہونگے، یہ فطری بات ہے کہ جب وہ لوگ نہیں چاہتے کہ اسلام کے مطابق عمل کریں تو بھانہ تلاش کرتے ہیں کہ کس نے کھا ہے کہ فقہاء کا اسلام نافذ کیا جائے اور روشن فکروں کا اسلام نافذ نہ کیا جائے؟

۱۔ اسلام انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے

اس بات کو ثابت کرنے کے بعد کہ اسلام میں قوانین اور سماجی احکام موجود ہیں مختلف طرح کے سوالات اور شکوک پیدا ہوتے ہیں انہیں میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ انسان کی تمام ضروریات مختلف زمانے میں ایک مجموعہ میں بیان کر دی گئی ہوں؟ دوسری بات یہ کہ کیا وہ اسلام جس کا منبع قرآن اور معتبر روایات ہیں اس کے اندر اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ تمام چیزوں کو، جس کی انسان کو مختلف زمانوں اور صدیوں میں ضرورت پڑتی ہے اپنے اندر رکھتا ہو، مذکورہ سوال کے دو حصے ہیں ایک ثبوتی حصہ دوسرا ثباتی اور دونوں جھتیں یعنی ثبوتی اور ثباتی قابلِ بحث و تحقیق ہیں، البتہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اعتراض قابلِ غور و فکر ہے، اور آغاز بحث میں اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا اور توجیہ نہیں کی جاسکتی، لیکن ان توضیحات کے مد نظر جو اس سے قبل ہم نے دی ہے اس کا جواب اتنا مشکل اور دشوار نہیں ہے۔

الف: سوال کے ثبوتی پہلو کی تحقیق

ثبوتی نقطہ نظر سے اس اعتراض کہ کس طرح سے قوانین کا مجموعہ، انسان کی زندگی کے تمام مراحل میں اس کی ضرورتوں کا جواب گو ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قطعی طور پر انسانوں کے اندر صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ وہ انسان کے لئے مختلف صدیوں اور زمانوں کا قانون کا ایک کامل مجموعہ میں بنائے، اس لئے کہ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ بشر اپنی محدود ذہنیت اور ناقص معلومات کے ذریعہ یہ صلاحیت نہیں رکھتا ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے تمام گوشوں اور تمام حالات سے بحث کرے اور ہر ایک کے لئے مناسب قانون بنائے۔

لیکن اس ذات کے لئے جس نے بشر کو پیدا کیا ہے جو تمام ماکان و مایکون کے حالات سے واقف ہے جس کی نظر ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں ہیں ہزاروں سال قبل و بعد کی اشیاء کو واضح انداز میں دیکھتا ہے اس کے قانون کے مجموعہ کی توضیح اور تشریح ممکن اور میسر ہے، لہذا یہ نہیں کھا جاسکتا کہ انسان کی اس طولانی تاریخ میں تمام انسانوں کے لئے قوانین کا ایک کامل مجموعہ جو انسان کی زندگی کے تمام مراحل پر مشتمل ہو ممکن نہیں ہے، اس لئے جو گزشتہ اور آئندہ کی چیزوں کی خبر رکھنے والا اور انسانی وجود کے تمام پہلوؤں کی خبر رکھنے والا ہو، وہ اس طرح کے قوانین کو بنا سکتا ہے۔

ب:- سوال کے اثباتی پہلو

اعتراض کے اثباتی پہلو یعنی جس چیز کو تم خدا کی طرف منسوب کرتے ہو اور وہ قرآن اور متواتر روایات میں بیان ہوئی ہے خاص طور سے اگر ہم صرف ان مسلمات اور یقینی قوانین کو اپنائیں، تو کس طرح ہر زمانہ میں محدود قانون بشر کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ہر چیز کے بارے میں خاص قانون پیش کریں جس میں اس جگہ اور اس زمانہ کے تمام شرائط کا لحاظ کیا گیا ہو اور اس وجہ سے کہ قانون کے نیازمند مسائل محدود نہیں ہیں اور اس کی رغبت بے انتہاء ہے اور اس کے مقابلہ میں ہماری ادراک، فہم، ذہن اور سمجھنے کی صلاحیت محدود ہے لہذا ہم تمام مسائل کو ایک خاص اور معین شکل اور مکمل طریقہ سے حاصل اور معین نہیں کر سکتے لیکن یہ کھا جاسکتا ہے کہ بے شمار مسائل کے بے شمار دستہ نہیں ہیں، ان مسائل میں ہر مجموعہ ایک کلی عنوان رکھتا ہو اور اس عنوان کا ایک خاص حکم ہو، لہذا کلی حکم ثابت اور محدود ہے اور ان کے مصادیق بے شمار ہیں اور ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی ایک زمانہ میں کوئی ایک مصداق کسی ایک حکم کو شامل ہو دوسرے زمانہ یا دوسرے حالات میں ایک دوسرے عنوان کے تحت قرار پائے اور بدل جائے، لہذا موضوعات میں مختلف اور بے شمار تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، لیکن لا محدود اور کلی عناوین ثابت رہتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی کے حالات مختلف ہیں اور ہر روز حالات بڑھتے رہتے ہیں، اور زمانہ کی ترقی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ نئے مسائل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ جن کے بارے میں خاص قوانین کی ضرورت ہوتی رہتی ہے، تاکہ انسانی ضرورت پوری ہو سکے، البتہ ان متغیر قوانین کو خاص معیار کی ضرورت ہے کہ اگر انسان ان ثابت اور کلی معیار کو پہچان لے اور اس کی اجازت سے کہ جس نے کلی قوانین کو نازل کیا ہے اور لوگوں تک ان قوانین کے کلی معیار کو پہنچوانا ہے تو پھر کسی بھی خاص مقام کے لئے قانون بنا سکتا ہے۔

ہماری اس بات کا کہ (قوم و ملت میں اسلام کے قوانین نافذ ہونے چاہئے) مطلب یہ ہے کہ صرف وہی قوانین نہیں ہیں جو براہ راست خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں بلکہ پیغمبر و امام معصوم (ع) اور وہ حضرات کہ جو ان قوانین کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور

ان کے معیار کو بخوبی جانتے ہیں اور کلی قواعد اور تراجم کی صورت میں کسی ایک کی حجیت کو تشخیص دے سکتے ہیں ان کے مصادیق اور قوانین کلی کی حاکمیت اور اہمیت کو معین کر سکتے ہیں اور بدون شک یہ کام الہی قوانین کی بنیاد پر قائم ہے۔

حوالہ

(۱) سورہ مائدہ آیت ۳۸

(۲) سورہ بقرہ آیت ۴۳

(۳) سورہ بقرہ آیت ۱۸۳

(۴) سورہ حشر آیت ۷

(۵) سورہ نساء آیت ۵۹

(۶) سورہ نساء آیت ۱۵۰

(۷) سورہ نساء آیت ۱۵۱

(۸) سورہ آل عمران آیت ۷

قانون کے سلسلہ میں نظریات میں فرق

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

حکومت و سیاست سے متعلق اسلامی نظریہ پیش کرنے کے سلسلہ میں ہم نے گذشتہ جلسوں میں یہ عرض کیا تھا کہ اسلام کی رو سے قانون ساز اور قانون کا نفاذ کرنے والا خدا کی جانب سے منسوب ہونا چاہئے؛ یعنی قانون کو یا خدا بلا واسطہ بیان کرے جیسا کہ سماجی قوانین سے متعلق آیات اس بات کو بیان کرتی ہیں، یا ان قوانین کو پیغمبر اسلام یا ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات اور آیات قرآن کی تفسیر میں بیان ہوئے ہیں جو کہ سنت کے ذیل میں آتے ہیں، ان قوانین میں سے بعض دائمی، مستحکم اور ناقابل تبدیل ہیں اور بعض میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، جو زمانہ اور جگہ سے لحاظ سے ہوتے ہیں، غیبت امام (ع) کے زمانے میں ان کو معین کرنے کا اختیار ان افراد کو دیا گیا ہے کہ جو دینی معلومات، پرہیزگاری اور عدالت اور معاشرہ کی مصلحتوں سے آگاہی کے اعتبار سے امام معصوم علیہ السلام سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ اور نفاذ قانون کے سلسلے میں بھی ہم نے یہ عرض کیا کہ خود خداوند عالم اس کے نفاذ کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ یہ کام اس شخص کے ذریعہ انجام پانا چاہئے جو نفاذ قانون کا ذمہ دار ہو، اور وہ پہلے مرتبہ میں خود پیغمبر اسلام پھر ائمہ معصومین علیہم السلام اور پھر وہ افراد ہیں جو پیغمبر یا امام علیہ السلام کی جانب سے خاص یا عام طور پر معین کئے گئے ہوں۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے جلسہ میں عرض کیا کہ مذکورہ نظریہ کی بنیاد ایک طرح کے بنائے ہوئے اصول پر ہے کہ جس میں سے پہلی اصل یہ ہے کہ معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہے، اور دوسری اصل یہ ہے کہ قانون کو خدا کی جانب سے ہونا چاہئے، ان دو مرحلوں کے بعد نفاذ قانون کے مرحلوں کو بیان کیا جاتا ہے، جو حضرات ان اصولوں کے قائل ہیں مثلاً مسلمان ہیں یا اسلام کے اصولوں کے معتقد ہیں ان سب کے لئے بحث میں داخلی نظم کا لحاظ کرتے ہوئے اس نظریہ کا ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن جو افراد اسلام کے اصولوں کے معتقد نہیں ہیں یا جو ان مسائل کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ دشمنوں کے اعتراضات کا جواب دے سکیں ان کے لئے ہر ایک اصول کو بہت تفصیل سے بیان ہونا ضروری ہے۔

۲۔ دور حاضر میں قانون سے بحث کرنے کی ضرورت

اس دور میں سیاسی مسائل کے بارے میں مختلف طرح کے نظریات ہمارے سامنے ہیں، لہذا حکومت و سیاست کی فکری بحثوں کے بارے میں اسلام کی رو سے زیادہ توجہ ہونا چاہئے تاکہ ہم مخالف نظریوں کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ کو مستحکم و یقینی

شکل میں پیش کر سکیں، خاص طور سے اس بات کا لحاظ کریں کہ عالمی استعمار اسلامی حکومت کے نظریہ کو پامال کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے، اس وقت ہم انقلابی دور میں اور ایسے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ نظام حکومت کو ثابت کیا جا چکا ہے، اور اسلام کے نظریات کو پیش کرنے کے لئے علمی اور منطقی وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

اور اس بات کے پیش نظر کہ ملک کے راہنماؤں کی طرف سے قانون مندی اور نفاذ قانون کا نعرہ لگایا جاتا ہے، لہذا عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ قانون کے مسئلہ کے اصول، حدود اور اہمیت پر توجہ رکھنی چاہئے، اور اس بات سے آگاہ ہوں کہ ہم کیوں؟ اور کس حد تک قانون کی پیروی کریں؟ یہ وہ اسباب ہیں جو اس زمانہ میں، اسلام کے سیاسی اور حکومتی مسائل کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت کو دو گنا کر دیتے ہیں، لہذا ہمیں ایک حد تک ان تمام بحثوں کو علمی اور تحقیقی شکل میں پیش کرنا چاہئے۔

۳- قوانین کے حدود کو معین کرنے میں دو مختلف نظریے

آج کا انسانی معاشرہ مختلف طرح کے بے شمار قوانین سے دوچار ہے، اور اگر ہم ان کتابوں پر نظر ڈالیں جو پچاس ساس قبل ہمارے لئے لکھی گئی ہیں تو ہم یہ سمجھ جائیں گے کہ ان کتابوں کی زخامت میں اضافہ تقریباً قاعدہ عددی کی ارتقائی شکل میں ہے اور جو قوانین اس زمانے میں پائے جاتے تھے ان کی تعداد آج کے قوانین کی تعداد کی نسبت بہت کم ہیں، پھر خاص طور سے آج کل کے شعبہ جات، آئین ناموں، دفتری اور قوانین منظمہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور معاشرے کو نئے قوانین کی ضرورت کا زیادہ سے زیادہ احساس ہو رہا ہے، اور ذمہ دار حضرات بھی ان قوانین کے بنانے اور نافذ کرنے میں اپنی پوری کوشش و محنت لگا دے رہے ہیں۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون کی تعداد میں اضافہ کرنا معاشرہ کے لئے ضروری ہے؟ یہ سوال پہلی نظر میں سادہ اور عمومی معلوم ہوتا ہے اور کوئی خاص سوال معلوم نہیں پڑتا اس لئے کہ یہ بات واضح ہے کہ معاشرہ کو ہر روز جدید مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور یہ معاشرہ جدید قوانین کا بہت زیادہ نیاز مند ہے جو کہ بنائے اور نافذ کئے جانے چاہئے،، لیکن دنیا کے علمی حلقہ میں یہ سوال اہمیت کے ساتھ ذکر ہوتا ہے کہ کیا سماجی قوانین کے بنانے میں صرف ضروری اور کم سے کم پر اکتفاء کی جائے یا معاشرے کے قوانین جامع اور ہمہ گیر ہوں اور عوام کی زندگی کے تمام امور کو شامل ہوں؟ یہ مسئلہ فلسفہ سیاست اور فلسفہ حقوق کے عملی حلقوں میں اعلیٰ پیمانہ پر مورد بحث و وقع ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں دو مختلف اور متضاد نظریہ پائے جاتے ہیں۔

ایک گروہ کا اعتقاد یہ ہے کہ عوام الناس کو اپنے امور اور سرگرمیوں میں آزاد ہونا چاہئے اور محکمہ قانون سازی کو چاہئے کہ کم سے کم قانون بنائے اور ضرورت سے زیادہ عوام الناس کی فعالیت اور امور کو محدود نہ کرے، یہ وہی خود مختاری اور آزاد خیالی نظریہ ہے اور اس کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہو، اور صرف

پیش آنے والی ضرورتوں کے وقت کے لئے قانون بنائے، تاکہ لوگوں کی کارکردگی ضرورت کے تحت محدود ہو، نہ کہ اس سے زیادہ، اور قانون سازی محکمہ اور حکومت کو مسلسل عوام الناس کے امور اور طرز زندگی میں دخالت نہیں کرنا چاہئے اور قدم قدم کے لئے قانون نہیں بنانا چاہئے، مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں قانون کے سلسلہ میں تمامیت گرائی (ہر چیز قانونی) کا نظریہ پایا جاتا ہے کہ تمام چیزیں قانونی ہونا چاہئے اور انسان کے تمام امور خواہ وہ سماجی ہوں یا سیاسی اور اقتصادی یا دوسرے امور، یہ سب کے سب دقیق اور معین قوانین کے تحت ہونے چاہئے، اور حکومت کو بھی ان قوانین کو ہر ممکن طریقہ سے نافذ کرنا چاہئے۔

تو معلوم یہ ہوا کہ مذکورہ سوال سادہ اور عوامی نہیں ہے بلکہ ایسا سوال ہے جو قانون کے حدود کے بارے میں دقیق اور مستحکم ہے اور وہ یہ کہ قانون گزاری کا محکمہ کس طرح کے قوانین اور کتنے قوانین اور عوام الناس کی زندگی کے کن حدود تک اثر انداز بنے؟

۲۔ جمہوری حکومت میں قانون کی ضرورت

بنیادی طور پر یہ سوال قوانین کے حدود سے کے بارے میں ہوتا ہے جو کہ قانون سازی کے فلسفہ کے سلسلہ میں مختلف طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں کہ جن میں قانون گزاری اور ان کے معیار کے بارے میں نظریات بیان کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پائے جانے والے نظریات کے درمیان کہ کس کو قانون گزاری کا حق ہے اور اس کے معیار کیا ہیں، ایک مشہور نظریہ ہے کہ جس کو آج کل کی دنیا میں قبول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ (صرف) وہ لوگ قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں جو عوام الناس کی طرف سے منتخب ہوئے ہوں، لہذا درحقیقت قانون بنانے کا حق خود عوام الناس کو ہے اور وہ خود عوام الناس ہے جو اپنے لئے قوانین بناتی ہے جو نظام سیاسی اس نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے اس کو ”ڈیموکراسی“ یا ”جمہوریت“ کہتے ہیں۔

جمہوریت کو قبول کرنے کے بعد اور اس بات کو قبول کرنے کے بعد کہ قانون سازی کا حق عوام الناس کے منتخب ممبران کی ذمہ داری ہے، یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جو بھی اکثریت (یعنی ۵۱ فی صد) نمائندوں کے موافق ہو وہ قانون معتبر سمجھا جاتا ہے یا قانون سازی کے لئے دوسرے قوانین بھی ہونے چاہئے، اور پہلے سے ایسے قوانین بنائے جائیں جو قانون سازی کے میدان میں ممبران کے دائرہ عمل کو معین کریں، تو جواب یہ ہے کہ قانون ساز حضرات کے حدود اور حق کو قانون اساسی معین کرتا ہے یعنی قانون اساسی عام قوانین اور وضع شدہ قوانین پر حاکم اور نگران ہوتا ہے اور قانون سازی کے حدود کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔

یہاں ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف ممالک میں قانون اساسی مختلف ہوتے ہیں اور کم و بیش اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور کبھی کبھی حکومت کے بدلنے سے قانون اساسی بدل جاتا ہے اور کبھی مجلس ادارات تشکیل پاتی ہے جو قانون اساسی کو مکمل اور اس کے نقائص کو دور کرتی ہے، بہر حال جو تبدیلیاں قانون اساسی میں انجام پاتی ہیں ان کے اعتبار سے کوئی ایسا محکمہ پایا جاتا ہے جو قانون اساسی سے بالاتر ہو اور جو قانون اساسی کے حدود کو معین کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قانون اساسی سے

بالا تر محکمہ حقوق بشر ہے جس کو کبھی قوانین فطری اور حقوق طبعی سے یاد کیا جاتا ہے کہ جو قانون اساسی پر حاکم ہوتا ہے اور اس کے حدود کو معین کرتا ہے اس لئے کہ مجلس ادارات ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق قانون میں داخل نہیں کر سکتی۔

۵۔ حقوق بشر کے اعتبار کا معیار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوانین جو قانون اساسی پر بھی حاکم ہوتا ہے اور قانون اساسی کے دائرہ کو محدود و معین کرتا ہے اور اسکی بنا پر قانون اساسی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کو کس نے بنایا ہے؟ اور انسانوں کے حقوق جو کہ حقوق بشر کے اشتہارات میں یا فلسفہ حقوق کی کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں کس شخص کے ذریعہ معین ہوئے ہیں اور ان کے اعتبار کی وجہ کیا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ بین الاقوامی عرف میں اس کا اعتبار ان لوگوں کی تائید سے ہوتا ہے جنہوں نے اس اشتہار پر دستخط کئے ہیں اور چونکہ اس اشتہار کو دنیا کی تمام حکومتوں کے دستخط (تائید) حاصل ہوتی ہے لہذا یہ معتبر ہو جاتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس نے اس اشتہار پر دستخط نہیں کئے ہیں ان کے لئے یہ قوانین قابل اعتبار ہیں یا نہیں؟ اور اگر اعتبار نہیں رکھتے تو کوئی یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ ان کی مذمت کرے کہ جن لوگوں نے اس اشتہار پر دستخط نہیں کئے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ کھا جائے کہ یہ حقوق بشر کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حقوق بشر کے اشتہارات میں پیش کئے گئے قوانین اور حقوق وضعی قوانین نہیں ہیں کہ جو بنائے جانے کے بعد دوسروں کے دستخط کے ذریعہ قابل اعتبار بن جاتے ہیں بلکہ وہ ایسی حقیقی قوانین ہیں جن کو انسان کی عقل معلوم کرتی ہے اور چاہے عوام الناس قبول کرے یا نہ کرے، وہ قوانین معتبر ہوتے ہیں، البتہ اس زمانے میں کچھ افراد اس طرح کا نظر رکھتے ہیں اور حقوق بشر کو حقیقی امور اور غیر عادی جانتے ہیں، قطعی طور پر زیادہ تر حقوق و سیاست کے فلاسفہ اس طرح کا نظریہ نہیں رکھتے بلکہ اس بات کے قائل ہیں، کہ یہ قوانین کنوینسیون (Convention)، اشتہارات اور اعلانات کا اعتبار حکومتوں کے ممبران کے دستخط سے ہوتا ہے اور چونکہ حکومتوں کے ممبروں نے اس پر دستخط کئے ہیں لہذا پوری دنیا میں اعتبار رکھتے ہیں۔

آخر کار ایک سوال اور اعتراض جو بڑی آب و تاب کے ساتھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ضروری ہے کہ تمام حکومتیں ان قوانین کو قبول ہی کریں؟ اور جن لوگوں نے ان قوانین پر دستخط نہیں کئے ہیں ان پر کس طرح یہ قوانین نافذ ہو سکتے ہیں؟ بہر حال اس طرح کے سوال و اعتراض کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا، اور اس اعتبار سے فلسفہ حقوق میں یہ بحث ہوتی ہے کہ قوانین کے اعتبار کا ریشہ اور جڑ کہاں پر ختم ہوتی ہے؟ لیکن ہمارے پاس آسان اور سادہ سا جواب ہے اس لئے کہ ہم دین، اسلام، خدا اور قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قوانین حکم خدا کے مطابق ہونے چاہئے، تو پھر یہ بات ختم ہو جاتی ہے اور کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لیکن جو لوگ اس راہ کو نہیں طے کرتے اور چاہتے ہیں کہ تمام چیزوں کو قرارداد کے ذریعہ بیان کریں، آخر میں وہ ایک جگہ پہنچ جاتے ہیں چونکہ ہر قانون کے اعتبار کی اصل حقوق بشر کو سمجھتے ہیں کہ اس کے اعتبار کی دلیل کو بھی تلاش کرنا چاہئے اس کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے حقوق بشر کا اشتہار تقریباً ۳۰ بند پر کیوں تدوین ہوا ہے اور اس کے بند کیوں کم زیاد نہیں ہیں؟

یہ وہ اہم سوال ہے جو دنیا کے حقوق کے ماہرین فلاسفہ قبول کرتے ہیں اور ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا ہے، جو چیز ذکر ہوئی ہے وہ دنیا کے ماہر اور برجستہ دانشوروں کی سطح پر مہارتی اور فنی بحثوں کے دائرہ میں بیان ہوتی ہے اور اگر ہمارا معاشرہ چاہے کہ اپنے عمومی تہذیب و ثقافت کو ترقی دے تو اسے چاہئے کہ کم و بیش ان مطالب اور مفاہیم سے آشنا ہو، جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم قانون پر عمل کرتے ہیں اور قانون کے پیرو ہیں، تو ہم کو یہ جاننا چاہئے کہ قانون کا اعتبار کھان سے ہے اور ہمیں کیوں اور کس حد تک قانون کا پابند ہونا چاہئے؟

آج کل بہت ساری بحثیں اس سلسلے میں تقریروں، مجلوں اور اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہے، اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً دنیاوی علوم رکھنے والا طبقہ اور جو لوگ انسانی علوم کے تعلیم یافتہ ہیں اور خاص طور سے جو لوگ فلسفہ حقوق اور فلسفہ سیاست میں صاحب نظر ہیں ان سوالات سے سامنا کرتے ہیں، لہذا ہم اپنے سماج کی تہذیب و ثقافت کو بلند کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ اپنے امکان بھر ان تحقیقات کے نتیجے کو آسان اور سلیس انداز میں بیان کریں، اس لئے کہ اگر ہم ان بحثوں کو دقیق انداز سے اور تفصیل کے ساتھ بیان کریں تو کم سے کم علوم انسانی کے چار قسموں میں یا فلسفہ کی چار قسموں کا سہارا لیں جو اس طرح ہیں: فلسفہ جامعہ شناسی، فلسفہ حقوق، فلسفہ اخلاق اور فلسفہ سیاست، اور اگر ہم چاہیں کہ اس موضوع پر بحث کریں تو ہمیں دوسرے فلسفوں پر بھی بحث کرنا ہوگی، یہاں تک کہ معرفت شناسی کہ جو ان تمام فلسفوں کی بنیاد اور اصل ہے اس کے بارے میں بھی بحث کریں، اور یہ بات واضح ہے کہ ان علوم کے نتائج اور ان بحثوں کے درمیان جو رابطہ پائے جاتے ہیں ان کی طرف اشارہ کرنا، تعلیم یافتہ طبقہ اور سمجھ دار عوام کے لئے جو کہ انقلاب اور اس کی تہذیب و ثقافت کے دامن میں پلے ہیں، بہت مفید ہے۔

۶۔ حقیقی اور تکوینی قوانین اور انسان کے اختیارات کی اہمیت

یہاں یہ بات ذکر کرنا ضروری ہے کہ لفظ قانون کی دو مختلف اصطلاح ہیں، پہلی اصطلاح علوم تجربیات میں علوم دقیق اور حساب مشہور ہے اور قانون سے مراد اس علوم میں اشیاء کے درمیان واقعی رابطہ ہے مثال کے طور پر اشیاء کے درمیان حقیقی قوانین پائے جاتے ہیں کہ پانی کس وقت بخار میں تبدیل ہوتا ہے، اور کتنے درجہ حرارت پر پانی اُبلتا ہے اور کتنی سردی میں برف بن جاتا ہے، اور لوہا کب پگھلتا ہے؟

لہذا اس طرح کی باتیں کہ جب پانی کی حرارت صفر درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو پانی برف بن جاتا ہے اور جب سو درجہ پہنچ جاتی ہے تو پانی اُبلنے لگتا ہے، یہ ایسی حقیقت ہے جو طبعی اشیاء میں پائی جاتی ہے اور انسان کو کوشش کرنا چاہئے کہ ان حقیقتوں اور قوانین کو جو فزیکس اور دوسرے سائنسی علوم میں موجود ہیں پہنچانے، ظاہر ہے کہ یہ قوانین پائیدار ہیں اور لامتناہی اور بے شمار ہیں، اور انسان کی علمی ترقی کے ساتھ بہت سارے قوانین معلوم ہونگے، اور ہر علم میں نئے معلومات کے ساتھ سیکڑوں سوال پیدا ہوں گے۔

لہذا اتنی تعداد میں نئے قانون بھی معلوم ہوں تاکہ ان سوالوں کے جوابات قرار پائیں، اس بنا پر ہر روز سوالوں میں اضافہ ہوتا ہے، اور بشر ان سوالوں کے حل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ قانون معلوم کرنے میں لگا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں، ہم دنیا کے بے شمار قوانین کے مجموعہ کے حدود میں رہتے ہیں، عناصر سے مربوط زندہ موجودات اور شیمیائی سے مربوط قوانین اور دوسری چیزیں ہیں جو ابھی تک ہماری عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس دنیا میں بے شمار قوانین کے محدود و تنگ دائرہ میں رہتے ہیں تو پھر ہمارے انتخاب اور اختیار کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ یہ سوال بہت زور و شور کے ساتھ اٹھتا ہے اور اس وجہ سے انسان شناسی کے فلسفہ میں یہ بات ذکر ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ سو فی صد مجبور ہے یا مکمل طور پر مختار ہے یا محدود اور مشروط اختیارات رکھتا ہے، اور اگر اس کے اختیارات محدود اور مشروط ہیں تو ان کی حدود کیا ہیں، اسی طرح دور حاضر میں دنیا کے فلسفی مجلسوں میں قضا و قدر، جبر و تفویض اور اس طرح کے مسائل بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر ہوتے ہیں، اور ان کے بارے میں حسب سابق بحث جاری ہے، ان کے درمیان میں ایک گروہ فلسفہ وجودی کا نظریہ رکھتا ہے جو اس بات کا معتقد ہے کہ انسان لامحدود آزادی رکھتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ہر کام کر سکتا ہے۔

جیسا کہ "جان پل سارٹر" کہتا ہے کہ اگر میں ارادہ کر لوں تو جنگ ویتنام کی جنگ تمام ہو جائے! یعنی بشر ایسی طاقت کا مالک ہے کہ اگر ایک شخص ارادہ کر لے تو بھڑکتی ہوئی جنگ جس نے لاکھوں انسانوں کو نابود کر دیا ہو روک دے، البتہ یہ بات تعجب خیز ہے، لیکن ایسا نظریہ اُس انسان کے لئے جو ارادہ و نامحدود قدرت کا قائل ہے پایا جاتا ہے۔

مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں ایک گروہ انسان کی آزادی کو خیال خام جانتا ہے اور معتقد ہے کہ انسان جبری قوانین کے دائرہ میں زندگی بسر کر رہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ آزاد ہے آخر کار مذہبی تفکر بھی موجود ہے جو ان دونوں نظریات کے درمیان واسطہ ہے اور انسان کے لئے آزادی کا قائل ہے جو مختلف طرح کے قوانین سے محدود ہے، جو کہ دنیا میں پائے جاتے ہیں یعنی اگر ہم ان قوانین کو جو اس کائنات میں موجود ہیں ان کے لئے دائرہ اور حدود تصور کریں، تو انسانوں کی آزادی، اس کے حدود کے اندر قابلِ اجرا ہے نہ کا اس سے بڑھ کر۔

پس اب جب کہ یہ بات واضح و روشن ہو چکی ہے کہ ہم لوگ تکوینی لحاظ سے قوانین کے مجموعہ کے تحت واقع ہیں، تو یہاں پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا ہم ان قوانین کو توڑنے اور ان کی نافرمانی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، اور کیا ہم طبیعت کو تسخیر کر سکتے ہیں اور اس کے حدود و دائرے کو توڑ سکتے ہیں، اور اس طرح زندگی کریں کہ ہمارے اوپر طبیعی قوانین کی حکومت نہ ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گزشتہ تصور ایک خیال خام ہے اور سوچا سمجھا نہیں ہے، کیونکہ طبیعت کا تسخیر کرنے کا ملازمہ یہ ہے کہ طبیعت کا کوئی دوسرا قانون کشف ہو، مثلاً اگر ماہرین ڈاکٹر کسی بیماری پر کنٹرول کر لیتے ہیں یا اس بیماری کو بالکل ختم کر دیتے ہیں، طبیعت کے دوسرے قانون کے کشف کرنے کی وجہ سے اور ان سب سے استفادہ کرتے ہوئے اس طرح کی کامیابی ملی ہے، درحقیقت ہم نے طبیعت کو تسخیر نہیں کیا ہے بلکہ اس سے ایک دوسرا قانون کشف کر کے اس سے کامیابی حاصل کی ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ تکوینی قوانین کے دائرے سے نکلنا محال ہے، لیکن ہم نے جو نئے تکوینی قوانین کو کشف کر کے اس سے استفادہ کیا ہے یہ وہی قوانین الہی ہیں جن کو خداوند عالم نے طبیعت میں قرار دیا ہے، اور ان سے خارج ہونا گویا انسان کا خدا کی تکوینی عبادت سے خارج ہونا ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ انسان اپنی محدود دائرے میں رہ کر تکوینی قوانین کے مجموعہ میں آمد و رفت کر سکتا ہے، اور مختلف علوم کے قوانین اور تکوینی قوانین جو انسان کے دائرہ اختیار میں ہیں ان سے استفادہ کرے اور ایک قانون کے مقابلہ میں دوسرے قانون سے استفادہ کرے، یعنی یہ محدود دائرہ انسانی اختیار کی حدود کو معین کرتا ہے۔

۱۔ الہی اور تشریعی قوانین، انسان کے کمال اور سعادت کی ضامن ہے

انسان جس قدر بھی انتخاب کی قدرت رکھتا ہے تو کیا جس طرح سے چاہے اس طرح انجام دے سکتا ہے، یا اس کے لئے کوئی ایک حد معین ہے؟ اور کیا اس حد میں بھی کچھ خاص قوانین ہیں کہ جن کو انجام دینا ضروری ہو؟ جواب یہ ہے کہ اس حد میں بھی قوانین معین ہیں البتہ یہ قوانین تکوینی قسم سے نہیں ہیں بلکہ یہ قوانین تشریعی اور اعتباری یا قوانین ارزشی ہیں کہ جن کو قدیم علماء کرام عقل عملی کے دائرہ میں بتاتے ہیں، (ان قوانین کے مقابلے میں کہ جن کا دائرہ عقل نظری ہے) یعنی ہر وہ چیز کہ جو انسان کے اختیار میں ہے اور عقل عملی اس میں فیصلہ دیتی ہے۔ بے شک تشریعی قوانین پر عمل کرنے سے انسان اپنے آخری مقصد اور کمال نہائی تک پہنچ جاتا ہے، اور ان کی مخالفت کرنا انسان کو انسانیت کے گرا دیتا ہے بلکہ جانور سے بھی بدتر بنا دیتا ہے، قرآن مجید اس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۖ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۖ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ (۱)

”ہم نے انسان کو بہت اچھے کینڈے کا پیدا کیا ہے پھر ہم نے اسے پست سے پست حالت کی طرف پھیر دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے (اچھے) کام کرتے رہے ان کے لئے تو بے انتہا اجر و ثواب ہے“

جی ہاں انسان میں اتنی صلاحیت ہے اور وہ خدا داد صلاحیتوں کے ذریعہ خدا سے بہت قریب ہو سکتا ہے، اور خدا کی نافرمانی کمر کے انسانیت سے بھی پست تر بلکہ جانور اور حیوان سے بدتر بن سکتا ہے۔ لہذا قوانین تشریعی اور قوانین اعتباری یعنی خدا کی اطاعت یا خدا کی نافرمانی انسان کے اختیار میں ہے، اگر ان قوانین کو قبول کیا تو گویا انسان نے خدا کی اطاعت کی، اور انسان بلند درجات پر پہنچ جائے گا، اور اس کو چین و سکون اور روحی و معنوی سلامتی مل جائے گی اور اگر اس نے خدا کے نافرمانی کی تو انسانیت سے گرجائے گا، آج کل کے بھداشت اور صفائی کے قوانین کے طرح، کہ اگر ہم نے ان کی رعایت کی تو ہم صحت و سلامتی کی نعمت سے مالا مال رہیں گے اور اگر ہم نے ان قوانین کی رعایت نہ کی تو بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔

انسان کے مختار ہونے کے پیش نظر اگر انسان ڈاکٹری قوانین کی رعایت کرتا ہے یا نہیں کرتا، اگر اپنی صحت و سلامتی کی فکر ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح و سالم رہے تو اس کو ڈاکٹری دستورات کی پابندی کرنی ہوگی، اور اگر اس کو صحت و سلامتی نہیں چاہئے تو پھر ان قوانین پر عمل کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، لہذا حقیقت یہ ہے کہ انسان کی صحت و سلامتی کے لئے ڈاکٹری قوانین کی رعایت کرنا ہوگی اور بغیر اس کے صحت و سلامتی ممکن نہیں ہے، البتہ یہ باتیں کوئی زبردستی والی نہیں ہیں؛ کیونکہ ان قوانین کی رعایت کرنا یا نہ کرنا سب کچھ انسان کے اختیار میں ہے، اور اپنے اختیار سے ان قوانین کی رعایت کر کے صحیح و سالم رہتا ہے اور ان کی رعایت نہ کر کے بیمار پڑ جاتا ہے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

اب تک جو کچھ جسم اور بدن کے بارے میں کھا گیا یہ سب کچھ انسان کی روح کے بارے میں بھی ہے، اور جس طرح انسان کا بدن بیمار ہوتا ہے اسی طرح انسان کی روح بھی بیمار ہو جاتی ہے، روح کی صحت و سلامتی بھی روح سے متعلق قوانین کی رعایت پر موقوف ہے کہ اگر انسان ان قوانین پر عمل کرتا ہے تو معنوی کمال اور سکون و سلامتی اس کو نصیب ہوتی ہے اور اس کے علاوہ انسان کی روح بیمار ہو جاتی ہے، خداوند عالم اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَنَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾^(۲)

”ان کے دلوں میں مرض تھا ہی، اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا“

وہ انسان جو کسی نشیب میں ہو اور وہاں سے تیز دوڑنا چاہے اور اپنے کو کنٹرول نہ کر سکے اور گر پڑے اور اپنی جان کھو بیٹھے، لیکن اگر وہ خود کو صحیح و سالم چاہتا ہے تو اس کو احتیاط کے ساتھ دوڑنا ہوگا، اور اپنے کو اس طرح کنٹرول کرے کہ اگر کسی بلندی سے نیچے کی طرف آ بھی رہا ہے اور کوئی خطرناک جگہ آگئی ہے تو وہاں پر رک جائے اور سنبھال کر قدم اٹھائے۔ معنوی مسائل میں بھی خاص روابط و ضوابط ہیں اور خدا کے احکام پر پابندی کرنے سے روح کی سلامتی اور اخروی سعادت ابدی مل جاتی ہے، اور یہ

بات ظاہر ہے کہ ان قوانین پر عمل نہ کرنے سے اس سعادت پر نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ انسان آزاد اور مختار ہے اور یہ کھ سکتا ہے کہ میں سعادت اور کامیابی نہیں چاہتا اور میں جھنم میں جانا چاہتا ہوں؛ تو کسی انسان بھی اس سے کوئی مطلب واسطہ نہیں رکھتا، اور تکوینی انتخاب کا راستہ اس کے لئے ہموار ہے۔ لیکن اگر خدا کا قرب اور اخروی سعادت چاہتا ہے تو پھر اس کو خدا کے حکم کی پیروی کرنی ہوگی، اور اپنی مرضی نہیں چلے گی، کیونکہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے یا ہوائے نفس کی پیروی گمراہی اور حق و حقیقت سے منحرف ہونے کا سبب ہے:

﴿فَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ وَاضِلَهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَفَّلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ
اللَّهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾^(۳)

”بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہو اور (اس کی حالت) سمجھ بوجھ کمزور خدانے اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہو اور اس کے کان اور دل پر علامت مقرر کر دی ہے (کہ یہ ایمان نہ لائے گا) اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، پھر خدا کے بعد اس کی ہدایت کون کر سکتا ہے تو کیا تم لوگ (اتنا بھی) غور نہیں کرتے“ جو کوئی شخص اگر اپنے نفس اور دل کا تابع ہو گیا ہے تو گونگا اور بھرا ہو جاتا ہے اور حقیقت و واقعیت کو نہیں سمجھ سکتا، اگرچہ بہت زیادہ علم بھی رکھتا ہو، اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے حقیقتیں چھپ جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ”بلعم باعورا“^(۴) کا واقعہ ہمارے لئے باعث عبرت ہے کہ اتنے علم کے باوجود کہ اپنے زمانہ کے بڑے دانشمندوں میں شمار ہوتا تھا لیکن کس طرح سے پستی کی طرف گرا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِنلُ عَلَيْهِمْ نَبَا الَّذِي ءَاتَيْنَاهُ ءَايَاتِنَا فَاسْتَلَخَ مِنْهُمَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْعَاوِينَ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾^(۵)

”(اے رسول) تم ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور آخر کار وہ گمراہ ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم اسے انہیں آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے مگر وہ تو خود ہی پستی کی طرف جھک پڑا اور اپنی نفسانی خواہش کا تابعدار بن بیٹھا، تو اس کی مثل اس کتے کی مثل ہے کہ اگر اس کو دھتکارا دو تو بھی زبان نکالے رہے اور اس کو چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے“

جی ہاں خدا کی عطا کردہ آزادی سے انسان اتنا بھی گر سکتا ہے، لیکن اگر انسان سعادت و کامیابی چاہتا ہے تو پھر اس کو مربوط قوانین کی رعایت کرنی ہوگی، اور یہ قوانین ایک طرح کے نہیں ہیں بلکہ مختلف قسمیں ہیں۔ لہذا ضرورت ہے کہ اسلامی احکامات کے چاہنے والے حضرات کو معلوم ہو جائے کہ ہماری زندگی میں کس طرح کے قوانین کی ضرورت ہے۔

۸۔ حقوقی قوانین اور اخلاقی قوانین میں فرق

قانون کے نام سے جو چیز ہمارے درمیان مشہور ہے وہ ”حقوقی قانون“ ہے ان قوانین سے مراد ایک طرح کے دستور ہیں جو معتبر مرکز یا اداروں کی طرف سے بنتے ہیں اور وہ ایک طاقت ہے جس کا نام قوہ مجریہ (حکومت) ہے جو ان قوانین کے نفاذ کی ضامن ہوتی ہے اور ضرورت کے وقت پولیس یا فوج کے ذریعہ قوانین کا نفاذ کراتی ہے، اور جرائم کی روک تھام کرتی ہے، حقوقی قوانین عام معنی میں سزاؤں کے قوانین کو بھی شامل ہیں جو کہ علم حقوق میں بیان کئے جاتے ہیں، ایسے موقع پر اگر کوئی یہ کہے کہ حکومت کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ عوام کو بتائے ان سے کہے کہ چوری نہ کریں، کسی کی عزت پر حملہ نہ کریں، تو قطعی طور پر کوئی بھی حکومت اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی، اس بات کا مطلب (کہ چونکہ انسان آزاد ہے لہذا اگر وہ قوانین حقوقی کی خلاف ورزی کرے تو کوئی اسے سزا نہ دے) یہ ہے کہ حقوقی قوانین کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، جبکہ قوانین ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کا نفاذ کا کوئی ذمہ دار بھی ہو اور قوانین حقوقی اور قوانین اخلاقی کے درمیان بنیادی فرق بھی ہے۔

اگرچہ دوسرے فرق بھی پائے جاتے ہیں مثلاً اخلاقی قوانین میں یہ ذکر ہوتا ہے کہ امانت کا خیال رکھیں اور اس میں کبھی خیانت نہ کریں، یہ ایک اخلاقی حکم ہے، اب اگر کوئی امانت میں خیانت کرے تو اخلاقی خلاف ورزی کی وجہ سے سزا یا قید میں نہیں ڈالا جائے گا بلکہ دھوکہ دھڑی کرنے پر قانون سزا کے مطابق اسے خاص سزا دی جائے گی، لہذا کوئی ایسا محکمہ ہونا چاہئے کہ جو قانون شکنی کرنے والوں کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور طاقت کے ذریعہ ان پر قانون کو لاگو کر سکے، اس لئے قوانین کا لازمہ یہ ہے کہ طاقت کا استعمال کیا جائے کہ جس کے بغیر قوانین حقوقی بے معنی اور بے کار ہیں، لیکن قوانین اخلاقی ایسے نہیں ہیں، اور نہ ہی کسی محکمہ کی ضرورت ہے، مگر یہ کہ حقوقی پہلو رکھتے ہوں، بے شک دین میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان رابطہ کو برقرار کرتے ہیں جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ یہ احکام فقط ادیان (الہی) میں موجود ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین میں قوانین حقوقی بھی پائے جانے چاہئے یا دین صرف خدا اور بندے کے درمیان رابطہ کو قائم کرنے کے لئے ہے، یہ ایسا شبہ اور سوال ہے جو آج کل وسیع پیمانہ پر یونیورسٹیوں اور ان کی نشریات میں ذکر ہوتا رہتا ہے اور تمام حضرات چاہے وہ یونیورسٹیوں میں رہنے والے ہوں کہ جن سے بلا واسطہ تعلق ہوتا ہے یا ان کے والدین اور رشتہ داوروں سے متعلق ہو، ان اعتراضات اور سوالوں کی طرف توجہ کرنا چاہئے، چاہے یہ باتیں آخر کار طالب علموں اور دانشوروں کے ذریعہ تمام افراد تک پہنچتی ہوں اور ہمارے عمومی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہوتی ہیں، ایک دن بھی جو ان طالب علم اپنے ماں باپ کی جگہ لیتے ہیں اور ایک موثر اور نمایاں شخصیت بن کر معاشرہ کے بنیادی افراد میں قرار پاتے ہیں، اب اگر اس وسیع طبقہ کی تہذیب و کلچر بدل جائے تو ایک نسل کے بعد معاشرے کا کلچر پورے طور سے بدل جائے گا، لہذا ہمیں ہمیشہ اس بات کی طرف توجہ کرنا ہوگی کہ کون سی تہذیب اس وقت ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہے اور رواج پارہی ہے۔

۹- اسلامی اور خود مختاری کے نظریات میں فرق

دور حاضر میں جو مسائل ذکر ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ قانون کو کم سے کم ہونا چاہئے، یہ ایک خود مختاری نظریہ ہے جو دور حاضر کی دنیا میں پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اسی نظریہ کی بنا پر کچھ افراد اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت اور قانون ساز حضرات کو انسان کی زندگی اور اس کے امور میں وسیع پیمانے پر دخالت نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ جس قدر حکومت کی دخالت کم ہوگی معاشرہ اتنا ہی زیادہ ترقی کرے گا، البتہ اس نظریہ کے کچھ لوازمات بھی ہیں، جو معاشرے کے دوسرے حالات میں بھی سرایت کرتی ہیں۔

مذکورہ نظریہ کا تعلق سماجی آگہی سے ہے اور جامعہ شناسی کے بارے میں پائے جانے والے دو نظریوں میں سے ایک نظریہ پر موقوف ہے:

پہلے نظریہ میں: معاشرہ کو اصل قرار دیا گیا ہے، اس بنا پر قوانین کو جامع اور ہمہ گیر ہونا چاہئے، جو انسانی زندگی کے تمام حالات پر مشتمل ہو، اور شخصی آزادی کم سے کم ہونا چاہئے۔

دوسرے نظریہ میں: شخصی زندگی کو اصل قرار دیا گیا ہے اس بنا پر انسان کو مکمل آزاد ہونا چاہئے اور سماجی قوانین بہت کم ہونے چاہئیں تاکہ انسان کو کم پابند بنا سکے۔

آج کل جو بات مغربی معاشرے میں پائی جاتی ہے یہی انفرادی اور شخصی زندگی بسر کرنے کا نظریہ ہے کہ جس سے خود مختاری اور آزاد خیالی کا نظریہ پیدا ہوتا ہے، جو نظریہ اس بات کا قائل ہے کہ قوانین کو کم سے کم ہونا چاہئے اور عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہئے تاکہ عوام الناس جس چیز پر چاہے عمل کرے۔

اسلام کے نظریہ کو پیش کرنے سے پہلے اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قانون سے دل چسپی کا موضوع (کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ) علوم انسانی کے چند شعبوں سے مربوط ہے جیسے جامعہ شناسی فلسفہ (یعنی معاشرہ اصل ہے یا شخص اصل ہے) اور فلسفہ اخلاق، اس بات کو سمجھنے کے لئے قدر و قیمت کا معیار کیا ہے؟ کیا اخلاق، قانون پر حاکم ہے یا اخلاق کو، قانون معین کرتا ہے، اسی طرح فلسفہ حقوق اور پھر فلسفہ سیاست میں بھی بحثیں جاری ہیں، اسی نقطہ نظر سے انسان کی زندگی کے تمام پہلو اس کے عاقبت اور انجام سے مربوط ہیں یعنی ہر طرح کی سعی و کوشش اس زندگی میں ہماری ابدی خوش بختی یا بد بختی پر اثر انداز ہوگی۔

اسلامی تفکر سے مراد یہ ہے کہ "الدینا مزرعة الآخرة" یعنی جو کچھ انسان دنیا میں بوئے گا یا جو رفتار و کردار اپنائے گا، آخرت میں اس کا نتیجہ ویسا ہی ظاہر ہوگا، اس کی سعادت کا سبب بنے گا یا اس کی شقاوت و بد بختی کا باعث بنے گا، اگر ہم اس نظریہ کو اصل قرار دیں تو پھر کیا انسان کی زندگی میں کوئی چیز باقی رہے گی جو قانون کی محتاج نہ ہو؟ یہاں پر قانون کا محتاج ہونا یعنی قانون ہماری راہنمائی

کمرے کہ انسان کس راستہ کو انتخاب کرے اور کس راہ و روش کو اپنائے تاکہ اپنے مقصود تک پہنچ جائے یعنی اگر معاشرہ امن و سلامتی چاہتا ہے، تو انسان کسی کی عزت اور مال و دولت پر دست دازی نہ کرے ورنہ اس کی عزت اور مال پر بھی حملہ ہوگا، اور بقول شاعر:

بہری مال مسلمان و چون مالت ببرند
داد و فریاد بر آری کہ مسلمان نیست

”تم مسلمان کے مال کو اٹھالے جاؤ کیونکہ وہ تمہارے مال کو اٹھالے گئے اور پھر آہ و فریاد کرو کہ وہ مسلمان نہیں ہو“
انسان کی طبیعت منفعت طلب ہے اور انسان صرف اپنے فائدہ کے بارے میں سوچتا ہے، اور اس راستہ میں کسی بھی طرح کی سعی و کوشش سے دریغ نہیں کرتا لیکن جس وقت اس کے بارے میں منافع کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو قانون کا سہارا لیتا ہے، لہذا مزاحمتوں اور اختلافات کی برطرف کرنے کے لئے اور معاشرے میں امن و تعاون قائم کرنے کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے، جو دوسروں پر ظلم و نا انصافی کرنے سے روکے، اور ہر شخص کے حقوق کو بیان کرے اور عدل و انصاف کے حدود معین ہوں تاکہ عوام الناس کو یہ پتہ چل سکے کہ کون سا فعل ظلم اور بُرا ہے اور کونسا کام عدل و انصاف کے مطابق ہے۔ ورنہ ہر شخص دوسرے کے حقوق پر تجاوز کرتا ہے اور دوسرے بھی اس کے حقوق کو پامال کرتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں نا امنی پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی آرام و سکون ملتا ہے اور نہ ہی سعادت اخروی حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی شخص اپنی فطری خواہشوں کو حاصل کر سکتا ہے۔

اسی بنا پر اسلامی نظریہ کے تحت ہماری ساری حرکات و سکنات، چاہے وہ انفرادی و شخصی زندگی سے مربوط ہو خواہ سماجی و معاشرتی زندگی کے بارے میں ہو، سب کے لئے احکام و قوانین موجود ہیں، حد ہے کہ بین الاقوامی روابط کے لئے بھی قوانین پائے جاتے ہیں، اور اسلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے قانون رکھتا ہے انہیں میں سے حقوقی اور سماجی قوانین بھی ہیں، حد ہے کہ اسلام میں انسانوں کے ذہنی خطورات کے لئے بھی قانون موجود ہے اور اسلام کا کہنا یہ ہے کہ تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہو اپنے دل میں سوچو، اور ہر طرح کا خیال کو اپنے دماغ میں لاؤ، اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرو اس لئے کہ:

﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ (۶)

بعض گمان گناہ ہیں

جس طرح صفائی اور نظافت کا خیال نہ کرنے سے بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور انسان اور معاشرہ کی سلامتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اسی طرح قوانین اسلام کا لحاظ نہ کرنے سے سماج و معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے۔

اور جو بات کھی گئی ہے کہ انسان زندگی کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو اسلامی قوانین کے دائرے سے خالی نہیں ہے، یہاں تک کہ انسان کو اپنے دل، خیال اور فکر پر بھی کنٹرول رکھنا ضروری ہے، اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان کی آزادی کو چھین لیا جائے بلکہ آزادی سے صحیح فائدہ اٹھانے کا سلیقہ اسے بتایا گیا ہے اور اس کے راستہ کا چراغ ہے، تاکہ وہ آزادی سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھا سکے، البتہ یہ قوانین اس اعتبار سے کہ انسان کی سماجی زندگی سے مربوط نہیں ہیں اور صرف اضروی سزا رکھتے ہیں؟ جو شخص اپنے مومن بھائی کے بارے میں سوء ظن رکھتا ہے اسے دنیا میں سزا نہیں ملتی بلکہ آخرت میں سزائیں ملتی ہیں۔

اگر سماجی قوانین و احکام کی مخالفت ہو اور معاشرتی مصلحتوں کو پائمال کیا جائے تو دنیا کی سزائیں رکھی گئی ہیں اور دراصل دنیاوی سزائیں تمام حقوقی قوانین کا لازمہ ہیں، اور اسلام حقوقی قوانین پر منحصر نہیں ہے، اور جو شعبہ سماجی نظام کے نظم و ضبط کے لئے قانون بنانا چاہئے وہ مجبور ہے کہ خلاف ورزیوں اور قانون شکنیوں کے بارے میں بھی سزا کو معین کرے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سماجی زندگی بغیر ایسے قوانین کے جو انسانی آزادی کو محدود کر دیں، قائم نہیں رہ سکتی ہے اور جس قدر سماجی روابط زیادہ وسیع ہوں گے اتنا ہی زیادہ سماجی قوانین کی ضرورت اور اس کے نفاذ کی ذمہ داری بڑھتی چلی جائے گی۔

حوالے

(۱) سورہ التین آیت ۴-۶

(۲) سورہ بقرہ آیت ۱۰

(۳) سورہ جاثیہ آیت ۲۳

(۴) بلعم باعور کا واقعہ علامہ فرمان علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے اپنے ترجمہ میں درج ذیل آیت کے ضمن میں بیان کیا ہے، (مترجم)

(۵) سورہ اعراف آیت ۱۷۵، ۱۷۶

(۶) سورہ حجرات آیت ۱۲

گیارہواں جلسہ قانون کے اعتبار کا معیار

۱۔ بڑے سیاسی مسائل کی عمیق تحقیق کی ضرورت

ہم اپنے گزشتہ جلسوں میں اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کر چکے ہیں اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ اس بارے میں دو طریقوں سے بحث کی جاتی ہے:

۱۔ بحث کا پہلا طریقہ جدلی ہے جس میں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ مخاطب مسلمان ہے، اسلام اور شیعیت کا عقیدہ رکھتا ہے یا کسی اور مسلک سے وابستہ ہے، اس میں تو صرف طرفین کے توافق و تفاہم کی خاطر ابتدائی اصول اور مبانی کو اصول موضوعہ قرار دیکر بحث کی جاتی ہے اور انہیں مقدمات پر اعتماد کرتے ہوئے بحث کو جاری رکھا جاتا ہے۔

۲۔ بحث کا دوسرا طریقہ برہانی ہے، جس میں بحث کو منظم، عمیق اور عقلی دلیلوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور گفتگو کے تمام اطراف و جوانب یہاں تک کہ اصول موضوعہ کی بھی تحقیق و جستجو کی جاتی ہے اور یقینی و ظاہری چیزوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے مدعا کے لئے عقلی اور غیر قابل اعتراض دلیلوں کو قائم کیا جاتا ہے۔

اگرچہ برہانی بحث خستہ کنندہ ہوتی ہے اور علمی محفلوں اور اعلیٰ تعلیم گاہوں کے لئے مناسب ہوتی ہیں اور ان کے سننے والے بھی خاص افراد ہونے چاہئے، لیکن اس بات کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ ہمارے معاشرہ میں اپنی ثقافت کو بلند کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لئے قدم اٹھائے گئے ہیں اور آج کل ہمارے بہت سے جوانوں کی معلومات خاص طور سے دینی اور سیاسی مسائل پر گزشتہ اندیشمندوں سے کھیں زیادہ ہے اسی وجہ سے برہانی و مدلل اور عمیق مباحث کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے معاشرہ کی فکری اور ثقافتی معیار میں خاص طور سے جو مراکز اصل نظام اور اسلامی اصیل عقائد سے متعلق ہیں ان میں ترقی ہو، ان میں مقابلہ کرنے اور اعتراضات کے جوابات دینے کی طاقت پیدا ہو، تاکہ دوسروں سے متاثر نہ ہوں، اسی لئے ہم اصول موضوعہ سے مربوط مطالب کو علمی اور فلسفی پیچیدہ اصطلاحوں کے بغیر سادہ طریقہ سے بیان کریں گے، اور ان عقلی عقیدوں کو ذہن میں راسخ اور مستحکم کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ اعتراضات کے سیلاب سے بہت کم متاثر ہوں۔

حکومت اور سیاسی نظام کا ایک بنیادی کام یہ ہے کہ اس کی بیک سائڈ مضبوط ہو اور وہ معاشرہ میں حقوقی قوانین جاری کرنے کی ضامن ہو، اور یہی سے اخلاقی قوانین کا حقوقی اور سیاسی قوانین سے فرق واضح ہو جاتا ہے، چونکہ اخلاقی قوانین اس لحاظ سے کہ اخلاقی ہیں ان کو الگ سے نافذ کرنے کی ضمانت کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور ہر انسان اپنے عقائد اور اپنی معنوی حیثیت کی وجہ ان کا پابند ہوتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے، لیکن حقوقی قوانین کے لئے الگ سے ضامن کا ہونا ضروری ہے حقوقی قوانین کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کو معاشرہ یا کسی ادارہ کے ذریعہ عوام الناس کے لئے جاری کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی ان کا معتقد بھی نہ ہو تو بھی اُس پر ان قوانین کی پابندی کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر کوئی ان قوانین کو ماننے سے سرپیچی کرے تو حکومت کا وظیفہ ہے کہ اس کے ساتھ طاقت و زبردستی سے پیش آئے اور اگر ضرورت پڑے تو ان قوانین کے نفاذ کیلئے اسلحہ کا بھی استعمال کر سکتی ہے۔

انہیں باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انقلاب کے بعد خاص طور سے اندرونی حالات اور بے رحمانہ قتل و غارت کے بعد نظام کے ذمہ دار افراد نے قانون مندی پر زور دیا تھاں تک کہ انقلاب کے ابتدائی سالوں میں سے ایک سال کا نام ”سال قانون“ رکھا گیا اور اب تک تمام حکومتوں نے اس اعلان کی پابندی کی ہے، اور اسی وجہ سے موجودہ حکومت کا ایک اصلی اور اہم مقصد قانون کے نعرہ کو ملکی پیمانے پر جاری کرنا اور خلاف ورزی سے لوگوں کو منع کرنا ہے، لہذا سب سے پہلے قانون اور اس کے معتبر ہونے کے بارے میں بحث کرنا ضروری ہے تاکہ اس بارے میں جو سوالات و اعتراضات درپیش ہوں ان کا قانع کنندہ جواب دیا جاسکے۔

۲۔ قانون کے معتبر ہونے کا معیار اور اس کی وسعت

بہت سے لوگوں کے سامنے یہ اعتراضات و سوالات پیش آتے ہیں کہ مثلاً قانون کس حد تک معتبر ہے اور اس کی ابتدا کھان سے ہوئی؟ اور افراد کو کس حد تک قانون کے سامنے تسلیم کرنا چاہئے؟ اور کون سا قانون اتنا معتبر ہے کہ افراد کو سو فی صد اس کا تابع اور مطیع ہونا ضروری ہے؟ بحث کو آگے بڑھانے اور ان سوالوں کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہم مسلمانوں کے نظریہ کے اعتبار سے اسلامی نظام کے تابع ہیں اور حضرت امام خمینی (رہ) اور مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی کے اقوال ہمارے لئے حجت ہیں۔

لہذا اس بات کا کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین چاہے وہ پارلیمنٹ نے بنائے ہوں یا حکومت کے کسی دوسرے ادارہ نے بنائے ہیں یہاں تک کہ قوانین کے وہ بخشنامہ جو مختلف وزارت خانوں سے ادا اور کو دئے جاتے ہیں ان سب کا نافذ کرنا ضروری ہے، اور امام خمینی (رہ) کے فرمان کے مطابق اسلامی حکومت کے تمام قوانین و مقررات لازم الاطاعت

ہیں، لہذا ہمارے لئے ان سب پر عمل کرنا ضروری ہے، اور ہم سب کو ذاتی طور پر اسلامی حکومت کے چھوٹے سے چھوٹے قوانین و مقررات کی بھرپور رعایت کرنا چاہئے اگرچہ کسی مقام پر وہ ہمارے فقہی فتوے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اور اس بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلامی حکومت کے احکام و قوانین و مقررات اور ولی امر مسلمین کی اطاعت ہم سب پر واجب ہے، اب اگر ہم قانون کے اعتبار کے معیار و ملاک کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین کے لازم الاطاعت ہونے کے بارے میں شک کر رہے ہیں بلکہ اس سے تو ہمارا مقصد فکری بنیادوں کو اس بات کے لئے مستحکم کرنا ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔

اور ہماری کوشش تو اس سوال کی وضاحت کرنا ہے کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کیوں کریں؟ اور یہ معین ہونا چاہئے کہ قانون کے معتبر و معین ہونے کی وجہ کیا ہے؟ جب حکومت کسی دن عمومی چھٹی کا اعلان کر دیتی ہے یا قوانین و مقررات کے تحت آنے والے افراد کے لئے کچھ ٹیکس معین کرتی ہے یا معمول کے مطابق کچھ احکام نافذ کرتی ہے یا جداگانہ شرائط جیسے جنگ کی شرطوں میں عمومی طور پر عوام الناس کو طلب کرتی ہے اور خاص قوانین جاری کرتی ہے کہ عوام الناس یہ جان لیں کہ وہ قوانین اور مقررات پر کیوں عمل کریں، اور صرف یہ کہ کوئی شخص حکم صادر کر دے اور عوام الناس اس کی پیروی کر کے اس پر عمل شروع کر دے، یہ کافی نہیں ہے۔

دوسری طرف سے ہماری بحث ”سیاسی فلسفہ“ سے مربوط ہے، مسئلہ قانون اور اس کا معتبر ہونا اور اس کی اطاعت کا لازم ہونا یہ تمام سیاسی نظاموں کی بنیادی بحثوں میں سے ہے اور یہ صرف اسلامی نظام سے مخصوص نہیں ہے، ”فلسفہ سیاست اور فلسفہ حقوق“ سے تقریباً سبھی لوگ واقفیت رکھتے ہیں، اور محققین اور ماہرین حضرات نے معارف بشری کے ان دو موضوعات کو بیان کرنے میں بڑی کوششیں اور محنتیں کی ہیں اور مختلف نظریات کو مناسب دلیلوں کے ذریعہ بیان کیا ہے، لیکن پھر بھی آج تک وہ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے جو بہانی اور مدلل ہو، اور مکمل طور سے قانع کنندہ ہو تاکہ اس کا دفاع کیا جاسکے، اور قانون کے معتبر ہونے کے باب میں ان محققین نے مندرجہ ذیل تین اہم نظریات قائم کئے ہیں:

الف: نظریہ عدالت

بعض محققین نے قانون کے معتبر ہونے میں عدالت کو معیار قرار دیا ہے، کہ اگر کوئی قانون عدالت اور عوام الناس کے حقوق کی رعایت کی بنیاد پر بنایا جائے گا تو وہ معتبر ہوگا اور عوام الناس پر اس کی اطاعت کرنا واجب ہوگی، لیکن اگر قانون عدل کی بنیاد پر نہ بنایا گیا ہو بلکہ غیر عادلانہ طور پر بنایا گیا ہو تو وہ قانون معتبر نہیں ہے۔

ب: معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنا

قانون کے معتبر ہونے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ قانون معتبر ہے کہ جو معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے، کیونکہ معاشرہ کے افراد اجتماعی زندگی سے سروکار رکھتے ہیں جن میں ان کی مخصوص ضرورتیں ہوتی ہیں اور ان میں ان کا کوئی فردی اور ذاتی پہلو نہیں ہوتا ہے، اگرچہ تمام لوگوں کو ان ضرورتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے لیکن اصل میں وہ لوگ اجتماعی ہیں اور اجتماعی زندگی کی شرطوں کا خیال رکھتے ہیں، مثال کے طور پر عمومی نظافت کی رعایت کرنا معاشرہ کی ایک اہم ضرورت ہے اگرچہ ہر شخص اگر وہ چاہے تو اپنی ذاتی زندگی اور گھر کی چھار دیواری کے اندر رہ کر اس کی رعایت کر سکتا ہے۔

لیکن عمومی نظافت کی رعایت کرنے کی خاطر ہر شخص کو اس کی رعایت کرنے پر آمادہ کرنا ایک مشکل کام ہے اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فرد کے عملی اقدام سے بالاتر کوئی ادارہ یا قانون موجود ہو جو عمومی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ مثال کے طور پر اگر معاشرہ میں وبا اور طاعون جیسی خطرناک بیماریاں پھیل جائیں تو ان بیماریوں پر کنٹرول کرنے کے لئے فردی اقدامات سودمند ثابت نہیں ہو سکتے بلکہ اس چیز کی ضرورت پیش آئے گی کہ حکومتی پیمانہ پر کسی ادارہ کی طرف سے بیماری پر کنٹرول کرنے اور عمومی نظافت کو ایجاد کرنے کے لئے واکسن (سوئی) وغیرہ لگائے جائیں۔ تو حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قوانین وضع کر کے اگرچہ وہ موسم کے لحاظ ہی سے کیوں نہ ہوں، لوگوں کو اس بات کا پابند بنادے کہ فلاں مدت تک سب کو واکسن لگوا لینے چاہئے، (جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قانون سے ہماری مراد عام معنی ہیں جو تمام لازم الاجراء دستور العمل اور آئین نامہ وغیرہ کو بھی شامل ہوتا ہے)

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا چونکہ عمومی نظافت معاشرہ کی ضرورت ہے اور اس کی رعایت کرنا ایک اجتماعی ضرورت ہے، لہذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کچھ خاص قوانین بنائے گئے ہیں، اور سب پر ان قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح اپنے مقام و محل زندگی کے اچھے اور سالم رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے کچھ اذارے معین کئے گئے ہیں جو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کا اقدام کرتے ہیں اور عوام الناس پر بھی ان اداروں کی طرف سے صادر ہونے والے قوانین اور دستور العمل کی پیروی کرنا لازم ہوتا ہے، نتیجہ کے طور پر حکومت کی طرف سے بھی ادارے معین کئے گئے ہیں جیسے تعلیمی ادارے، نظافت و معالجہ کے ادارے، وزارت خزانے، اور ان کے دستور العمل جو معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اسی بنا پر ان کو شرعی حیثیت ہے لہذا ان کے دستورات کے مطابق ہر فرد پر عمل کرنا واجب ہے۔

ج: عوام الناس کی چاہتی ہے

بعض محققین قانون کے معتبر ہونے کا معیار و ملاک عوام الناس کو خواہش سمجھتے ہیں ان کے نظریہ کے مطابق قانون معاشرہ کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے، لہذا جب بھی عوام الناس کوئی چیز حکومت اور قانون بنانے والے ادارہ سے طلب کرے تو حکومت کے پارلیمنٹ میں عوام الناس کے نمائندے عوام الناس کی خواہش کے مطابق قانون بنائیں، اور چونکہ جب قانون لوگوں کی خواہش کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے، تو پھر عوام الناس کا بھی فیض یہ ہے کہ اس کی پیروی اور اس کی حفاظت کرے اور اس سلسلہ میں بھرپور کوشش کرے، درحقیقت عوام الناس کی عینی خواہش کا متحقق ہونا پارلیمنٹ کے ممبروں کا منتخب کرنا ہے اور ان کو چاہئے کہ وہ عوام الناس کی خواہش کے مطابق قوانین بنائیں، اس بنا پر اگر عوام الناس کے منتخب کئے ہوئے نمائندے قانون بنانے کا حق نہ رکھتے ہوں تو عوام الناس کی طرف سے ان کا منتخب کرنا بے فائدہ اور بے سود ہوگا، اور اگر ان کو قانون بنانے کا حق ہو لیکن ان کی جانب سے وہ قانون لازم الاجراء نہ ہو تو قانون گزاری ایک عبث امر ہوگا۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ قانون کے اعتبار کے سلسلہ میں حقوق و سیاست کے کے فلاسفہ کے نظریات کا خلاصہ تھا، اور یہ فطری تقاضا ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے ناطے قانون کے معتبر ہونے کا معیار خداوند عالم کی طلب اور مرضی جانتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس چیز کا خداوند عالم نے حکم دیا ہے وہی قانون شمار کیا جائے گا اور اسی کو معتبر سمجھا جائے گا، البتہ یہ آخری نظریہ وہ لوگ مانتے ہیں جو خداوند عالم کو قبول کرتے ہیں۔

(ہم مندرجہ بالا نظریوں کی تفصیلی طور پر تحقیق و تنقید اور تجزیہ و تحلیل کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں اور صرف اسی تحقیق اور تنقید پر اکتفاء کرتے ہیں جو عام افراد کی فہم و درک کے مناسب ہے)

۳۔ پہلے نظریہ پر اعتراض

پہلے نظریہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے میں عدالت کا رعایت کرنا ضروری ہے، یہاں پر ایک بنیادی سوال یہ پیش آتا ہے جس کو دنیا کے بڑے بڑے محققین نے بھی بیان کیا ہے اور اس سوال کے جواب میں انھوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ عدالت کیا ہے اور عدالت کیسے متحقق ہوتی ہے؟ درحالیکہ عدالت کا مفہوم سب کے لئے واضح ہے پھر بھی سیاسی اور حقوقی نظریہ بیان کرنے والوں کے لئے یہ سوال اتنا وسیع ہو گیا اور ان کو اس بھنور میں پھنسا دیا، لیکن یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے عدالت کا مطلب مختلف نکالا ہے۔

اگر تمام لوگ معاشرہ کے مال و دولت سے برابر استفادہ کریں تو عدالت قائم ہوگی یا نہیں؟ یعنی اگر ایک سیاسی نظام ان تمام مقدمات و وسائل کو فراہم کر دے کہ تمام افراد گھر، لباس اور سواری وغیرہ کے اعتبار سے بالکل مساوی طور پر استفادہ کریں تو

عدالت برقرار ہے ورنہ ظلم ہے؟ اس طرح کی چیزیں مکتب ”مارکسیسم“ (سیاست و معاش کا مسلک) میں وقوع پذیر ہوئیں اور آخر کار ”کیونیزم“ کا نظریہ پیدا ہوا۔

اور اس نظریہ کو بیان کرنے والوں نے یہ اعلان کئے کہ ہم ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جس میں کوئی طبقہ بندی نہ ہو، اور اس معاشرہ کا ہر فرد اپنی طاقت و قدرت کے لحاظ سے کام کرے، اور اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرے، اس کے بعد وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان چیزوں کو عمل کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مندرجہ بالا نظریہ کی طرف ہونے کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا انہیں مشکلات میں سے عدالت کے مقابلہ میں آزادی آگئی تھی، اسی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے نظریہ کا پھر سے بغور مطالعہ کیا اور کچھ تنزل کرتے ہوئے اپنے اعلانات میں ”سوسیالسم“ (عمومی سھولتیں) حکومت کو اپنایا، جب کہ وہ کیونیزم حکومت کا ایک نمونہ کے طور پر بیان کر رہے تھے۔

جس وقت مارکسیسم نے یہ دیکھا کہ لوگوں کی اکثریت پر خاص طور پر مزدوروں اور کسانوں پر ظلم ہو رہا ہے تو اس نے اس بے عدالتی اور ظلم سے منع کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو وہ امور انجام دینا چاہئیں کہ حقوق کے اعتبار سے تمام افراد یکساں استفادہ کریں یعنی معاشرہ میں کوئی طبقہ بندی نہ ہو، اور سب کے درمیان بطور کامل مساوات ہو سب ایک دوسرے کے لئے نمونہ عمل ہوں اور سب کے لئے زمین جنت کے مانند ہو، ادھر بعد مسلمانوں نے اس میں ایک لفظ کا اور اضافہ کر دیا اور کہا ”توحید کے اعتبار سب لوگ ایک ہوں“ تو اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا عدالت کا مطلب یہی ہے کہ تمام افراد ایک جیسے اور برابر ہوں؟

اس کے مقابلہ میں بعض محققین کا عقیدہ یہ ہے کہ عدالت کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد اپنی محنت و زحمت کے مطابق معاشرہ سے استفادہ کرے، یعنی اگر کوئی شخص کسی کام کو انجام دیتا ہے تو اس کو اس کی محنت کے مطابق مزدوری ملنا چاہئے، اب اگر کوئی شخص کاہلی اور سستی کرے اور کوئی کام انجام نہ دے تو اس کو دوسروں کی زحمت کے برابر استفادہ نہیں کرنا چاہئے اور اجتماعی منفعتوں کو اس کے حوالے نہ کیا جائے اس بھانہ سے کہ عدالت ایجاد ہو سکے۔ اور جب عدالت ایجاد ہو جائے گی تو جو افراد کام انجام دیں گے وہ اپنے کام کی مزدوری حاصل کر لیں گے اب اگر کوئی اپنی محنت و کوشش سے زیادہ کام کرے اور اس کو اس کام کا کوئی نتیجہ نہ ملے تو یہ اس کے حق میں ظلم ہوگا۔

۲۔ اسلامی قوانین کی برتری

بغیر کسی شک و شبہ کے عدالت کی دونوں مندرجہ بالا تفسیریں (کہ جن کو نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا) مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف اور مقام عمل میں ناہم اہنگ ہیں، جن سے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ احکام، عقائد اسلامی اور مسائل توحید سے سازگاری نہیں رکھتے، نمونہ کے طور پر ہمارے دین اسلام میں بہت سے ایسے احکام ہیں جو خود ہمارے عقیدہ کے مطابق معاشرہ کے لئے بہت رین

اور سب سے زیادہ مفید ہیں اور مسلماً عدالت کے مطابق ہیں لیکن دنیا کے بہت سے افراد ان کو نہیں مانتے اور نہ ہی ان کو عادلانہ سمجھتے ہیں، مثال کے طور پر بہت سے مقامات پر ارث کے مسئلہ میں مرد و عورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے اگرچہ بعض مقامات میں ان دونوں کی میراث بھی مساوی اور برابر ہے اور اس فرق کی نص صریح قرآن مجید کی یہ آیت ہے: (فَلِلْمَرْثَةِ مِثْلُ حَظِّ الْمَوْلَاةِ نِثْنِ).^(۱) ”مرد کو عورت کے حصہ کے دو گنا ملے گا“

اس میں کوئی شک شبہ نہیں ہے کہ جو افراد اسلام کے نظریات اور اعتقادی اصول کی معرفت نہیں رکھتے وہ اس طرح کے قانون کو ظالمانہ قانون سمجھتے ہیں، چونکہ ان کے نظریہ کے مطابق خداوند عالم مرد و عورت کے درمیان تبعیض کا قائل ہے، دوسری طرف یہ کہ گھریلو مشترک زندگی میں اسلام نے مرد کو اس بات کا مکلف قرار دیا ہے کہ وہ مشترک زندگی کے تمام مخارج خواہ وہ عورت کے کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا لباس ہو یا گھر، سب کچھ مرد کو ہی پورا کرنا ہے، اور اسلامی نقطہ نظر سے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمام درآمد کو بینک میں جمع کر دے اور اس کی میراث اور اس کی درآمد کا خود اسی سے متعلق ہو، اور اس پر اپنی زندگی کے لئے کچھ بھی خرچ کرنا لازم نہیں ہے اور اس کو اپنے گھر کے تمام خدمات جیسے لباس دھونا، کھانا بنانا، یہاں تک کہ بچہ کو دودھ پلانے کی مزدوری لینے کا بھی حق ہے، البتہ جو افراد نزدیک سے اسلام کو نہیں جانتے جب وہ اس طرح کے احکام کو دیکھتے ہیں اگر انصاف سے کام بھی لیں تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلام نے عادلانہ قانون نہیں بنائے ہیں۔

ان تھمتوں کو دور کرنے اور اسلام کے احکامات کی مناسب وضاحت کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کے قوانین عادلانہ ہیں یا نہیں؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم عدالت کے کیا معنی کرتے ہیں، کیونکہ اگر عدالت کے معنی مساوات ہے تو تمام قوانین غیر عادلانہ ہیں اس لئے کہ ان میں مساوات کی رعایت نہیں کی گئی ہے، اور اگر عدالت کے کوئی اور معنی ہیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ معنی کیا ہیں؟ البتہ عدالت کی ماہیت اور کیفیت کی معرفت حاصل کرنا اور عدالت کا مستحق کرنا آسان کام نہیں ہے اسی وجہ سے بڑے بڑے فیلسوف حضرات نے عدالت کے بارے میں بڑی بڑی تحقیقات کی ہیں اور ان میں سے بعض نے عدالت اور آزادی کے درمیان رابطہ کی تحقیق کی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر ہم قانون کے معتبر ہونے کا ملاک و معیار عدالت قرار دیں تو ہماری مشکل رفع نہیں ہوگی اور ہمارے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ آتا ہے کہ عدالت سے کون سے معنی مراد ہیں؟ کیونکہ ہر انسان اپنے لحاظ سے عدالت کے معنی اور تفسیر کرتا ہے، اور اسی بنا پر قانون کو عادلانہ اور معتبر سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتا ہے اس کے مقابلے میں دوسرا انسان عدالت کی اپنی تفسیر کے بنا پر اس قانون کو غیر عادلانہ اور غیر معتبر سمجھتا ہے۔

قانون کے معتبر ہونے کا دوسرا معیار یہ تھا کہ اس سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے، البتہ یہ معیار کسی حد تک قابل قبول ہے چونکہ تمام افراد کم و بیش اجتماعی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں، اور یہ جانتے ہیں کہ معاشرہ کو کن چیزوں کی ضرورت ہے، خاص طور سے جس معاشرہ میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں اور ہم سے پہلے جس معاشرہ میں ہمارے آباء اجداد زندگی بسر کرتے تھے یقیناً ایسا قانون اور حاکم موجود تھا جو ضرورتوں کو درک کرے اور اس کو یہ معلوم تھا کہ کس طرح معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

اس نظریہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ معاشرہ کی ضرورتوں کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاسکتا ہے اور یہی امر قانون کو منظم کرنے میں فرق کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شہر کو خوبصورت اور اچھا بنانا اور اس کو صاف ستھرا رکھنا ایک عام ضرورت ہے اور اس ضرورت کو ضرور پورا ہونا چاہئے، لیکن اس کا خرچ کھاں سے آئے؟ تو کیا گھر کے ہر فرد پر کچھ خاص رقم رکھی جائے اور اس کو جمع کیا جائے؟

یعنی گھر کے ہر فرد کو اس بات کا پابند بنادیا جائے کہ وہ شہر کی نظافت اور اس کو صاف و ستھرا رکھنے کی بابت کچھ رقم ادا کرے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شہر کے جاری مخارج کو عمومی سرمایہ سے پورا کیا جائے یعنی وہی سرمایہ جو عام طور سے مالی ٹیکس کے ذریعہ جمع کیا جاتا ہے اور اکثر وہ سرمایہ مالدار لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے، اور جو غریب لوگ شہر کے پسماندہ علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کے مکانات نامناسب ہوتے ہیں تو وہ اس ٹیکس کے ادا کرنے سے معاف ہوتے ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حکومت اس چیز کی پابند ہوتی ہے کہ وہ زمین کے اندر سے نکلنے والی چیزیں جیسے تیل، لوہا، وغیرہ ان کو فروخت کر کے ان کی وصول کی گئی رقم سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرے۔

ان تمام باتوں کے باوجود قانون کے معتبر ہونے کا معیار معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا بیان کیا گیا ہے اور مندرجہ بالا نظریات میں سے ہر ایک نظریہ معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے تو ان میں سے کس نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جائے اور معتبر قانون کے عنوان سے پیش نظر رکھا جائے اور عوام الناس کون سے قانون کو سب سے زیادہ صحیح اور عادلانہ سمجھتے ہیں؟ لہذا صرف یہ معیار بھی قانون کو معتبر مشخص کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔

۶۔ تیسرے نظریہ کی کمی اور اسلامی لحاظ سے ضرورتوں کی وسعت

تیسرے ملاک کے اعتبار سے صرف وہی چیزیں جس کو عوام الناس معتبر سمجھتی ہے اور جس کو وہ طلب کرتے ہیں وہ ایک قانون کی صورت میں جاری ہونا چاہئے، یہاں پر ایک سوال یہ پیش آتا ہے کہ کیا معیار یہ ہے کہ تمام لوگ سو فی صد کسی ایک ہی چیز کو طلب کریں؟ اور یقیناً ایسا نہیں ہوتا ہے کہ تمام لوگ کسی ایک چیز پر متفق ہو جائیں اور شاید لاکھوں قوانین میں سے کوئی ایک قانون بھی ایسا نہ ہو کہ جس کی تمام افراد نے سو فی صد موافقت کی ہو اور ایک قانون چاہے عام طور پر لوگوں کے من پسند ہی کیوں

نہ ہو پھر بھی کم سے کم ایک دو فی صد افراد اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں، اس بنا پر مخالفت کرنے والوں کے لئے قانون کے معتبر ہونے کا ملاک کیا ہے؟

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جو کچھ عوام الناس چاہتے ہیں، وہ عدالت کی میزان پر پوری نہ ہو تو کیا وہ قانون معتبر نہیں ہے؟ اسی طرح اگر عوام الناس کا مطالبہ دوسرے معیار سے اختلاف رکھتا ہو، یعنی عوام الناس کے مطالبہ معاشرہ کو ضرورتوں کو پورا رکھنے والی ضرورتوں میں شامل نہ ہو تو کیا وہ پھر اعتبار رکھتا ہے؟ اگر کسی قانون میں یہ لازم کیا جا رہا ہو کہ عوام الناس سے کچھ رقم وصول کی جائے تو شاید اکثر افراد اس کی مخالفت کریں چونکہ جب نئے ٹیکس مقرر کئے جاتے ہیں تو عوام الناس اس کو زبردستی قبول کرتے ہیں (یعنی بڑی مشکل سے مانتے ہیں)۔ معمولی طور پر کسی بھی جگہ بھی قانون مالیات کو عام طور پر خوشی سے قبول نہیں کیا جاتا، جب کہ یہ طے ہے کہ حکومت معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یہ رقم وصول کرتی ہے، تو عوام الناس بڑی مشکل سے اس کو قبول کرتی ہے۔

اس صورت میں اگر لوگوں کی خواہش کی مطابق عمل کیا جائے تو معاشرہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں، جبکہ ایک نظریہ میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، اور جب لوگوں کا مطالبہ عام ضرورتوں کو پورا کرنے کے منافی ہو تو کیا اس وقت معاشرہ کی مصلحتوں کو مد نظر رکھا جائے یا اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے؟ بغیر کسی شک و شبہ کے قانون بنانے والے اور جو لوگ معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ عملی طور پر مشاہدہ کرتے ہیں، کہ اگر ان موقعوں پر اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ کسی عمل میں پیشرفت نہیں کر سکتے، (البتہ یہ بحث ڈیموکریسی (جمہوریت) کے اصول کی طرف پلٹ جاتی ہے جس کو ہم آئندہ تفصیل سے بیان کریں گے)

بہر حال اس طرح کے اعتراضات قانون کے معتبر ہونے کے معیار و ملاک پر پیدا ہوتے ہیں، البتہ ہمارے نظریہ کے مطابق سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ مصلح اور ضرورتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ صرف عادی ضرورتیں بیان ہوئی ہیں اور عام معیار بھی ہے کہ معاشرہ میں انسان کی صرف بھی ضرورتیں مستحق ہونا چاہئیں؟ کیا حکومت کا صرف بھی وظیفہ ہے کہ وہ لوگوں کی صرف مادی اور دنیاوی ضرورتوں کو ہی پورا کرے یا حکومت کے دوسرے فرائض بھی ہوتے ہیں؟ اس سے واضح الفاظ میں عرض کریں کہ ہم تمام مسلمانوں اور وہ تمام افراد جو ادیان الہی میں سے کسی ایک دین کو مانتے ہیں ہم سب کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک بدن اور دوسرے روح، اور اکثر یا تمام ادیان کا نظریہ یہ ہے کہ روح بدن سے افضل و اشرف ہے اور بدن روح کا خادم ہے۔ ان سب کا عقیدہ یہ ہے کہ بدن کو نظافت کی ضرورت ہے اور بدن کو بیمار ہونے سے بچانا ضروری ہے اور اگر بدن مریض ہو جائے تو اس کا علاج کرنا چاہئے، اسی طرح انسان کی روح کو بھی نظافت کی ضرورت ہے، اور بیمار ہونے سے اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اور اگر مریض ہو جائے تو اس کا علاج بھی ضروری ہے، اگر ہم مادی ضرورتوں کا معنوی ضرورتوں

سے مقابلہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ روحی اور معنوی ضرورتیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، روح کی بیماری بدن کی بیماری سے بہت زیادہ خطرناک اور اہمیت رکھتی ہیں، کیونکہ انسان کی انسانیت کا امتیاز اس کی روح کی وجہ سے ہی ہے اور اگر اس کی روح مریض ہو جائے تو وہ انسانیت سے گر جاتا ہے، تمام حیوانات بھی بدن رکھتے ہیں اور اس کو سالم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی مادی اور جسمانی لذتوں کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جو کچھ انسان سے مخصوص ہے اور جوہر انسانیت کو اُجاگر کرتا ہے وہ ہے انسانی روح، اب اگر انسانیت کے معیار کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو انسان کی حقیقی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَيِّتًا فَآ حَيِّنَا وَجَعَلْنَاهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (۲)

”کیا جو شخص پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں بے تکلف چلتا پھرتا ہے اس شخص کا سا ہو سکتا ہے جس کی یہ حالت ہے کہ (ھر طرف سے) اندھیروں میں (پہنسا ہوا ہے) کہ وہاں سے کسی طرح نکل نہیں سکتا، (جس طرح مومنوں کے لئے ایمان آراستہ کیا گیا ہے) اسی طرح کافروں کے لئے ان کے اعمال (بد) آراستہ کردئے گئے ہیں“

مندرجہ بالا مطالب کو مد نظر رکھتے ہوئے جو حکومت معاشرہ کی مصلحتوں کو پورا کرنے کے درپے ہے تو کیا اس کو عوام الناس کے روحی اور معنوی امور کی طرف توجہ نہیں دینا چاہئے؟ کیا حکومت کا صرف یہی وظیفہ ہے کہ وہ لوگوں کی صرف مادی ضرورتوں کو پورا کرے، یا معنوی مصلح کو پورا کرنا بھی حکومت کا ہی فریضہ ہے؟

۱۔ اسلامی انقلاب اور اس کا معنوی مصلحتوں سے برتر مقام

یہاں پر ایک پیچیدہ مسئلہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر معنوی اور مادی پیشرفت میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو دونوں میں سے کس کو مقدم کرنا چاہئے؟ اگر کسی خاص زمان و مکان میں معاشرہ کی مادی پیشرفت، معنوی مصلحتوں کو چھوڑ دینے کا سبب بنے اور اگر مادی اور اقتصادی وسعت اور معنوی مصلحتوں کو پورا کرنے میں تزام (یعنی ایک دوسرے کے روبرو ہونا) پیدا ہو جائے، تو کیا حکومت مادی وسعت کو محدود کر سکتی ہے تاکہ معنوی مصلحتیں بھی محفوظ رہ جائیں یا یہ کہ معنوی پیشرفت کا حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہے اور حکومت کا وظیفہ صرف مادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے اور معنوی مصلح کو پورا کرنا خود عوام الناس کی ذمہ داری ہے؟ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور ہماری اجتماعی زندگی میں عملی نتیجہ رکھتا ہے، اور آج کل بڑے بڑے اخباروں اور خبروں میں شایع کیا جاتا ہے اور اس سے متعلق بڑے بڑے مناظرہ اور بحثیں ہوتی ہیں۔

کچھ افراد کہتے ہیں: حکومت کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ سیاست، معاش اور فرہنگ و ثقافت میں وسعت دے، وسعت کا مطلب وہی ہے جو عرف عام میں مشہور ہے اس بنیاد پر ثقافتی وسعت کے وہ مصادیق ہیں جن کو خاص طور سے ہم معنوی مصلحتوں کے لئے بیان کرتے ہیں اس سے مختلف ہے اور اس سے مراد قومی میراث کی حفاظت کرنا اور ورزش اور موسیقی جیسے امور میں وسعت کرنا ہے۔

بلا کسی شبہ جو افراد دین اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اور انقلاب اسلامی کے طرفدار ہیں، مصلح معنوی کی ایک خاص اہمیت کے قائل ہیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انقلاب برپا کرنے کا اصلی ہدف معنوی مصلح کی حفاظت کرنا تھا۔ البتہ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اسلام کے زیر سایہ ہی مصلح مادی بھی پورے ہوں۔

اگرچہ کچھ زمانہ ہی کیوں نہ لگ جائے ان سب باتوں کے باوجود ہماری قوم نے معنوی اور الہی پختہ اعتقاد اور معنوی مصلح کی حفاظت کی خاطر عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ ہم معاشی ناکابندی اور مہنگائی اور دوسری مشکلات کے باوجود زندگی بسر کر سکتے ہیں، ان کے عزیز و اقارب اسلام کی خاطر قربان ہو سکتے ہیں، عورتیں بغیر شوہر اور بچے بغیر باپ کے ہو سکتے ہیں جیسا کہ شہیدوں کے وصیت ناموں سے اس بات کا مسلم ثبوت ملتا ہے کہ ان کا ہدف اسلام کی حفاظت اور معنوی مقاصد کو برقرار رکھنا تھا۔

جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے لئے مصلح مادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ دوسرا معیار و ملاک بھی موجود ہے اور وہ مصلح معنوی کی ضرورت کو پورا کرنا ہے اور اگر معاشرہ کی مصلحتوں کو پورا کرنے کو ہم قانون کے معتبر ہونے کا ایک معیار جان لیں تو ہمارے لحاظ سے ”مصلح“ مصلح مادی و مصلح معنوی دونوں کو شامل ہوگا۔ البتہ معاشرے کے مصلح کی تحقیق و جستجو اور اس کے مصداق کو معین کرنا ایک عمیق اور سلسلہ وار بحث ہے یہ اس سے بھی کھیں زیادہ وسیع ہے جو فلسفہ سیاست اور حقوق میں بیان کی جاتی ہے اور وہ بحث اس بات پر موقوف ہوتی ہے کہ کیا حقیقت میں انسان مادی امور کے علاوہ مصلح واقعی بھی رکھتا ہے یا یہ کہ انسان کے مصلح وہی مصلح مادی ہی ہیں اور اس کے علاوہ کچھ آداب و رسومات ہیں کہ جو کبھی کبھی بدلتے رہتے ہیں اور دوسرے معنوی مصلح اور اہم ضرورتوں کے وجود میں کچھ نہیں ہیں؟ کیا مصلح اور واقعی ضرورتیں وہی مادی امور جو علمی تجربوں سے انجام پاتے ہیں اور مادی طریقوں سے ہی ان کو معین کیا جاتا ہے جیسے نظافت، معاش میں پیشرفت کرنا صنعت اور ٹکنالوجی یا اس کے علاوہ دوسرے مصلح روحی و معنوی بھی موجود ہیں، جو تجربہ حسی کے قابل نہیں ہیں۔

البتہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ واقعی و مصلح وہی معنوی و روحی مصلح ہیں جو ”متافیزیک“ (حکمت ماوراء الطبیعة) سے متعلق ہوتے ہیں اور اصطلاح میں وہ علمی مسائل کا جز نہیں ہوتے اور علمی طریقے سے قابل اثبات نہیں ہوتے ہیں، لہذا نتیجہ کے طور پر اگر ہم یہ بیان کریں کہ معاشرہ میں معنوی مصلح کی ضرورت کو پورا کرنا چاہئے اور ان کو پورا کرنا حکومت کا وظیفہ ہے اور ہم ایک برہانی اور

مدلل بحث پیش کرنا چاہیں تو ہم کو اس مسئلہ کو ضرور بیان کرنا چاہئے کہ ہمارے مادی مصلح کے علاوہ کچھ اور بھی مصلح رکھتے ہیں یا نہیں؟۔

حوالہ

۱۔ سورہ نساء آیت ۱۷۶

۲۔ سورہ انعام آیت ۱۲۲

بارہواں جلسہ

اقدار کے بارے میں اسلام اور مغربی تمدن میں نظریاتی فرق

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہماری بحث کا موضوع اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرنا تھا جس کے چند فرضیہ تھے اور اس نظریہ کو عقلی طور پر ثابت کرنے کے لئے ان مقدموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر ان کے بارے میں بحث ہونا چاہئے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ اسلام کے سیاسی نظام میں خدا کا قانون کسی ایسے شخص کے ذریعہ جاری ہونا چاہئے، اور حکومت کا ذمہ دار اس شخص کو ہونا چاہئے جو خدا کے طرف سے منصوب ہو اور خدا کی طرف سے اس کو اجازت دی گئی ہو، مندرجہ بالا نظریہ کے بارے میں مندرجہ ذیل مقدموں کی ضرورت پیش آتی ہے:

پہلا مقدمہ: معاشرہ کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے۔

دوسرا مقدمہ: قانون خدا کی جانب سے نازل ہونا چاہئے۔

تیسرا مقدمہ: ان قوانین کا اجرا کرنا لازم ہے اور ان کی جاری کرنے والی اسلامی حکومت ہے۔

(مندرجہ بالا مقدموں کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمان افراد مندرجہ بالا نظریہ کو قبول کرنے میں کوئی شک و شبہ نہیں کریں گے، لیکن بحث کو واضح کرنے کے لئے اور دوسرے افراد پر بھی حق ظاہر ہونے کے لئے ان مقدموں کو عقلی استدلال کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے)

معاشرہ میں قانون کا ہونا ضروری ہے تو جہاں تک ہم کو علم ہے کوئی شخص بھی اور وہ افراد بھی جنہوں نے اس بارے میں بحث کی ہے وہ اس میں شک نہیں کرتے کہ بشر کو اپنی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے قانون کی ضرورت ہے لیکن معاشرہ میں کس قانون کو حاکم ہونا چاہئے اس بارے میں بہت زیادہ اختلاف پائے جاتے ہیں اور اس بنیاد پر قانون کے معتبر ہونے کے بارے میں فلاسفہ حقوق اور حقوق داں حضرا نے بہت زیادہ تحقیق و جستجو کی ہے اور ہم کس بارے میں بہت ر قوانین اور دوسروں سے برتر قوانین کو مشخص و معین کریں اس بارے میں ہم نے گذشتہ جلسہ میں قانون کے معیار و ملاک کو بیان کرنے کی خاطر تین اہم نظریوں کی طرف اشارہ کیا تھا، البتہ اس بارے میں دوسرے نظریات بھی ہیں لیکن وہ اس اہمیت کے قابل نہیں ہے کہ ان کے بارے میں بحث کی جائے۔

قانون کے معیار و ملاک کے بارے میں پہلا نظریہ عدالت اور قانون کا اصول عدالت کے موافق ہونا ہے اور ہر وہ قانون جس میں جتنا عدل ہوگا اسی کو معاشرہ میں جاری ہونا چاہئے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ قانون بہت ر اور برتر ہے جو معاشرہ کے نظام اور انیت کو پورا کر سکے، اور آخر کار تیسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ قانون بہت ر اور برتر ہے جو لوگوں کی زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے،

یہ تین نظریہ ان افراد کے مقابل میں ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ بُرے قانون کو اچھے قانون سے اور بہت ر قانون کو برے قانون سے تشخیص و تعین کرنے کا کوئی بنیادی معیار نہیں ہے، اور صرف معیار و ملاک لوگوں کی خواہش ہے: معاشرہ جس چیز کو پسند کرے وہ بہت رہے اور قانون بھی اسی بنیاد پر بننا چاہئے، یہ ”پوزیٹو“ (مثبت) نظریہ ہے جو ہماری نظر میں بالکل واضح طور پر باطل ہے اس لئے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہر دن جس شخص کا جو دل چاہے وہی قانون برقرار ہو جائے بلکہ ایک عقلی معیار ہونا چاہئے تاکہ اس کے بارے میں کوئی بحث کر کے کسی منطقی نتیجہ پر پہونچا جاسکے۔

۲۔ دین کی نظر میں بہت رین قانون اور دوسروں کے نظریہ کے تحت تاثیر واقع ہونے کا خطرہ

دین اسلام کی نظر میں وہ قانون سب سے اچھا اور سب سے بلند قانون ہے جو انسانوں کی مادی اور معنوی ضرورتوں کو پایہ تکمیل تک پہونچائے اور ایسا قانون ہو کہ اس قانون کے سایہ میں انسانوں کی مادی اور معنوی ضرورتوں کو چاہے وہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں سب سے اچھے طریقہ سے فراہم ہو سکتی ہوں اس نظریہ کا دوسرے نظریوں سے فرق یہ ہے کہ اس میں معنوی مصلح کو بہت زیادہ تاکید اور انہر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔

لیکن افسوس کہ ”رنسانس“ (وہ نظریہ جو یورپ میں پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع میں پیدا ہوا اور ان کا نظریہ گذشتہ آثار کی تقلید کرنا تھا) کے بعد ”اومانیسٹی“ کو تقویت ملی اور اہستہ اہستہ انسان کے ذہن سے خدا اور معنویت اور آخرت سے اس کی توجہ ہٹ گئی اور علمی سطح سے خارج ہو گیا، اور آخر کار ان سب چیزوں کو بھلا بیٹھا، اگرچہ کھیں گوشہ و کنار میں محدود دائرے میں معنوی امور پر بھی اعتماد کیا جاتا تھا، لیکن دنیا کی فلسفی اور حقوقی محفلوں میں اصلی اعتماد اور مسلط رغبت یہ ہے کہ ایسا قانون ہونا چاہئے جو انسانوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کر سکے، درحالیکہ معنوی ضرورتوں سے اس کا کوئی سروکار نہ رکھتا ہو، البتہ ہمارے نظریہ کے اعتبار سے یہ بات واضح ہے کہ قانون و معنوی ضرورتوں پر بھی بھرپور توجہ رکھنا چاہئے، اس لئے کہ انسان کے وجود کا سب سے اہم اور اصلی جز روحی، معنوی اور الہی اشیاء پر کامل یقین ہے اس بنیاد پر ہم اس بلند و بالا پہلو اور مصلح معنوی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اب ہمارا موضوع بحث یہ ہے کہ کیا قانون کو معنوی ضرورتوں پر توجہ دینا ضروری ہے یا نہیں؟

اس بات کی تاکید اور اس بارے میں بحث کرنا دلیل انحرافی کے ذریعہ جو آج کل التقاط فکری کی وجہ سے مختلف سطح کے افراد میں وقوع پذیر ہوئی ہے ہم اس مطلب کی اوز زیادہ وضاحت کے لئے ایک مثال کے ذریعہ کر دینا چاہتے ہیں، فرض کیجئے کہ جسم کے سلسلے میں بعض محققین اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اس علم کے اعلیٰ درجات پر پہونچے ہوئے ہیں جیسے ”انشٹن“ ایسے ہی افراد جسم کے بارے میں اظہار خیال کر سکتے ہیں۔

لیکن اگر انہیں سے نفسیاتی علم کے بارے میں کسی نظریہ کی تائید یا رد کے بارے میں خود ان کا نظریہ مانگا جائے تو وہ اپنا نظریہ نہیں دیتے ہیں، کیونکہ ان کو اس علم میں مہارت نہیں ہے اور اگر نظریہ دیں تو بھی اس علم کے ماہرین سے مشورہ اور معلومات حاصل کر کے اپنی زبان کھولتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اس علم میں مہارت حاصل نہیں کی ہے، اسی طرح وہ افراد جو کسی علم میں مہارت نہیں رکھتے صاحب نظر افراد کے کسی نظریہ کی تائید کی بنا پر کسی نظریہ کی تائید یا تصدیق کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص مختلف علوم کے ماہرین کے نظریات کا مطالعہ کر کے ان پر گامزن ہو جاتا ہے لیکن اسکو اتنا وقت میسر نہیں ہوتا کہ ان نظریات کا آپس میں ایک دوسرے سے موازنہ کر سکے کہ یہ نظریات آپس میں ایک دوسرے کے موافق ہیں یا نہیں؟ کیا ان منجم آراء و نظریات کا مجموعہ انسانیت کو تشکیل دے سکتا ہے یا نہیں؟ وہ ایسا کرنے کے لئے بالکل ہی فکر ہی نہیں کرتا ہے اور نہ ہی اس کو فکر کرنے کا کوئی انگیزہ ہوتا ہے وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا عقیدہ ہے کہ فلاں علم النفس کا جاننے والا یا معاشرہ کی شناخت رکھنے والا یا حقوق کا جاننے والا بہت نظریہ رکھتا ہے اور یہی امر فکری التقاط کا سبب ہوتا ہے، لیکن اہل نظر اور محقق حضرات تمام نظریات کو جمع کر کے ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے سازگار ہیں یا نہیں، اگر فلاں علم النفس کے جاننے والے کے کسی نظریہ کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جامعہ شناسی کے دوسرے نظریہ سے اس لئے مطابقت کرتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اسی طرح دوسرے موضوعات کے دوسرے نظریات کو مختلف نظریات سے موازنہ کرتے ہیں۔

اہل نظر و تحقیق کے قطع نظر کم علم رکھنے والے افراد میں بھی نظریہ منتخب کرنے کا سلیقہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے، اور جب بھی ان افراد کو کوئی کتاب مل جاتی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس کتاب کا لکھنے والا معتبر ہے یا نہیں اس کے نظریات دوسرے نظریات سے مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں اس کے تحت تاثر و وقع ہو جاتے ہیں اور نتیجہ فکری التقاط سے دوچار ہو جاتے ہیں، لہذا ہر کتاب کی تحقیق اور اس کا مطالعہ کرنے سے پہلے توجہ رکھنی چاہئے کہ اس کتاب کا لکھنے والا معتبر ہے یا نہیں؟ کیا اس کے نظریات دوسرے موضوعات کے نظریات سے مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں؟

۳۔ دینی نظریات میں دوسروں سے متاثر ہونا

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں اس صدی کے آدھے دوسرے حصہ میں دوسروں کے نظریات کے تحت تاثر ہونے کا بڑا زور و شور پیدا ہو گیا ہے، بعض افراد اپنی زندگی کے ایک مرحلہ میں اپنے ماں باپ، ماحول اور علماء سے عقائد اسلام کو حاصل کرتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ زندگی کے دوسرے مراحل میں داخل ہوتے ہیں اور جب اسکو لوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو اس ماحول میں رہ کر دوسروں کے عقائد اور نظریات اور مختلف علوم کے

مختلف موضوعات سے آشنا ہو جاتے ہیں اور یہ توجہ کئے بغیر کہ یہ افکار و نظریات دوسرے مختلف علوم کو حاصل کرنے والے افراد کے علوم سے سازگار ہے یا نہیں؟ ان کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جس نظریہ کو وہ فلسفہ میں قبول کرتے ہیں، وہ نظریہ علم الحیات، فیزک اور علم حساب کے نظریہ سے یا کسی دوسرے دینی نظریہ سے مناسب اور سازگاری رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ہم غور و خوض کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ بعض موارد میں ایک دوسرے کے سازگار نہیں ہیں اور ایک کامل مجموعہ کو تشکیل نہیں دیتے اس طرح کی شکل فکر کو فکر التقاطی (دوسروں کے تحت تاثیر ہونا) کہتے ہیں؟

آج ہمارے دینی معاشرے کے افراد بہت وسیع سطح میں فکر التقاطی میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ ایک طرف تو وہ اسلامی معاشرے سے اپنے ورثاتی اور خاندانی عقائد کو حاصل کرتے ہیں اور ان کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں، اور دوسری طرف سے مختلف علوم انسانی کے مسائل کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ ان کو بھی مان لیتے ہیں اور دینی عقائد کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ وہ اس چیز سے غافل رہتے ہیں کہ یہ مختلف نظریات آپس میں ایک دوسرے سے تال میل نہیں کھاتے اور ہم کو یا تو دینی عقائد کو تسلیم کرنا چاہئے یا ان افکار کو جو دین کے مخالف ہیں۔

اس بنا پر اگر ہم جامعہ شناسی، حقوق، سیاست اور ان کے مانند نظریات جو ہمارے دینی عقائد سے ہم آہنگ ہو ان کو تسلیم کرنا چاہیں تو ہم کو جن نظریات کو دوسرے ممالک کی کتابوں کا ترجمہ کر کے اور ان کی تبلیغ کر کے ہم تک پہنچایا گیا ہے اس کو نظر انداز کریں، اور انسانی علوم کے ان جدید نظریات کو جو علمی نقطہ نظر اور اصولی لحاظ سے بھی ہمارے دینی عقائد سے سازگار ہوں ان کو بیان کرنا چاہئے، اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو یا تو ہم اپنے دینی عقائد سے دست بردار ہو جائیں یا پھر اپنے دینی عقائد کے مخالف نظریات اور افکار کو چھوڑ دیں، اس لئے کہ دونوں کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا، جس طرح یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اب دن بھی ہے اور رات بھی۔

نتیجہ کے طور پر ہم نے جو اساسی اور بنیادی نکتہ بیان کیا ہے اس پر توجہ کئے بغیر تمام نظریات کی تلاش میں نہیں نکلا جاسکتا اور ہر حصہ کو قبول نہیں کیا جاسکتا اور التقاط فکری اور دنیا میں سر نہیں کھپایا جاسکتا ہے اس صورت میں ہمارے اندر شناخت و معرفت میں ”افراطی پلورالیزم“ کا نظریہ ظاہر ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو کچھ کہے وہ صحیح ہے اور ہم صرف باطل نہیں کہتے ہیں، اور ہر شخص حقیقت کے کچھ حصہ کو بیان کرتا ہے اور ہر مکتب کے اندر کچھ نہ کچھ حق ضرور پایا جاتا ہے، فلسفہ میں اس طرح کا نظریہ (جو آج بھی یورپی فلاسفہ حضرات میں رائج ہے) وہ شک و تردید میں ختم ہوتا ہے یہ نظریہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ عام طور سے علوم میں مختلف نظریات ہوتے ہیں اور ہر نظریہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے اور ہم کسی چیز پر یقینی اعتقاد نہیں رکھ سکتے، تو ہمارے لئے کسی چیز پر بھی قطعی اور جزمی اعتقاد نہ رکھنا بہت رہے اور نظریہ کے صواب یا غلط ہونے کے احتمال پر

کفایت کرنا چاہئے، اور دین کے باب میں بھی ہم کو پلورالیزم دینی کو قبول کرنا چاہئے، اور اسی بنیاد پر خدا کی وحدانیت پر مسلمانوں کا عقیدہ اور جو شخص کوئی دوسرا عقیدہ رکھتا ہے اس کو ابدی عذاب کا مستحق سمجھتے ہوئے ان کو تسلیم کر لیں اور صحیح سمجھیں، اور عیسائیت کہ جو تین خداؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے عقیدہ کو بھی صحیح سمجھیں اور جو دو خداؤں (خدائے خیر و خدائے شر) کا عقیدہ رکھتے ہیں اس کو بھی درست سمجھیں، اس لئے کہ ان میں سے کوئی ایک عقیدہ بھی قطعی اور صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ہر ایک درست ہو یا ایک بھی درست نہ ہو اور ہم یہ بنا بھی نہیں رکھتے کہ ان میں سے کسی ایک سے برخورد کریں، چونکہ وہ تمام خوب اور درست ہو سکتے ہیں۔

تمام مختلف اور متضاد عقائد و نظریات شک گرائی و شکاکیت (کہ جن پر کوئی شخص مکمل طور پر اعتقاد نہیں رکھتا) اور پلورالیزم کے نظریہ کی بنا پر ہیں، اجتماعی تساہل (سہل انگاری) اور تسامح جو اس چیز پر مبنی ہے کہ اجتماعی طور پر نہ تو تعصب ہو نہ کسی نظریہ کی طرفداری کی جائے، اور نہ غصہ سے کام لیا جائے اور اسی بنیاد پر آج کل کے دور میں ان کو رائج کیا جائے کہ کسی کو تعصب نہیں کرنا چاہئے اور ہر شخص جو کچھ کہے اس کے بارے میں یہ سوچنا چاہئے کہ شاید یہ صحیح ہو، تو حقیقت میں انسان کے اندر دینی عقائد، فلسفی اور علمی اعتبار سے بے تفاوت کی حالت ایجاد کرتا ہے۔

آج کل یورپ میں اکثر افراد بھی نظریہ رکھتے ہیں اور ہمارے لئے یہ نظریہ ایک تحفہ سے کم نہیں ہے اس لئے کہ ہمارے معاشرہ کو بھی محنت و مشقت و تحقیق کے ذریعہ اپنے اندر یہ حالت پیدا کر لینا چاہئے کہ ان کو دینی، علمی اور فلسفی عقائد سے متعصب نہیں ہونا چاہئے اور ہر نظریہ کے بارے میں کہنا چاہئے کہ ممکن ہے یہ نظریہ درست ہو اور ممکن ہے دوسرا نظریہ درست ہو، کبھی کبھی یہ بھی کھا جاتا ہے کہ ہم کو اپنے علم کو مطلق نہیں سمجھ لینا چاہئے اور نہ ہی یہ کہنا چاہئے کہ یہ سو فی صد درست ہے اس کے علاوہ اور کچھ صحیح نہیں ہے، ہم کو ایسا یقین نہیں رکھنا چاہئے، ہمیں تو صرف اپنے اعتقاد پر برقرار رہنا چاہئے اور اس کا احترام کرنا چاہئے اور دوسرے بھی اپنا عقیدہ رکھیں، (ہم سے کوئی مطلب نہیں) یہ وہی ثقافت ہے جس کو یورپ کی دنیا نے اپنے لئے منتخب کر رکھا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمام عالم میں اسی ثقافت کے زیر سایہ زندگی ہونی چاہئے۔

یعنی ان کا عقیدہ یقینی اور جزمی اعتقاد کا انکار کرنا اور اس چیز کا انکار کرنا کہ دین حق، مذہب حق اور نظریہ حق ایک ہے اور افراد کے اذہان عالیہ میں اس بات کا ڈالنا کہ ممکن ہے نظریہ حق متعدد ہوں اور انسان کو ایک چیز پر ہی یقینی اور جزمی اعتقاد نہیں کر لینا چاہئے۔ اور مقام بحث میں تعصب سے کام نہیں لینا چاہئے، دینی غیرت اور مذہب کے اندر تعصب کو ختم کر دینا چاہئے، افراد کو ایک دین ایک مذہب اور ایک فکر کی طرف رجحان کو ختم کرنا چاہئے تاکہ سب مل کر ایک اجتماعی زندگی بسر کر سکیں اور مذہبی مسائل میں کوئی اختلاف نہ ہوں، کیونکہ یہی دینی اختلاف قتل و غارت اور جنگ جدال کے باعث ہوئے ہیں اب تو تمام مذاہب، ادیان اور افکار کو صحیح اور حق کہنا چاہئے تاکہ آپس میں صلح و آشتی کا راستہ ہموار ہو جائے۔

۲۔ پلورالیزم دینی کا مطلب

اگرچہ ہم خصوص طور پر پلورالیزم کے مسئلہ کو بیان کرنا نہیں چاہتے لیکن مختصر طور پر یہ عرض کرتے ہیں کہ مقام عمل میں ایک موقع پر ہم یہ کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے طرفداروں کے ساتھ اور فلسفہ میں مختلف نظریے رکھنے والوں اور مختلف علوم کے ماننے والوں کے ساتھ مودبانہ طریقے سے ملنا چاہئے اور ان کو اس بات کی اجازت دینا چاہئے کہ وہ اپنے نظریات کو بیان کریں اور ان کا دفاع کر سکیں، اور مختلف طریقوں سے بحث و گفتگو اور بحث کریں، آج دنیا میں ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک عیسائی یہودی اور زرتشتی کے ساتھ دوستانہ زندگی بسر کرتا ہے اور ان کے درمیان کشمکش، اختلاف، برادر کشی اور قتل و غارت باطل بھی نہیں پائی جاتی۔

اس چیز کو تقریباً اسلام کے علاوہ کسی بھی مذہبی دینی اور سیاسی نظام میں مد نظر نہیں رکھا گیا ہے اور اس حد تک صاحبان ادیان کی خاطر و مدارات نہیں ہوئی ہے، حالانکہ اسلام میں اعتقادات کا مرکز عظیم ”توحید“ (خدا کی وحدانیت کا اقرار) ہے اور توحید کو رائج اور ثابت کرنے کے لئے ”تثلیث“ (تین خداؤں کا ماننا) اور شرک سے مقابلہ کرنا ضروری مانا گیا ہے، پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام میں عیسائیت اور یہودیت دونوں مذاہب کو رسمی مذہب کے عنوان سے پہچنایا گیا ہے اور ان دونوں مذاہبوں کے پیروکار اسلام کی پناہ میں ہیں ان کی جان و مال اور ناموس محفوظ ہیں اور کسی شخص کو ان کے حقوق کو پامال کرنے کا ذرا سا بھی حق نہیں ہے۔

تمام الہی مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ اس طرح پیش آنا، اولیاء دین اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے سیرت میں سے ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ عراق کے کسی شہر میں ایک کافر ذمی کی لڑکی کے پیر سے پازیب نکال لی گئی ہے مسلمانوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے، کیونکہ اسلامی ملک اور اسلامی ملک کی پناہ میں ایک غیر مسلمان لڑکی پر یہ ستم ہوا، دوسرے مذاہبوں کے طرفداروں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ اسلام کی بلندی اور افتخار کو بیان کرتا ہے جس کے لئے قرآن مجید کی واضح و روشن آیت موجود ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ.﴾^(۱)

”(اے رسول) تم (ان سے) کھو کہ اے اہل کتاب تم ایسی (ٹھکانے کی) بات پر مت آؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں“

اور دوسری آیت ہم کو احسن (سب سے اچھا) سلوک کی طرف دعوت دیتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ.﴾^(۲)

”اور (اے ایماندارو) اہل تاب سے مناظرہ نہ کیا کرو مگر عمدہ اور شائستہ الفاظ و عنوان سے“

اگر پلور الیزم کا یہ مطلب ہے تو ہم کو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ اسلامی افتخارات میں سے ہے، اگر پلور الیزم کا یہی مطلب ہے تو ہم کو دل سے یہ کہنا چاہئے کہ عیسائیت بھی اسلام کے مانند ہے یہودیت بھی اسلام کے مانند ہے اور یہودی ہونے اور مسلمان ہونے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اس لئے کہ ہر ایک میں کچھ نہ کچھ حقیقت پائی ہی جاتی ہے، نہ اسلام مطلقاً طور پر حق ہے اور نہ ہی یہودیت مطلق طور پر حق ہے، یا یہ کہیں کہ دونوں حق ہے اس راستہ کے مانند حق ہیں کہ جو ایک ہی مقصد پر پہنچاتے ہیں چاہے کسی راستہ سے چلے جاؤ مقصد تک پہنچ جاؤ گے، بے شک اس طرح کے نظریہ کو کوئی بھی مذہب قبول نہیں کرتا اور نہ ہی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔

مگر کیا یہ کھا جاسکتا ہے کہ توحید کا عقیدہ رکھنا اور تثلیث کا عقیدہ رکھنا دونوں برابر ہیں؟ یعنی خدا کی وحدانیت کے اعتقاد اور تین خداؤں کا اعتقاد رکھنے کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا؟ کیا اس دین کی اساس اور بنیاد پر جو یہ کہتا ہوا نظر آ رہا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ إِنَّهُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ﴾ (۳)

”اور تین (خداؤں) کے قائل نہ بنو (تثلیث سے) باز رہو (اور) اپنی بھلائی (توحید) کا قصد کرو“
یا قرآن ان افراد کے بارے میں جنہوں نے خدا کی طرف ناروا چیزوں کی نسبت دی اور یہ کھا کہ خدا اولاد رکھتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ ۚ أَلَا رُضُ وَتَحْتُرُ الْجِبَالُ ۚ﴾ (۴)

”قرب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں“
جب اسلام اس طرح کے شرک آمیز اعتقادات کا اس طرح قطعی رویہ اختیار کرتا ہے تو ہم کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ اگر تم چاہو تو مسلمان بن جاؤ اور نہیں چاہتے تو بت پرست بن جاؤ، کیونکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اور تم کو ایک ہدف اور مقصد تک پہنچانے والے ہیں، اور دونوں راستے صراطِ مستقیم شمار کئے جاتے ہیں!! اور میں تو اس چیز کو بہت بعید سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحب عقل انسان بغیر کسی غرض اور باطل ہدف کے اس طرح کی باتیں کرے اور اس طرح کے عقیدہ کو قبول کرے۔
بہر حال التقاط فکری اس زمانے کی ایک بڑی مشکل ہے اس لئے اس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اور تاکہ ہمارے افکار صحیح و سالم رہیں اور اصل نظریہ کو حاصل کر کے اس پر برقرار رہنا چاہئے۔

۵۔ ہنگی خدا کی عظمت اور اس کا مطلق آزادی سے ٹکراؤ

تمام نظریات کا ہماری بحث سے رابطہ یہ ہے کہ جن افراد نے یورپی ثقافت سے الھام کے ذریعہ اصل آزادی کو مطلق طور پر انسان کی سب سے بڑی قیمت اور اہمیت کے عنوان سے قبول کیا ہے اور آزادی کو انسان کے لئے سب سے بڑی ارزش سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہ خود کو اسلام اور دستورات اسلامی کا پابند سمجھتے ہیں اور خود کے دیندار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس یورپی ارزش کی اس طرح حمایت کرتے ہیں کہ جیسے دیگ سے زیادہ چمچہ گرم ہو گیا ہو، اور بے شک یہ ایک قسم کا التقاط ہے اگر یہ بنی ہو کہ ہم اس گروہ کے ساتھ منطقی بحث کرنا چاہیں تو ہم کو یہ کہنا چاہئے کہ اسلام کی اساس و بنیاد خداوند عالم کی پرستش اور عبادت ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (۵)

”اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو“

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ ہر آسمانی دین کی بنیاد خداوند عالم کی خالصانہ عبادت و بندگی ہے۔ مگر ایک صاحب دین اور ایک مسلمان یا یہودی اور نصرانی اس کے علاوہ دین الہی سے اور کیا تصور کر سکتا ہے، ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اسلام تمام ادیان توحیدی کے ساتھ ان احکام کے علاوہ جو زمان اور مکان کے مناسب صادر ہوتے ہیں تمام کلیات اور اصول اعتقادی میں یکساں و برابر ہے۔

اور اگر اس بارے میں کوئی اختلاف نظر آئے تو یہ اس تحریف کا اثر ہے جو بعض ادیان الہی میں کی گئی ہے، نتیجتاً اسلام میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ انسان خالص خدا کا بندہ ہو اور خداوند عالم اس حقیقت کو قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان فرماتا ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (۶)

”انہیں امر نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خداوند عالم کی کامل اخلاص کے ساتھ دین میں پرستش و عبادت کریں“

اور سورہ زمر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِلَّا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ﴾ (۷)

”آگاہ رہو کہ عبادت تو خاص خدا ہی کے لئے ہے۔“

اور سورہ لقمان میں فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى﴾ (۸)

”اور جو شخص خدا کے آگے اپنا سر (تسلیم) خم کرے اور وہ نیکو کار (بھی) ہو تو بے شک اس نے (ایمان کی) مضبوط رسی پکڑی“

اب جب انسان اپنے کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے خدا کی بندگی کو سب سے زیادہ باارزش جانتا ہے اور اس نے اپنے کو مکمل طور سے خداوند عالم کے اختیار میں قرار دیدیا ہے تو وہ مطلق آزاد کا معتقد ہو سکتا ہے اور جس چیز کو اس کا دل چاہے اس کو اہمیت دے سکتا ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے موافق اور سازگاری رکھتے ہیں؟ اگر میں درحقیقت اسلام حق کا عقیدہ مند ہوں اور یہ اقرار کرتا ہوں کہ خدا کا ایک دین ہے اور اس کو قبول کرنا چاہئے اور میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ ایک خدا اور اسکی عبادت کمروں اور تمام چیزوں کو اسی کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہئے اور اسی کے ارادہ کے تابع ہیں تو میں کس طرح مطلق طور پر آزاد رہنے کا معتقد رہ سکتا ہوں اور جس طرح چاہوں عمل کمروں؟ فکر کرنے کے یہ دو طریقے کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، جو لوگ اس طرح کا ادعا کرتے ہیں یا بے خبری کی بنیاد پر التقاط سے دوچار ہو گئے ہوں، یا دل میں اسلام کا عقیدہ نہیں رکھتے ہیں یا دوسروں کو فریب دینے کی وجہ سے یہ ادعا کرتے ہیں یا اصلاً وہ اس بات کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے ہیں کہ یہ دو نظریہ آپس میں ایک دوسرے سے ناسازگار ہیں؟ اس صورت کے علاوہ میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان ایک طرف تو یہ کہے کہ میں کاملاً اور میرا تمام وجود خدا کے ارادہ کا تابع ہے اور صرف اپنے لئے مطلق آزادی کا قائل ہو اور یہ کہے کہ جو میرا دل چاہے گا وہی انجام دوں گا۔

یہ طرز تفکر یعنی انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے کا اعتقاد یورپ والوں کی فکر کی پیداوار ہے وہاں پر مسیحیت کے معتقد گروہ اپنے دین کا عقیدہ رکھتے ہوئے (شاید اپنے فطری لگاؤ کی بنیاد یا اپنے ماحول اور دینی تربیت کی وجہ سے اپنے دین سے دست بردار نہیں ہوتے) خاص دلیلوں اور استدلالوں کی وجہ سے یا چند اہم اعتراضوں کی وجہ سے انسان کے مطلق آزاد ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، بے شک کوئی انسان بغیر کسی دلیل کے اس طرح کی بات نہیں کر سکتا، بلکہ ایک نقطہ سے اپنی بات شروع کرتا ہے اور اس طرح گفتگو کرتا ہے کہ جو دوسروں کے لئے جذاب اور قابل قبول ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ کیا ایک پرندہ کو پنجرہ میں بند کر دینا اور اس پنجرہ کو لوہے کے پنجرہ میں رکھ دینا بہت رہے یا پرندہ کے اڑنے کے لئے پنجرہ کا دروازہ کھول دینا بہت رہے؟ کہ وہ جدھر چاہے چلا جائے، ظاہر ہے کہ پرندہ کو آزاد کر دینا بہت اچھا ہے اور وہ بھی بھی چاہتا ہے، اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جس آزادی کے بارے میں ہم بحث کرتے ہیں اس سے مراد بھی آزادی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں مکمل طور پر اسلامی قوانین ہوتے ہیں اس کے بعد ”ولایت فقیہ“ سے مربوط قوانین بھی اس میں رکھے جاتے ہیں، اور ان کے اندر پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین بھی رکھے جاتے ہیں اور اسی طرح ”مجمع تشخیص نظام“ اپنی جگہ پر مسلم ہے اور آخر میں ”شورای نگهبان“ وضع شدہ قوانین پر اظہار نظر کرتی ہے، اس طرح قوانین بنانا یقیناً پنجرہ کو دوسرے پنجرہ کے اندر رکھنے کے مانند ہے! بہت رین قانون وہ ہے جو انسانوں کو جس طرح وہ چاہیں اس طرح عمل کرنے کی اجازت دیدے اور جس

طرح چاہیں گفتگو کرنے کی اجازت دیدے، یعنی کلی طور پر وہ آزادانہ زندگی بسر کریں؟! اور ظاہر سی بات ہے کہ پہلا قانون پنجرہ ہے او دوسرا قانون آزادی ہے۔

اگر ہم دوسری ثقافتوں کے عقائد و افکار اور آراء کی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو ایسے موقع پر اس چیز کی تاکید کرتے ہیں کہ ابتدا میں ہم کو ان کا ریشہ ڈھونڈنے کی کوشش کرنا چاہئے اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ نظریات اسلامی نظریات سے سازگاری رکھتے ہیں یا نہیں؟

اگر اسلامی نظریات کے موافق ہیں تو قبول کریں اور اگر اسلامی نظریات کے مخالف ہیں تو ان کو چھوڑ کر اپنے دین کے اصول کی تلاش میں نکلنا چاہئے اور انہیں اصول کو اپنے عقائد اور نظریات کی بنیاد قرار دیں۔

۶۔ یورپ اور علم و دین کے ٹکراؤ کا دور ہونا

علم و دین سے ٹکراؤ کو حل کرنے کے لئے یورپی متدین حضرات نے دین کے دائرہ فرمانروائی میں شک کرتے ہوئے کچھ راہ حل پیش کئے اور اس شبہ کو بیان کیا کہ بنیادی طور پر علم و فلسفہ کی کو دین سے جدا بتایا ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلسفی قدر و قیمت، اخلاقی قدر و قیمت اور یا انسانی قدر و قیمت دین کے ساتھ سازگار ہے یا نہیں یہ اس فرض کی بنا پر کہتے ہیں کہ دونوں ایک نقطہ پر مل جائیں چونکہ جب دو خط ایک دوسرے کی طرف مائل ہے تو ایک نقطہ پر وہ دونوں خط ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں لیکن اگر دو خط ایک دوسرے کے برابر ہوں مقابل میں ہوں تو کبھی بھی وہ آپس میں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے، اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراؤ نہیں ہوگا چونکہ ان میں سے ہر ایک خط اپنے ہدف پر ختم ہوتا ہے جو اس کا دوسرے خط کے علاوہ مستقل ہدف ہے۔

وہ علم و دین کے ایک دوسرے سے رابطہ کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ دین اور علم، دین اور فلسفہ، دین اور عقل دین اور اخلاقی قدر و قیمت کے مابین صلح برقرار رکھنی چاہئے دو جہت اور دو مستقل حوزوں کو ان کے لئے ترسیم کرنا چاہئے یعنی حوزہ دین علوم کے دوسرے حوزوں سے جدا ہے اور حوزہ دین کا ارتباط خدا سے ہوتا ہے اور جو کچھ اس ارتباط سے پیدا ہوتا ہے جیسے نیایش، نماز، دعا اور کچھ شخصی مسائل ان کا دوسروں سے کوئی ربط نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں نہ علم کو کوئی دخالت ہے نہ فلسفہ کو اور نہ کسی دوسرے عامل کو کوئی دخالت ہے یہ تو صرف اور صرف دل سے مربوط ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز اس حوزہ میں دین کے ساتھ شریک ہوگی تو وہ عرفان دین اور عرفان دونوں ایک مقولہ سے ہیں اور دونوں کا ایک ہی کاسہ سے پانی پیتے ہیں، نتیجتاً علم، فلسفہ اور عقل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہوتا بلکہ ان تینوں کا فرمانروائی میدان ایک دوسرے سے الگ الگ ہے اور ہر ایک کے اپنے خاص وسائل ہوتے ہیں۔

لیکن حوزہ اخلاق میں وہ قدر و قیمت اور وہ چیزیں جن کو انجام پانا چاہئے یا وہ چیزیں جن کو انجام نہیں پانا چاہئے، یہ چیزیں خدا سے مربوط ہیں جیسا کہ کیا نماز پڑھی جانی چاہئے یا نہیں؟ یہ دین سے مربوط ہے اور اس سلسلہ میں علم سے کوئی معارضہ نہیں ہے، لیکن اگر کچھ چیزوں کو انجام پانا چاہئے اور کچھ چیزوں کو انجام نہیں پانا چاہئے یہ انسانی کی اجتماعی زندگی سے مربوط ہوتی ہیں جیسا کہ چور کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہئے؟ کیا اس کو مجازات دینا چاہئے یا نہیں؟ کیا خیانت کرنے والے اور گناہ کار شخص کو اس کی سزا دینی چاہئے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں خاص طور سے یہ کھا جاتا ہے کہ: جو شخص کسی جرم اور خیانت کا مرتکب ہوتا ہے وہ بیمار ہے اس کا علاج ہونا ضروری ہے اور نرمی اور محبت کے ساتھ اور مناسب مقام پر اس کا علاج کرنا چاہئے اور اس کی نگرانی کرنا چاہئے تاکہ وہ اس خیانت سے دست بردار ہو جائے۔

ہم دنیا کے کسی ملک میں کسی ایسی جگہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتے کہ جہاں خیانت کرنے والے اور گناہ کار کے ساتھ بیمار جیسا برتاؤ کیا جاتا ہو اور اس کو سزا نہ دی جاتی ہو لیکن پریکٹیکل کے میدان میں وہ یہ کہتے ہی کہ: خیانت کرنے والوں کو سزا نہیں دینی چاہئے اور اصل میں انسان کو سزا دینا یہ اس کی شایان شان نہیں ہے، اور نہ ہی انسانی کرامت سے سازگار ہے اور کلی طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ انسان سب سے برے ظلم کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو جائے اس کو مطلق طور پر سزا نہیں دی جانا چاہئے اس لئے کہ انسان سے اس طرح کا برتاؤ کرنا اس کی شان اور مرتبہ کے خلاف ہے، اس نظریہ کے مقابل ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دین زندگی کے تمام امور میں حق دخالت رکھتا اور اس نے قانون بیان کر دیا ہے کہ

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (۹)

”چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں“

اجتماعی مسائل کو دین سے جدا کرنے والے کہتے ہیں کہ دین کو ان چیزوں کے بارے میں دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں، دین تو صرف اور صرف یہ کہتا ہے کہ نماز پڑھو یا یہ کھ سکتا ہے کہ خداوند عالم سے کس طرح دعا کی جائے لیکن یہ کہ ایک گناہ کار سے کس طرح پیش آیا جائے اس کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اور یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ اس بارے میں علم تجربی کا بھی کوئی دخل نہیں ہے اس لئے کہ تجربات ان صفتوں کا ایسا سلسلہ ہے کہ جو آشکار طور پر عینی چیزوں کے رابطہ کو بیان کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں علم موجودہ چیزوں کے بارے میں بیان کرتا ہے لیکن علم ”کن چیزوں کو انجام دیا جائے یا کن چیزوں کو انجام نہ دیا جائے“ بیان کرتا ہے، احکام ارزشی کو بیان کرنا علم کا کام نہیں ہے، لہذا اخلاقی اور اجتماعی مسائل چاہے وہ حقوقی قوانین ہوں یا مدنی اور کیفری قوانین یہ تمام صرف اخلاقی مسائل ہیں اور ان میں صرف یہ بیان ہوتا ہے کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے، ان میں نہ دین دخالت رکھتا ہے اور نہ علم (علم سائنس اور علم تجربی) دخالت رکھتا ہے۔

۷۔ اسلام اور آزاد بخوا مکتب میں عوام الناس کی اہمیت

جب اخلاقی قدر و قیمت، کن چیزوں کو انجام دینا چاہئے اور کن چیزوں کو انجام نہیں دینا چاہئے ان مسائل میں دین کا کوئی دخل نہیں ہے، اور نہ ہی علم کی کوئی دخالت ہے، تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل میں کس کو حق دخالت ہے؟ آج کل کے دور میں یورپ کی ثقافت میں اس سوال کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ قدر و قیمت، کن چیزوں کو انجام دینا چاہئے اور کن چیزوں کو انجام نہیں دینا چاہئے، یہ اعتباری امور ہیں یہ خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ عوام الناس کیا چاہتی ہے؟ ان کے نقطہ نظر سے کون چیزیں انجام دینا چاہئے اور کن امور کو انجام نہیں دینا چاہئے، ان کی قدر و قیمت یہ سب اعتباری چیزیں ہیں یعنی ان کی بنا حقائق عینی، خارجی اور نفس الامری پر نہیں ہے، یہ تو صرف عوام الناس کے سلیقہ پر موقوف ہیں، اب ہم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے تو نہ دین کی تلاش کرنا چاہئے، نہ علم کے پیچھے دوڑنا چاہئے اور نہ ہی فلسفہ کی تلاش کرنا چاہئے بلکہ عوام الناس سے سروکار رکھنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

قانون گذاری کے بارے میں یورپی جمہوریت کی بنیاد اس چیز پر استوار ہے کہ عوام الناس کی خواہش (طلب) کے علاوہ کسی اور واقعیت کا کوئی وجود نہیں ہے کہ انجام دینے والی چیزیں اور نہ انجام دی جانے والی چیزیں اس کی بنیاد پر کشف کیا جائے۔

مادی امور میں انجام دینے والے امور اور انجام نہ دئے جانے والے امور یہ سب امور تجربی کے دائرہ میں شامل ہیں اور علوم تجربات سے مربوط ہیں جن کو تجربہ گاہ میں ثابت کیا جاتا ہے، لیکن خدا سے ارتباط کے وقت جن امور کو انجام دینا چاہئے اور جن کو انجام نہیں دینا چاہئے یہ سب دینی دائرہ سے مربوط ہو جاتے ہیں اور جو کچھ دین کھے گا اس کو بجالانا چاہئے اور ان کا علم سے کوئی مطلب نہیں ہے، لیکن جن امور کو انجام دینا چاہئے اور جن امور کو انجام نہیں دینا چاہئے یہ خود انسانوں کی اجتماعی زندگی سے مرتبط ہوتے ہیں نہ ان میں خداوند عالم کو دخالت کرنے کا حق ہے اور نہ ہی علم ان کو معین و مشخص کر سکتا ہے۔

اگر آپ یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ یورپ میں عوام الناس کی رائے اور عمومی آراء پر اعتماد کیا جاتا ہے تو یہ وہاں کی موجودہ خاص ثقافت کی اساس و بنیاد کی وجہ سے ہے، اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دین، انسان کی زندگی کے تمام امور کو شامل ہوتا ہے، اور ہمارے وہ تمام امور جو ہماری زندگی سے مربوط ہیں کہ ہم کو کون سے کام انجام دینے چاہئے اور کون سے کام انجام نہ دینے چاہئے انہیں خداوند عالم سے حاصل کرنا چاہئے، اور اس بارے میں ہم کو عوام الناس کی رائے کا تابع نہیں ہونا چاہئے، اگر خداوند عالم کسی چیز کو معین فرمادے اور اس کے انجام دینے کا حکم صادر فرمادے لیکن عوام الناس کی طلب دوسری ہو تو اس میں کون معتبر ہوگا؟

تمام معاشروں میں عوام الناس کی طلب اور دین میں بیان ہونے والے احکام کے مابین کم و بیش تضاد پایا جاتا ہے، تحریف ہونے والے تمام ادیان سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ ہماری بحث تو ان ملکوں سے ہے جن میں اکثر افراد مسلمان ہیں، اور

وہ کسی دین کے پیروکار ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں خواہ وہ فردی ہوں یا اجتماعی گھریلو مسائل ہوں یا بیوی کے انتخاب کا مسئلہ یا اولاد کی تربیت کی بات ہو، یا اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل ہوں، تو کیا اس صورت میں وہ افراد یہ کھنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم نے اس دین کو تسلیم کر لیا ہے درحالیکہ ان کا ادعا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار و ملاک عوام الناس کی رائے ہے؟ کیا وہ کم سے کم ان دونوں کو اس صورت میں بھی تسلیم کر سکتے ہیں جہاں پر دونوں میں تعارض ہو؟

لیکن افسوس آج ہمارے نشریات میں جو کچھ غرب (یورپ) میں ہو رہا ہے وہ رواج پارہا ہے جب ایک دین میں ہم جنس بازی کو سب سے بری چیز بتا رہا ہے تو خدا نخواستہ اگر عوام الناس ہم جنس بازی کے جائز ہونے کے حق میں ووٹ دیں تو کیا عوام الناس کی مرضی اور مانگ کو دین پر مقدم کرتے ہوئے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟! اور کیا حقیقت میں یہ دونوں ایک ساتھ جمع ہو جائیں گے؟ یورپ کی دنیا نے دین اور عوام الناس کی خواہش کے مطابق متضاد مسائل کو حل کر دیا ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل دین کو دخالت کرنے اور عوام الناس کی خواہش کو نظر انداز کرنے کا کوئی حق نہیں ہے دین کا تعلق کلیسا سے ہوتا ہے جہاں پر افراد اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کچھ دعا وغیرہ کرنے سے افراد کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جس کے بعد کلیسا ان کو بھشت کے لئے روانہ کر دیتا ہے، لیکن اجتماعی مسائل سے دین کا کوئی تعلق نہیں ہے، اجتماعی مسائل کو تو صرف عوام الناس کی رائے ہی مشخص و معین کر سکتی ہے، کناڈا میں نئے مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالنے والے کشیش (عیسائیوں روحانی پیشوا) سے ایک ٹی وی پروگرام میں سوال کیا گیا کہ ہم جنس بازی کے بارے میں آپ کے مذہب کا کیا نظریہ ہے؟ اس نے جواب دیا: میں فوراً تو اپنا قطعی نظریہ نہیں دے سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ انجیل کا سرے سے مطالعہ کرنا چاہئے!!

۸۔ اسلام اور یورپ میں جمہوریت اور قانون گذاری کا مرجع

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یورپین لوگوں نے دین اور اجتماعی مسائل کو جدا کر کے اپنا من پسند راہ حل تلاش کر کے دین اور عوام الناس کے مابین تعارض کا حل ڈھونڈ نکالا، کیا ہم بھی اسلام کے ماننے والے اس طرح کے راہ حل کی تلاش میں ہیں؟ یہ وہی اندیشہ (فکر) ہے جو ”سیکولاریزم“ کے نام سے مشہور ہے یعنی دین کو مسائل اور زندگی کے امور سے جدا کرنا چاہے وہ اجتماعی، حقوقی سیاسی، اور گھریلو ہی مسائل کیوں نہ ہوں، کچھ افراد اس بارے میں ”ایرانی ثقافت کی خدمت“ کی وجہ سے دسیوں تقریروں اور متعدد مضامین میں یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ دینی کا دائرہ، سیاست، اجتماعی، حقوقی اور اقتصادی مسائل سے جدا ہے اور اس بارے میں رات دن محنت کیا کرتے ہیں، تو کیا ہم بھی ایسا ہی عقیدہ رکھ سکتے ہیں؟ اگر ہمارا ایسا عقیدہ نہیں ہے تو ہم کو توجہ رکھنا ہوگی کہ ہم ان کے دھوکے میں نہ آئیں اور یہ جان لیں کہ جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں وہ ہمارے عقیدہ کے ہم آہنگ نہیں ہے اور

اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا ہوگی کہ خواستِ خدا اور عوام الناس کی طلب کے مابین معارضہ ایجاد ہو جائے تو جو کچھ دین خدا نے معین کیا ہے اسکو اپنائیں اور حقیقت میں خدا کی مرضی کو مقدم کریں۔

البتہ حقیر تکالیف کو مشخص و معین کرنے کا قصد نہیں رکھتے کہ افراد ہمارے بیان سے آزادی کے خلاف کوئی مطلب نکالیں لیکن ان کو منتخب کرنے غور و فکر اور دقت سے کام لے کر آگاہ اور آزاد طور پر کسی چیز کو منتخب کرنا چاہئے ان کو متوجہ رہنا چاہئے کہ آج کل جو ”قانون گذاری میں جمہوریت“ کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے یعنی عوام الناس کی طلب کو خدا کی مرضی اور طلب پر مقدم رکھنا یعنی دین اور خواست خدا کا ایک طرف رکھ دینا، اگر عوام الناس کسی چیز کو منتخب کرنا چاہتے ہیں تو ان کو متوجہ رہنا چاہئے کہ وہ ان کے چنگل میں نہ پھنس جائیں کہ اسلام کو تو مجموعہ مقررات و قوانین برحاکم جامعہ کے عنوان سے قبول کر لیں اور قانون گذاری میں جمہوریت کو قبول کر لیں، درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے سے سازگار نہیں ہیں۔

جو افراد عوام الناس کو دھوکہ دینے، معاشرہ میں التقاط رائج کرنے اور بحث کو مخلوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ میری تقریروں اور مثالوں سے بہت زیادہ پریشان حال ہو جاتے ہیں چونکہ ان کی نیت اور ان کے سازش کا راز فاش ہوتا ہے اس لئے وہ پریشان ہوتے ہیں البتہ کچھ افراد کو سیاسی اغراض و مقاصد کی وجہ سے میری باتیں اچھی نہیں لگتیں، لیکن یہ باتیں چاہے کسی کو اچھی لگیں یا بری، ہم اپنی زندگی کے آخری لمحے تک دین اسلام کے احکام کو بیان کرنے میں کوئی دریغ نہیں کریں گے، اور دین اسلام کی حمایت میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں گے، اور تمام ناگوار واقعات کو اپنے لئے برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں نہ کسی دھمکی سے ڈرتے ہیں، اور اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتے ہیں۔

ہم یہاں پر احکام کو قطع و جزم دینے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن یہ یاد دہانی کر دینا چاہتے ہیں کہ عوام الناس ہوشیار رہیں اور واقعات کو حاصل کرنے کی خاطر اپنی عقل سلیم کو کام میں لائیں یورپ والوں کی باتوں اور ان کے مفہیم سے دھوکہ میں آنے سے ہوشیار رہیں، کھیں ایسا نہ ہو کہ اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں، ضروری ہے کہ نظریات و آراء کے جو مبنائی بیان کئے جاتے ہیں ان کی معرفت حاصل کریں۔

مثال کے طور پر جب یہ کھا جاتا ہے کہ قانون کو تسلیم کرنے کا معیار عوام الناس کی خواہش اور ان کی مانگ ہے اور ”قانون گذاری میں جمہوریت“ کو بیان کیا جاتا ہے تو ان کو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا انسان کو صرف بھی بدن عطا کیا گیا ہے، اور ایک مادی زندگی دی گئی ہے اور اس کو حیوان کا مجسمہ بنا کر بھیجا گیا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو اس صورت میں تو عوام الناس کو قانون گذاری کا حق ہے جیسا کہ اسی نظریہ کو یورپین لوگوں نے تسلیم کر رکھا ہے، یا جیسا کہ اسلامی نظریات میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان مادی بند کے علاوہ وہ بلند و بالا مقام اور روحانی اور معنوی اہمیت کا بھی حامل ہے تو اس بنیاد پر قانون گذاری میں مادی مصلحتوں، نظم اور

اجتماعی انیت کی رعایت کے علاوہ معنوی مصلحتوں کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے، اس صورت میں انسان خدا کے ارادہ کا تابع ہوگا اور قانون کا معیار و ملاک خداوند عالم کی مرضی ہوگی۔

اس بات کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ کیا واقعاً انسان مادی اور حکمت ماوراء الطبیعة سے بالما ایک معنوی پہلو بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ کیا انسان مادی بدن اور حیوانی خصلتوں کے علاوہ کوئی اور پہلو بھی رکھتا ہے، تاکہ وہ اسی اساس و بنیاد پر خداوند عالم سے ارتباط برقرار رکھ سکے؟ کیا واقعاً مرنے کے بعد انسان کے لئے کوئی اور دوسری زندگی بھی ہے؟ کیا واقعاً اس مادی زندگی اور مرنے کے بعد والی زندگی کے مابین کوئی رابطہ ہے؟ مسلمانوں اور متدین افراد کے لئے ان سوالات کے جوابات واضح ہیں۔

لیکن ہم کو یہ غور و فکر کرنا چاہئے کہ ہمارے سیاسی اور اجتماعی رجحان کو ہمارے اعتقاد کے ہم اہنگ ہونا چاہئے اور ہماری فکر و اندیشہ اور عمل میں التقاط ظاہر نہیں ہونا چاہئے، اگر واقعاً ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہے، قیامت ہے، اور حساب و کتاب درکار ہے تو ہم کو یہ واضح کرنا ہوگا اور اس قطعی نتیجہ پر پہونچنا ہوگا کہ ایک حقیقت میں غیر خدائی قانون (کو عوام الناس کی طلب کے معیار قانون ہے) پر عمل کرنا ہماری ابدی آرمگاہ میں منفی اثر رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال و جواب قطعی و یقینی طور پر ہونے چاہئے چونکہ شک و تردید سے مشکل حل نہیں ہوتی اور نہ ہی اس بارے میں شک کرنا عقلمندی کا کام ہے۔

یورپ میں یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے وہ بھی بڑے عجیب و غریب انداز میں یا تو عالم غیر مادی اور معنوی کا انکار یا افکار و اندیشہ کو شک و احتمال و تردید میں قرار دینا اور ذہنوں میں یہ ڈالنا کہ کن امور کو انجام دینا چاہئے اور کن کاموں سے اجتناب کرنا چاہئے، ان امور کی ارزش و اہمیت عینی اور خارجی حقائق پر مبنی نہیں ہے جو ان کو متعلق یقین قرار دیا جائے یہ تو صرف اعتباری اور قراردادی چیزیں ہیں جن کی بنا عوام الناس کی خواہش ہے بقیہ ان کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور اسی وجہ سے ہمارے وہ روشن فکر افراد جن پر یورپ والوں کا سایہ پڑ گیا وہ ان مطالب کو اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور ہمارے عزیز نوجوانوں کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی وہ مذہب شک گرانی اختیار کر لیتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں!! لیکن دین کے نقطہ نظر سے یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ ہم کو شک و تحیر اور تردید سے باہر نکلنا چاہئے اور آگاہی اور یقین کے ذریعہ صرف ایک ہی راستہ کو منتخب کرنا چاہئے جیسا کہ قرآن کریم کے ابتدا ہی میں یقین کی تاکید کرتا ہونا نظر آ رہا ہے اور فرماتا ہے:

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (۱۰)

”متقین وہ لوگ ہیں جو عالم آخرت پر یقین رکھتے ہیں“ قرآن کریم ”یشکون“ نہیں فرما رہا ہے، اب اگر کوئی قرآن کریم سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو اسکو عالم آخرت پر یقین رکھنا ہوگا اور قرآن کریم دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۱)

”اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں“

دوسری طرف یورپی ثقافت سے متاثر افراد کہتے ہیں کہ انسان کسی مسئلہ میں بھی منطقی طور پر یقین پیدا نہیں کر سکتا، اور خاص طور سے جو مسائل ماوراء مادہ سے مربوط ہوتے ہیں ان میں تو انسان کو یقین ہو ہی نہیں سکتا، قرآن کریم انسان کے لئے جس انحطاط اور پستی کی حالت کو بیان کرتا ہے وہ شک و تردید کی حالت ہے قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ﴾ (۱۲)

”تو وہ اپنے شک میں ڈانوَ اڈول ہو رہے ہیں (کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں)
اور اسی طرح قرآن کریم ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿أَنزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْ ذِكْرِي﴾ (۱۳)

”کیا ہم سب لوگوں میں بس (محمد ہی قابل تھا کہ) اسی پر قرآن نازل ہوا، نہیں بات یہ ہے کہ ان کو (سرے سے) میرے کلام ہی میں شک ہے کہ میرا ہے یا نہیں“

قرآن کریم ہم کو خاص طور سے اصول دین یعنی خدا، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کے بارے میں اہل یقین میں سے ہونا چاہتا ہے، اب ہم کو ان دو راستوں میں سے ایک راستہ کو منتخب کرنا چاہئے یا اس راستہ کو اختیار کرنا چاہئے جس میں انسان بنیادی طور پر ہی یقین تک نہیں پہنچتا، اور ہمیشہ شک و تردید کی حالت میں دوچار رہتا ہے، یا اس مذہب کو منتخب کرنا چاہئے جو ہم کو انتخاب آگاہانہ اور یقین کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے جب تک اہل یقین نہ ہوؤ گے کتاب خدا سے استفادہ نہیں کر سکو گے۔

ان دونوں ثقافتوں میں یہ فرق ہے کہ ان میں سے ایک انسان کے لئے سب سے بری شک و تردید اور حیرت کی حالت کو جانتا ہے اور انسان کو شک و تردید میں اس شخص کے مانند گرفتار کر دیتا ہے جو خوفناک اور بھیانک جنگل میں پہنچ گیا ہو اور جو شخص بھی اس کو کسی طرف بلانا چاہے وہ اس راستہ کو اسی حیرانی و پریشانی میں منتخب کر لیتا ہے اس کے برعکس یورپی ثقافت میں شک و تردید کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک انسان اہل حیرت و شک نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہو سکتا ہے، نتیجہ کے طور پر انسان کو ان دونوں میں سے ایک راستہ قبول کرنا ہوگا، اسلام کو یا اس ثقافت کو جس میں حیرت و شک کو بہت رین چیز بتایا جاتا ہے، لیکن ان دونوں راستوں کو ایک ساتھ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے جس طریقہ سے یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اب دن بھی ہے اور رات بھی، اور اسی طرح توحید، تثلیث (تین خداؤں کو ماننا) بھی ایک عقیدہ میں نہیں سما سکتے ہیں۔

۹۔ جوانوں کے لئے ایک نصیحت

میرے وہ پیارے نوجوان جو علمی اعتقادات پیدا کرنے کی فکر میں ہیں واضح اہل فکر ہونا چاہتے ہیں اور اہل تقلید ہونا پسند نہیں کرتے، ان کے لئے میری نصیحت یہ ہے کہ وہ پہلے ان سیاسی مسائل کو حل کریں ان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اہل شک ہوں

یا اہل یقین، دین کی پیروی کریں یا سیکولریزم رہیں، خدا پرست نہیں یا ہر قسم کی عبودیت سے آزاد یہاں تک کہ خدا کی عبودیت سے بھی آزادی چاہتے ہیں، ان کے لئے ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ کا اپنانا ضروری ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ کبھی اس راستہ پر چلیں اور کبھی دوسرے راستہ پر چل پڑیں، کبھی ان کی باتوں کو قبول کریں اور کبھی دوسروں کی باتوں کو قبول کریں، اس طرح کا رویہ بہت خطرناک ہے، اور ہماری عاقبت کفر کی حالت اور ابدی عذاب جہنم کا باعث بن جائے۔ اگر ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور اس کی حقانیت کو قبول کرتے ہیں تو کیوں انسان کی مطلق آزادی کو تسلیم کریں؟! کس طرح ہم دین کے بھی معتقد ہو سکتے ہیں اور لیبرالیزم اور سیکولریزم کے بھی؟ اس طرح کا عقیدہ رکھنا ناممکن ہے، کسی بھی بلند وبالا راستہ کو منتخب کرنے سے پہلے کچھ چیزوں کو فرض کر کے ان کے بارے میں بحث کرنا چاہئے جیسے یہ کہ کیا ہم کو انسان کو ایک موجود مادی سمجھیں اور اس کی سعادت کو صرف حیوانی لذتوں میں تلاش کریں، آزادی کا مطلب صرف خواہشات نفسانی بیان کریں؟ یا یہ کہ انسان کی انسانیت ماوراء مادہ کے لئے ایک جوہر ہے، روح الہی ہے، اور بدن صرف روح کو کامل کرنے کا وسیلہ ہے اور ہماری حقیقی زندگی ابدی زندگی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے: ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ فَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (۱۴)

”اور اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ابدی زندگی (کی جگہ) تو بس آخرت کا گھر ہے (باقی لغو)“ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْعُرُورِ﴾ (۱۵)

”اور دنیا کی (چند روزہ) زندگی دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

اگر جہان آخرت ہماری اصلی اور حقیقی زندگی ہے تو دنیا میں ہم کو اپنی توجہ اور ہمت اس چیز میں صرف کرنی چاہئے جو ہم کو بڑی سعادت تک پہنچائے یہ ان مذاہب کے برعکس ہے جن کا عقیدہ ہے کہ اُخروی سعادت دنیا کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی ہے اور اگر کوئی شخص آخرت میں سعادت کا خواہاں ہے تو اس کو دنیا میں گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہئے اور دنیا سے بہت کم استفادہ کرنا چاہئے، خوشبختانہ بڑی اقبال مندی کی بات ہے کہ دین اسلام دنیا و آخرت کی سعادت کو ایک جگہ جمع ہونا ممکن جانتا ہے اور معتقد ہے کہ انسان خاص طور سے زندگی میں سعادت دنیا کو بھی حاصل کر سکتا ہے اور سعادت ابدی آخرت کو بھی حاصل کر سکتا ہے۔

حوالہ

۳- سوره نساء آیت ۱۷۱

۴- سوره مریم آیت ۹۰

۵- سوره نخل آیت ۳۶

۶- سوره یمنه آیت ۵

۷- سوره زمر آیت ۳

۸- سوره لقمان آیت ۲۲.

۹- سوره مائده آیت ۳۸

۱۰- سوره بقره آیت ۴

۱۱- سوره ذاریات آیت ۲۰.

۱۲- سوره توبه آیت ۴۵

۱۳- سوره ص آیت ۸.

۱۴- سوره عنکبوت آیت ۶۴

۱۵- سوره آل عمران آیت ۱۸۵.

تیرہواں جلسہ

قانون کے سلسلے میں اسلام اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق

۱۔ گزشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ گزشتہ جلسوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ہماری بحث کا موضوع اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرنا ہے، اور اس نظریہ کو بیان کرنا کچھ وضع شدہ اصول اور کچھ مقدموں پر مبنی ہے کہ جن کی بنیاد پر ہماری بحث قائم ہوئی ہے اور ہم سب سے اہم مقدموں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی بحث کو آگے بڑھائیں گے اور وہ تین مقدمہ درج کئے جا رہے ہیں:

۱۔ انسان کی اجتماعی زندگی بغیر قانون کے مکمل نہیں ہو سکتی، یعنی انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے قانون کی سخت ضرورت

ہے۔

۲۔ قانون کو قانون گذاری کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے مناسب قوانین کو وضع کر کے قانون کے اغراض و مقاصد کو مکمل کیا جاسکے۔

۳۔ قانون کو بنائے جانے کے بعد اس پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایک طاقت کا ہونا ضروری ہے کہ اگر کوئی قانون کی مخالفت کرنا چاہے تو اس کو قانون کا پابند بنانے کے لئے اس طاقت کا استعمال کیا جائے۔

ہر ایک معاشرہ کیلئے قانون کا ہونا ضروری ہے اس موضوع کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہر زمانہ میں تقریباً تمام انسانوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور شاید بہت کم ہی ایسے اسلامی محقق ہوں گے جو معاشرہ کیلئے قانون کے قائل نہ ہوں، البتہ کچھ گنے چنے افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ اخلاقی قدر و قیمت کا ہونا ہی معاشرہ کو قوانین حقوقی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

لیکن یہ ایک نمونہ آئیڈیل اور آرزو ہی ہے اور ہر گز تاریخ میں کوئی ایسا اتفاق پیش نہیں آیا کہ تمام افراد اخلاقیات پر ہی گامزن ہو گئے ہوں اور مستقبل میں بھی کسی ایسے وقت کا امیدوار نہیں رہا جاسکتا کہ تمام افراد اخلاقی اصولوں کی اس طرح رعایت کریں کہ پھر ان کو حقوقی قوانین کی ضرورت نہ رہے، لہذا ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ وہ تمام محققین جو اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرنے کا قصد رکھتے ہیں ان سب نے قانون کی اصل ضرورت کو تسلیم کیا ہے اور ہم اس بارے میں جس مسئلہ پر بحث کر کے ایک دوسرے کی موافقت چاہتے ہیں وہ مسئلہ یہ ہے کہ جس قانون کو ہم معاشرہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس قانون کی کیا خصوصیات ہیں؟ یعنی ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ اصل قانون کی ضرورت ہے لیکن کیا معاشرہ میں بیان ہونے والے ہر قانون کا ہونا کافی ہے اور وہ معاشرہ کو فلاح و بھبود تک پہنچا سکتا ہے یا ایسا نہیں ہے، بلکہ بہت ر قانون کو خاص خصوصیات کا متحمل ہونا چاہیے؟ ہم اس بارے میں مختلف نظریات کو بیان کر چکے ہیں:

کچھ افراد کا کہنا ہے کہ قانون کو عادلانہ ہونا چاہیے اس صورت میں قانون کی خاصیت اس کا اصول عدالت پر مبنی ہونا چاہیے، کچھ دوسرے افراد کہتے ہیں کہ قانون کو مصلح اجتماعی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیے، اور آخر میں تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ: قانون صرف معاشرہ کے نظم و انیت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ہوتا ہے، یورپ میں ان تین نظریوں کو سب سے مشہور و معروف نظریے مانا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف خدا پرستوں کے نظریہ مخصوصاً اسلام کے ماننے والوں کے نظریے، جو کہتے ہیں کہ قانون کو انسانوں کی دنیوی اور اضروی مصلح کا حامل ہونا چاہیے، صرف لوگوں کی خواہش، نظم اور انیت کا خواہاں نہیں ہونا چاہیے بلکہ قانون کو ایسا ہونا چاہیے جو دنیا اور آخرت میں انسانوں کی مصلحتوں کو مد نظر قرار رکھتا ہو، قانون ایسا نہ ہو کہ جس سے معاشرہ کی تمام مصلحتیں چاہے وہ مادی اعتبار سے ہوں یا معنوی اعتبار سے چاہے دنیوی اعتبار سے ہوں یا اضروی اعتبار سے یہ سب خطرہ میں پڑ جائیں، یعنی اگر قانون ان مصلحتوں میں سے کسی ایک مصلحت کے لئے خلل بن رہا ہو، تو وہ قانون بے کار ہے، اور وہ انسان اور معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا، اس بارے میں بہت زیادہ بحث کی جا چکی ہے، لیکن اب بھی کچھ تحصیل کرنے والے گروہ اور صاحب نظر افراد کے اذہان عالیہ میں شبہات باقی رہ گئے ہیں لہذا اس مسئلہ کو خصوصی تو ضیح دینا ضروری و لازم ہے۔

۲: فردی آزادی اور قانون کے درمیان رابطہ

آجکل ریڈیو، ٹیلیوژن، اخباروں اور تقریروں میں اس نکتہ پر بہت زیادہ تاکید کی جا رہی ہے کہ فردی آزادی اتنی اہم ہے کہ جس کو کوئی قانون محدود نہیں کر سکتا، اور ان آزادیوں میں کسی شخص کو رخنہ ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہوتا یعنی فردی آزادیوں کی حفاظت کرنا یہ قانون سے بالاتر ہے اور جو قانون فردی آزادیوں میں مانع ہو تو ایسے قانون کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اب ہمارے لئے اس نظریہ کی تحقیق و جستجو کرنا لازمی ہو گیا ہے تاکہ ہم اس کی تحقیق و جستجو کے بعد اس سے منطقی اور علمی نتیجہ حاصل کر سکیں درحقیقت یہ طرز فکر یورپی ثقافت کی پیداوار ہے جسکو ہم بالکل پسند نہیں کرتے، اور اس سے اجتناب کرتے ہیں اور ہمارے حکومتی ذمہ دار حضرات نے معاشرہ میں اس طرح کی ثقافت کے رائج ہونے سے خبردار کیا ہے، ہم اصلی بحث کو بیان کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر کچھ موضوعات کو بیان کر رہے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اسلام کے نظریات آسانی سے مل جائیں گے۔

یورپی ثقافت کی بنیاد کچھ عناصر پر ہے اور انسان مداری یا انسان محوری کی طرف جھکاؤ کو اس ثقافت کا سب سے پہلا، اور اصلی و بنیادی عنصر مانا جاتا ہے، یورپ میں ”ہیومانیزم“ (Humanism) درمیانی صدیوں کے آخری زمانہ کے مشہور و معروف رائیٹر اور ادباء جیسے اٹلی کے ”ڈانٹا“ کے ذریعہ ایجاد ہوئی، درحقیقت یہ نظریہ مسیحیت سے پہلے موجود تھا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عیسائیت مشرقی ممالک اور فلسطین میں پھیلی، قبل اس کے کہ عیسائیت یورپ میں پہونچے، یورپی معاشرہ بت پرست تھا، اور اس زمانہ کے سب سے اہم امپراطور (روم کے پادشاہوں کے القاب) رومی تھے جس میں شرقی روم (موجودہ ترکی) اور غربی روم (اٹلی) شامل تھے، ان ممالک میں یہودیوں کو چھوڑ کر بقیہ سب کے سب افراد بت پرست تھے ان کے معاشرہ میں مسیحیت کے داخل ہو جانے اور اس کے حاکم ہونے کی وجہ سے مسیحیت میں تحریفات ہونا شروع ہو گئیں اور بت پرستی کی کچھ چیزیں اس میں داخل ہو گئیں، اور یورپی معاشرہ نے اس طرح کی مسیحیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، ان تحریفات کے نمونے مسئلہ تثلیث اور اس کے بعد کلیساؤں میں حضرت مریم اور فرشتوں کے مجسموں کو نصب کرنا ہے، لہذا یہ کلیسا بھی پہلے بت خانوں کی طرح ہو گئے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں تحریف شدہ عیسائیت رائج ہو گئی، اور اس نے شرک کی جگہ لے لی، درحقیقت وہ شرک کی بنیاد پر قائم ہونے والی دنیاوی حکومت تھی جس میں معنویت نہیں پائی جاتی تھی جو یورپ پر عیسائی حکومت یا الہی حکومت اور آسمان و ملکوت کی طرف دعوت دینے والی حکومت کے نام سے حاکم ہوئی اور ان حکومتوں کے نام سے لوگوں پر ظلم و ستم کیا۔

یہاں تک کہ لوگ آہستہ آہستہ ان ظلم و ستم سے تنگ آ گئے اور مسیحیت سے پہلے والی زندگی کی طرف پلٹ گئے، درحقیقت اومانیزم نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی جگہ انسان اور آسمان کی جگہ زمین اور آخرت کی زندگی کی جگہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دی جائے۔

یہ اومانسٹی نظریہ کا ماحصل ہے جو انسان کو خدا کی جگہ قرار دیتا ہے، اور یہ نظریہ آہستہ آہستہ اس زمانہ کے محنتی محققین جیسے اٹلی کے مشہور و معروف شاعر و محقق ”ڈانٹا“ کے ذریعہ یورپ کے تمام ممالک میں اس کا رواج پیدا ہو گیا، اور اس طرح سے بیان کیا گیا ہے جس کے اندر ہر طرح کی چیز موجود ہو، اس بنا پر اومانیزم تمام نظریات کی ماں سمجھی جانے لگی کہ جن کی بنیاد پر یورپی ثقافت وجود پائی ہے، اور جب ہم یورپی ثقافت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نہ تو یورپی جغرافیائی ثقافت ہے اور نہ وہ لوگ مراد ہیں جو مغرب (یورپ) میں زندگی بسر کرتے ہیں چونکہ وہاں پر دوسرے مذہبوں کو ماننے والے افراد بھی رہتے ہیں، کچھ اچھے عقائد والے اور دوسرے مذاہب کے افراد بھی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہم جس ثقافت کو یورپی ثقافت کہتے ہیں وہ ایک جامع ثقافت ہے جو انسانوں کو غیر الہی راستہ بلکہ کفر کی طرف لے جاتی ہے، لہذا بہت سے مشرقی ممالک جیسے جاپان وغیرہ میں بھی ممکن ہے یہی ثقافت موجود ہو، لہذا ہم یورپی ثقافت کو جغرافیائی لحاظ سے نہیں مانتے۔

۳۔ اومانیزم اور لیبرالیزم کا قانون میں داخل ہونا

قارئین کرام ہماری بحث اور گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی ثقافت کفر و الحاد کی ثقافت ہے جس میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ انسان کے تصور سے خدا کو غائب کر دیا گیا ہے اور خود انسان کو خدا کی جگہ رکھ دیا گیا ہے، یعنی انسان ہی تمام اقتدار اور قدرت کا محور ہے۔

اس نظریہ کے تحت انسان ہی تمام ارزش اور اہمیت کو پیدا کرتا ہے، اور انسانوں کی تفکر سے زیادہ ان کی کوئی واقعیت نہیں ہوتی، انسان قانون وضع کرتا ہے اور انسان کے علاوہ کسی اور کو قانون بنانے کا کوئی حق نہیں ہوتا، انسان انسانوں کی سرنوشت کو خود معین و مشخص کرتے ہیں خدا نہیں، یہ تمام تفکر اومانیت کے اصلی عناصر ہیں کہ جن کے پیچھے پیچھے دوسرے مذاہب بھی وجود میں آگئے اور وہ طول زمان میں آہستہ آہستہ اسی ریشہ سے اُگے اور اسکے دو بہت اہم مذاہب (جو آجکل یورپی ثقافت میں اسلامی ثقافت کے مقابل بیان کیے گئے ہیں) سیکولرزم اور لیبرالیزم ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ اگر انسان کی زندگی سے خدا کا تصور ختم کر دیا جائے تو انسانی زندگی کے اہم مسائل کی دین کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی، اور اس لحاظ سے دین کو اجتماعی، سیاسی اور حقوقی مسائل سے الگ رکھنا ہوگا، اس نظریہ کی بنیاد پر اگر کچھ افراد دین کے نام پر کچھ ارزشیں اور اہمیتیں ایجاد کرنا چاہیں تو وہ ان ارزشوں کو صرف معابد اور اپنی فردی زندگی کے لحاظ سے تصور کریں، یعنی در حقیقت دین اقدار کی قرار گاہ خاص طور سے افراد کی فردی زندگی ہے اجتماعی زندگی نہیں ہے یہ وہی تفکر ہے جو دین کو سیاست اور اجتماعی زندگی کے جدی مسائل سے جدا کرتا ہے جسکو سکولارزم کہا جاتا ہے، اور آخر کار یورپی ثقافت کا دوسرا اثر لیبرالیزم ہے۔

جب تمام اقدار کا محور انسان ہو اور اس کے علاوہ دوسری کوئی اور چیز اسکی سرنوشت پر حاکم نہ ہو، تو یہ کہنا چاہیے کہ ہر وہ کام جسکو انسان کا دل چاہے اسکو انجام دے اور یہ وہی مطلق آزادی یا لیبرالیزم ہے لیکن اگر ہر انسان مطلق طور پر آزاد رہنا چاہتا ہو تو عسرو صرح لازم آئیگا اور قانون کا کوئی مقام باقی نہ رہے گا اور ظاہر سی بات ہے کہ اس طرح کی شرطوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا اور واضح طور پر معاشرہ میں قانون کی ضرورت کا احساس ہوگا، کہ ایسا قانون ہونا چاہیے جو عسرو صرح کو روک دے اور جب نظم برقرار ہو جائے اور عسرو ہرج ختم ہو جائے تو پھر قانون کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی، تو پھر ہر فرد کا دل جو چاہے گا وہ آزادانہ طور پر اس کو انجام دے گا۔

۲۔ یورپی ثقافت کے اصول اور اسلامی ثقافت سے ان کا موازنہ

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اومانیزم نظریہ کا خلاصہ سیکولرزم اور لیبرالیزم پر ہوتا ہے۔

اور انہیں دو عناصر سے اصلی یورپی ثقافت وجود پاتی ہے اور بار بار یہ جو یاد آوری کی جاتی ہے کہ تم اپنی حفاظت کرتے رہنا کہ کھیں تم پر یورپی ثقافت حملہ کمر کے تمہاری ثقافت کا جنازہ نہ نکال دے ان سے ہماری مراد بھی ثقافت ہے جسکا لازمہ لیبرالیزم اور سیکولرزم ہے، یہ ثقافت یورپ میں رائج ہوئی اور اس نے صنعت اور ٹیکنالوجی کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ معاشرہ بشری میں مختلف پرکش چیزوں کو ایجاد کیا اور دوسرے ممالک بھی کم و بیش اس ثقافت سے متاثر ہوئے اس لئے کہ معاشرہ کی معرفت رکھنے

والے محققین کا یہ عقیدہ ہے کہ یورپی ٹیکنالوجی کے صادر ہونے کے ساتھ ساتھ یورپی ثقافت بھی صادر ہونے لگی، یہ وہ واقعیت ہے جس پر موجودہ دور میں ترقی کرنے والے ممالک کو غور و فکر کرنا لازمی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا یورپی ثقافت کو قبول کئے بغیر ٹیکنالوجی کو تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ البتہ اسی موضوع کے بارے میں دوسرے مقام پر بحث کی جائیگی لیکن ہم یہاں پر مختصر طور پر یہ بتادیں کہ اب تک تو یورپی ٹیکنالوجی کے صادر ہونے کے ساتھ ساتھ یورپی ثقافت بھی تمام ممالک میں صادر کی گئی ہے، اور تمام انسان کم و بیش اس ثقافت سے متاثر ہوئے ہیں یہاں تک کہ ہمارے اسلامی معاشرہ اور اسلامی ممالک بھی اس ثقافت سے استفادہ کئے بغیر نہ رہ سکے (البتہ یہ سب اس لئے ہوا کہ اسلامی اقدار کی حفاظت کرنے میں لاپرواہی سے کام لیا گیا، یہ نہیں کہ ان دونوں ثقافتوں کو جدا کرنا ممکن نہ تھا)۔

افسوس کہ آج یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت رین فکر رکھنے والے افراد کے مختلف طبقوں میں التقاط و اختلاط (مختلف نظریوں کا آپس میں مل جانا) پیدا ہو گیا ہے کہ اسلامی ثقافت کے التقاطی تفکر کو یورپی الحادی ثقافت سے ملا دیا ہے، البتہ مختلف سطح (طبقہ) کے اعتبار سے یہ اختلاط فرق کرتا ہے:

بعض موارد میں یورپی ثقافت کا بول بالا ہے جبکہ ان موارد میں اسلام کا اتنا بول بالا نہیں ہے اور دوسرے موارد میں اسلام نے جلوہ دکھلایا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یورپی ثقافت نے غبار آلود اور اور تاریک فضا ایجاد کر دی ہے اور اسلام ناب محمدی کی صاف و شفاف فضا دنیا کے کسی کونے میں بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی ہے، ہمارے اعتقاد کے مطابق جو سب سے اہم فضا اسلامی ثقافت کو صاف و شفاف کر سکتی ہے اور اس سے دوسری ثقافتوں کے غبار کو صاف کیا جاسکتا ہے وہ جمہوری اسلامی ایران کی فضا ہے اور جب اس نظام میں اس طرح کی طاقت و قدرت موجود ہے اور عوام الناس اسلام اور اسلامی ثقافت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہیں اس بنا پر انقلاب اسلامی یورپی ثقافت کے لئے سب سے بڑے خطرہ کے عنوان سے بن کر ابھرا ہے۔

جیسا کہ کچھ دن پہلے واشنگٹن کے نزدیک ایک یورپی سیاست کی تحقیق کرنے والے ادارہ کے ایک رئیس نے کھا تھا کہ جمہوری اسلامی ایران دنیا کے لئے سب بڑا خطرہ ہے، ظاہر ہے کہ جس چیز سے وہ ڈرتے ہیں اور اپنے لئے ایک اہم خطرہ سمجھتے ہیں وہ اقتصادی خطرہ نہیں ہے اس لئے کہ ان کا اقتصاد ہم سے کھیں بہت زیادہ اچھا ہے، اسی طرح ان کو نظامی خطرہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان کے پاس ایسے خطرناک اسلحے موجود ہیں کہ دوسرے ممالک میں ان جیسے نمونے نہیں ملتے، ان کے پاس ایسی فوج موجود ہے کہ دنیا کے تمام ممالک میں نہ کمیت کے اعتبار سے اور نہ کیفیت کے اعتبار سے ایسی فوج موجود نہیں ہے، بلکہ وہ تو جمہوری اسلامی ایران کی فکری، عقیدتی اور ثقافتی توانائی سے خوف کھائے ہوئے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں:

جمہوری اسلامی ایران ایسا خطرہ ہے جو زمین کے اعتبار سے نامحدود اور منحصر بہ فرد ہے، یہی چیز ان کے یورپی معاشرہ کے لئے سب سے بڑے خطرہ کا باعث ہوئی ہے، اسی وجہ سے وہ اس نظام کو ضعیف کرنے کی مسلسل جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ نظام ولایت فقیہ ایسا نظام ہے اور جب تک محور نظام ولایت کو سرنگوں نہ کر دیا جائے اس میں نفوذ نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ علماء اور اسلامی تالیفات کی ذمہ داریاں

جو چیز اسلامی ثقافت کے جوہر کو مجسم کرتی ہے انسان محوری کے مقابل میں خدا محوری ہے اس اساس و بنیاد پر یہاں پر ایک سوال پیش آتا ہے کیا اقدار و ارزش و اہمیت کا ملاک و معیار خدا کو قرار دیا جائے یا انسانی خواہشات کو؟ کیا واقعی حاکمیت خدا سے مخصوص ہے یا انسانوں سے؟ کیا ہماری اصلی فکر اندیشہ، حقوق اور زندگی کے تمام دوسرے لوازمات خدا سے مربوط ہیں یا انسانی خواہشات سے؟

اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ان مطالب کا بیان کرنا ہمارے لئے ناگوار واقعات کا سبب ہیں لیکن عصر حاضر میں علماء کا سب سے بڑی ذمہ داری موجودہ غبار آلود فضا کو اسلام کے صاف و شفاف مطالب بیان کر کے دھو ڈالنا ہے، تاکہ لوگ کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کر کے مختلف نظریوں کی تحقیق و جستجو کریں اسلام اور منابع اسلامی کے نظریہ دوسروں کے نظریوں سے جدا کریں تاکہ اسکے ذریعہ اسلام اور کفر و شرک کی حد واضح ہو جائے اور کفر و الحاد و التقاط کا نظریہ رکھنے والوں کو اسلامی محققین سے الگ کیا جاسکے، علماء کی بنیادی اور اصلی ذمہ داری یہی ہے اور قرآن بھی خاص طور سے اس بارے میں فرماتا ہے کہ: اگر علماء اور اہل علم بدعتوں کو پھیلانیں اور حقائق کو واضح نہ کریں تو ان پر خدا، فرشتے اور تمام مخلوق لعنت کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ...﴾^(۱)

”یہی لوگ ہیں جن پر خدا (بھی) لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔“

ہمارا اصلی فریضہ یہ ہے کہ ہم فضا کی وضاحت کریں تاکہ مفاہیم اور اسلام و کفر کے مابین کی حدود معین و واضح ہو جائیں اور یہ بھی معین و مشخص ہو جائے کہ کن افکار میں اختلاط و التقاط پایا جاتا ہے؟ چونکہ انہیں التقاط و اختلاط کی وجہ سے حق و باطل کے مابین عاشورا جیسا واقعہ رونما ہوا اور واقعہ عاشورا سے پہلے مسلمانوں اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی نسل پاک سے ایک شخص نے قیام کیا اور بہت سے اسلامی حقائق کی وضاحت فرمائی، لوگوں نے بھی اسلامی حقائق کو درک کیا اور سمجھداری سے کام لیا اور امام کی آواز پر لبیک کھا اور ایران میں ایک عظیم اسلامی انقلاب برپا ہو گیا۔

یہ بدیہی ہے کہ جب تک دین اسلام کے لئے اپنی تمام چیزوں کو قربان کرنے والے غیر تمند جوان موجود رہیں گے اس وقت تک دین اسلام پر ذرہ برابر بھی آنچ نہیں آنے دیں گے، اور الحمد للہ ہمارے برادران سیاسی اور اجتماعی کافی معلومات رکھتے ہیں، اور اپنے فرائض سے بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ان پر کیسے عمل کرنا چاہئے، ہم ان کے عملی فریضہ کو معین و مشخص کرنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ہمارا کام تو صرف فکری اور عقیدتی مسائل کو بیان کرنا ہے، ہم تو صرف اسلام کے عملی اور نظری اصولوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں؟

ہم تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی ثقافت کیا ہے اور یورپی اور کفر و الحادی ثقافت کیا ہے، ہم تو لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کفر و الحادی ثقافت کے اصلی عناصر اومانیزم و سیکولرزم اور لیبرلزم ہیں اور ان کے مقابل میں اسلامی نظریہ کے اصلی عناصر خدا محوری، اصالت دین و ولایت فقیہ اور خدا کی اطاعت کے دائرہ میں محدودہ کمر انسان کا فعالیت کرنا ہیں، یہ دونوں ثقافتیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہیں: پہلی ثقافت انسان کی مطلق آزادی بھانٹک کہ خدا کی اطاعت سے بھی آزاد رہنے کی دعوت دیتی ہے اور دوسری ثقافت ہم کو صرف اور صرف خداوند عالم کی اطاعت کی دعوت دیتی ہے پہلی ثقافت انسان کے تفکر اور اسکی زندگی سے خدا کو حذف کرنے اور انسان کو خود بہت باندھنے کی دعوت دیتی ہے، اور دوسری ثقافت پرچم توحید کو بلند کرنے اور انسانی زندگی میں یکتا پرستی کی فکر کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی ہمارا نظریہ اور انقلاب کا محور ہے۔

۶۔ قانون کی حقیقت اور اسلام اور لیبرلزم میں اس کی اہمیت

جس طرح ہم نے پہلی تقریروں میں بیان کیا ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے قانون ایسا ہونا چاہیے جو انسان کو اسکے مصلح اور معنوی مقصود تک پہنچائے اور صرف نظم و ضبط اور اجتماعی انیت کو پورا کرنا ہی قانون کا خاص کام نہیں ہے لیبرالی نقطہ نظر سے انسان کا صرف اور صرف دنیا سے لذت حاصل کرنا ہے، جبکہ قانون کا کام صرف اسباب لذت فراہم کرنا نہیں ہے جو چیز انسانوں کی زندگی میں ان کو لذت حاصل کرنے اور ان کا اپنی قدرت سے استفادہ کرنے میں مغل ہوتی ہے وہ دوسروں کیلئے مزاحمت ایجاد کرنا ہے، اگر قدرت اور لذتوں سے اس طرح استفادہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کی آزادی میں کوئی مزاحمت نہ ہو تو قانون اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانون کا کام صرف دوسروں کی آزادی کی حفاظت کرنا اور ان کی خواہشات نفسانی کو مکمل کرنا ہے، قانون کا یہ ہدف یورپ کی اومانیزم اور لیبرلزم کے نظریہ کا نتیجہ ہے، اور اس بنیاد پر قانون کا دائرہ بہت محدود ہو جائے گا۔

اور لوگوں کی زندگی سے حکومت کو بہت کم سروکار رکھنا ہوگا چونکہ اصل یہ ہے کہ لوگ آزاد رہیں اور جس کام کو ان کا دل چاہے اس کو انجام دیں اور اس اساس و بنیاد پر تو اس جملہ کا یہ مطلب ہوگا کہ قانون سے بالاتر آزادی کی حفاظت کرنا ہے، لیکن اسلام کی

نظر میں قانون اس کو کھا جاتا ہے جو انسانوں کو صحیح زندگی بسر کرنے کے صحیح راستہ کی ہدایت کرے اور معاشرہ کی مادی اور معنوی مصلح کی طرف ہدایت کرے، اسلامی حاکم بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جو ان مصلح کو معاشرہ میں جامہ عمل پہنائے اور ان مصلح میں رخنہ ڈالنے والوں کو روکے، لہذا اسلامی حاکم اور ڈیموکریٹک اور لیبرل حاکم کے درمیان بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے اس لئے کہ اس کو اجازت دیں تاکہ وہ موقع آئے اور لوگ اپنی خواہشات اور ہوئی و ہوس کے مطابق عمل کریں اور وہ صرف بے نظمی اور ہرج و مرج سے روکیں اور ان کو اسکے علاوہ کسی مانع کے ایجاد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آزادی قانون سے بھی بلند و بالا ہے وہ خاص طور سے اہل علم و تحصیل اور محققین ہیں اور وہ جو لوگ اپنے کو صاحب نظر سمجھتے ہیں ان کو زیادہ دقت اور مطالب کی دقیق تحقیق و بررسی کرنا چاہیے۔

اصولی طور پر ماہیت قانون کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے کوئی حق اور دوسروں کیلئے کسی تکلیف کو معین کرنا، قانون آزادی کو روکنے والا ابزار ہے، اگر یہ بنا قرار دیدی جائے کہ شخص جو اس کا دل چاہے وہ کام انجام دے تو پھر قانون کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی، قانون اس مقام پر بنایا جاتا ہے جہاں پر افراد اپنی بعض خواہشوں سے صرف نظر کریں ورنہ قانون کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، اگر یہ بنا قرار دیدی جائے کہ ہر شخص جو کچھ چاہے وہ انجام دے تو پھر ہم کو قانون کی کیا ضرورت ہے؟ نتیجہ کے طور پر ماہیت قانون کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے لئے حق اور دوسروں کیلئے کچھ وظایف معین کئے جائیں، اگر ہمارے پاس کوئی ایسا قانون ہو جو کسی حق کو تمام انسانوں کیلئے ثابت کرے تو پھر بھی وہ کسی وظیفہ فریضہ کا متضمن ہوگا، مثال کے طور پر اگر ایک بین الاقوامی یہ قانون ہو اور وہ قانون یہ حکم صادر کرے کہ ہر انسان آزاد ہے اور اس کو یہ حق ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں اپنے رہنے کے لئے جگہ کا انتخاب ہے تو اس قانون کا مفاد تمام انسانوں کیلئے حق کا اثبات کرنا ہے۔

لیکن وظیفہ معین کئے بغیر دوسروں کیلئے حق ثابت کرنا نہیں ہے ورنہ ایسے قانون کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کسی بھی جگہ رہنے کا حق رکھتا ہے اور دوسروں کو اس حق کا احترام کرنا چاہیے اور اسکی مزاحمت نہیں کرنا چاہیے، نتیجہ کے طور پر قانون یا تو تصریحی طور پر اور یا اشارہ کے طور پر کن امور کو انجام دینا چاہیے اور کن امور کو انجام نہیں دینا چاہیے کا متضمن ہے، یہاں تک کہ اگر ہر فرد کیلئے بھی حق کو ثابت کرتا ہے تو اس کا مفاد یہ ہے کہ دوسرے اس حق کی رعایت کریں اور اس کا احترام کریں۔

جو قانون یہ کہتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے یعنی اسکے علاوہ عمل نہیں کرنا چاہیے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آزادی محدود ہے یعنی کن افعال کو انجام دینا چاہیے اور کن افعال کو انجام نہیں دینا چاہئے کی معرفت ہے، نتیجتاً جو قانون آزادی کے محدود ہونے کو ناپسند کرتا ہو وہ قانون تناقض رکھتا ہے، اور قانون یعنی وہ چیز جو آزادی کو محدود کر دے تو اس بنا پر قانون سے اوپر کوئی آزادی نہیں ہے مگر کچھ مقامات پر کچھ خاص آزادیاں ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ان آزادیوں کی رعایت ہونا چاہیے، تو یہ بھی کچھ دوسرے قوانین

کے اوپر ایک قانون ہو جائیگا۔ لیکن اگر کوئی قانون آزادی کیلئے کسی طرح کی محدودیت کا قائل نہ ہو تو وہ بھی لغو اور تناقض کا متضمن ہوگا۔

اور کوئی بھی عاقل اس طرح کی باتیں نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اصل میں قانون کی شان ہی آزادی کو محدود کرنا ہے لیکن اگر اس شعار سے کہ قانون کو آزادی کے محدود کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ مطلق آزادی ہونا چاہیے یہ مراد ہو تو یہ تناقض ہے اور اگر ان کی مراد شرعی آزادیاں ہیں تو ہم ان سے یہ عرض کرتے ہیں کہ شرعی آزادی کونسی ہے؟ اور کون شخص یہ معین کمرے گا کہ مشروع آزادیاں کونسی ہیں اور نامشروع آزادیاں کونسی ہیں؟

۱۔ مشروع آزادی کا نسبی ہونا

ہر نظام اپنی خاص ثقافت کی بنیاد پر کچھ امور کو جائز اور معقول سمجھتا ہے اگرچہ دوسرے افراد ان کو کتنے ہی نامشروع کیوں نہ سمجھتے ہوں، تو پھر مطلق آزادی کا کیا مطلب؟ یعنی کوئی بھی قانون مطلق آزادی کی ضمانت نہیں لے سکتا، جب کسی قانون میں یہ لکھا جائے کہ قانون کو مشروع آزادیوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے، تو ایک ایسی میزان ہو جو یہ بتائے کہ مشروع آزادیاں کونسی ہیں؟ یعنی مشروع، معقول اور مفید آزادیوں کو کس معیار کے ذریعہ معین کیا جائے؟ اس مقام پر یہ کھا جاتا ہے کہ مشروع آزادیوں کو معین کرنے کا ذمہ دار قانون ہوتا ہے۔

بہر حال ہم پھر اپنے اصلی مطلب کی طرف پلٹتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ معاشرہ میں ہر طرح کی آزادی جائز ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ معاشرہ کیلئے کسی قانون کا ہونا لازمی نہیں ہے!! لیکن کوئی عاقل انسان اس طرح کی باتیں نہیں کرتا مگر وہ انسان جو اپنی باتوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہو اور پس جو شخص بھی آزادی کا دم بھرتا ہے یقیناً اس کی مراد محدود آزادی ہے، اب یہاں پر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آزادی کی حدود کو کون شخص اور کس معیار سے معین کمرے گا؟ اگر افراد اپنی دلخواہ مرضی کے مطابق آزادی کی حدود کو معین کریں گے تو بھی ہرج و مرج لازم آتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ہر انسان اپنے منافع کو پورا کرنے کی کوشش کریگا۔

لہذا آزادی کی حدود کو معین کرنے والا کوئی شخص ہونا چاہئے، اب قانون کو کس قانونگذار کے ذریعہ مشخص و معین ہونا چاہیے، بدیہی ہے اگر قانون گزار کا ارادہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو اور قانون کا معیار و ملاک لوگوں کی خواہشات ہوں تو عملی طور پر ہو سباز افراد غالب ہوں گے یعنی وہی چیز جو او مانیرم اور لیبر الیزم نظریہ کا بنیادی پہلو ہے، اس نظریہ میں قانون کا کردار عس و صرح کو روکنا ہے اور لوگوں کی مرضی کے مطابق ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، لیکن اسلامی نقطہ نظر سے یہ موضوع قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ بنیادی اشکال رکھتا ہے۔

۸۔ اسلام کا لیبر الیزم سے ٹکراؤ

یہ طے ہے کہ ہم اسلام کو تسلیم کر لینے کے بعد لیبر الیزم کو قبول نہیں کر سکتے ہیں اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قانون یعنی جو انسانوں کے مصالح کو پورا کرے تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر انسان جو اس کا دل چاہے وہ فعل انجام دے چونکہ یہ دونوں آپس میں سازگار نہیں ہیں، یا محور خدا ہو یا انسان، دوسرے لفظوں میں! یا ہم اللہ کو مانیں یا اومانیزم کو مانیں، اب یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کو بھی ملاک قرار دیں اور خدا کو بھی، اس طرح کی دو اصل کو قبول کرنا تعارض اور تضاد کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا شرک بھی ہے، اور اگر خدا کو نہ مانے تو یہ کفر و الحاد ہے، اس لئے کہ اسلام اور کفر و الحاد آپس میں ایک دوسرے کے متناقض ہیں، اور یہ آپس میں ایک بنیادی جنگ رکھتے ہیں اور اسی دلیل کی وجہ سے امریکا کے بڑے بڑے سیاست دانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک ایران میں اسلامی نظام حاکم رہے گا، ہم ایران سے سازش نہیں کر سکتے چونکہ یہ دونوں متناقض نظریے ہیں اور ان کے نظام بھی ایک دوسرے کے سازگار نہیں ہیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف نظریات میں بہت ر قانون کی کیا خصوصیتیں ہیں؟ کیا قانون کو معاشرہ میں صرف نظم برقرار کرنا چاہیے فردی خواہشات اور آزادیوں کو اگر وہ ایک دوسرے کی مزاحمت نہ کریں تو ان کو پورا کرنا چاہیے، یا قانون کو انسان کے واقعی مصالح کو پورا کرنا چاہیے چاہے اکثر افراد اس کو چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں، البتہ اگر لوگوں نے اسکو تسلیم کر لیا تو اسکو عملی جامہ پہنا دیا جائیگا اور اگر تسلیم نہ کیا تو اسی طرح عالم انشا میں باقی رہیگا۔

پس اصل افراد ہیں لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ مشروعیت قانون کیا ہے؟ کیا مطلوب قانون صرف وہ قانون ہے جو لوگوں کے دل خواہ ہو اور ان کی خواہشوں کو پورا کرتا ہو یا قانون مطلوب وہ قانون ہے جو لوگوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہو؟ یہ دونوں نظریے آپس میں ایک دوسرے سے صلح نہیں کر سکتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے ملا دینا ایک تاریک فضا کو ایجاد کرنا ہے تاکہ جو افراد غلط طریقہ سے استفادہ کرنے کے چکر میں ہیں وہ گندے پانی سے مچھلی کا شکار کر لیں، ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ فضا کو صاف و شفاف کریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام کیا ہے اور کفر کیا ہے اور پھر انسان جس کو چاہے انتخاب کرے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ (۲)

شاعر کہتا ہے:

متاع کفر و دین بی مشتری نیست
گروہی این گروہی آن پسندند

”دین اور کفر ایسی دو چیزیں ہیں کہ جس خریدار بہت ہیں، کچھ لوگ اسلام کے اور کچھ لوگ کفر کے خریدار بن گئے“

ہر حال میں لوگوں کو یہ جاننا چاہیے کہ کونسا متاع (مال) متاع دین ہے اور کونسا متاع متاع کفر ہے، تاکہ دونوں میں سے ایک کو منتخب کر لے، ہمارا وظیفہ دینی مفاہیم کو صاف و شفاف کرنا ہے اور اس سے ہر طرح کے غبار کو دور کرنا ہے تاکہ لوگ آگاہ طور پر انتخاب کریں، اور کچھ لوگوں نے ایسی فضا بنائی ہے اور چاہتے ہیں کہ دین کی جگہ ڈیموکریسی اور آزادی کو حاکم کر دیں،، لیکن ہمیں ہر حال میں ان لوگوں سے ہوشیار ہونا چاہئے اور توجہ رکھنا چاہئے کہ کیا کھیں اور کیا کریں۔

۹۔ اسلام اور ڈیموکراسی میں قانون گذاری

ہم اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام اور ڈیموکراسی کے درمیان کبھی صلح نہیں ہو سکتی ہے، ڈیموکراسی یعنی مردم سالاری یا لوگوں کی حکومت، دوسرے الفاظ میں لوگوں کی رائے اور نظریہ کو معتبر سمجھنا، اب اس اعتبار کو محدود ہونا چاہیے یا لا محدود؟ کیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اصالت و میزان لوگوں کی رائے کے ساتھ ہے یعنی چاہے وہ کتنا ہی خدا کی مرضی کے خلاف کیوں نہ ہو یا لوگوں کی رائے اس حد تک معتبر ہے کہ حکم خدا اور ارادہ خدا کے متضاد نہ ہو؟ یورپ میں اس چیز کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اصلی ملاک لوگوں کا نظریہ ہے اور آسمان و زمین میں کسی دوسری طاقت کو لوگوں کی سرنوشت اور قانون گذاری میں لوگوں کے مابین دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں قانون وہی ہے جسکو لوگ چاہتے ہیں۔

یہاں پر ایک یہ سوال پیش آتا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے کا ملاک و معیار تمام افراد کا ایک نظریہ پر متفق ہونا ہے یا اکثر افراد کا متفق ہو جانا ہی کافی ہے؟ عملی میدان میں تو تمام افراد متفق نہیں ہو سکتے ہیں، اور اگر اکثر افراد کا متفق ہونا کافی ہے تو تمام افراد کا وظیفہ کیا ہوگا اور اکثر افراد کی رائے ان کیلئے کتنی معتبر ہوگی؟ درحقیقت آجکل کی ڈیموکراسی، ڈیموکراسی اور نخبہ گرانی (منتخب کی ہوئی چیز) سے بنتی ہے۔

یعنی لوگ قانون بنانے کے لئے نمائندوں کو انتخاب کرتے ہیں، اب اگر اکثر افراد کی نظرچنیدہ افراد کے نظریہ سے مختلف ہو، تو دونوں میں سے کس کا نظریہ معتبر ہوگا؟ البتہ عام طور سے چنیدہ افراد لوگوں کی خواہش کے مطابق قانون بناتے ہیں اس لئے اگر وہ ایسا نہ کریں تو اگلے الیکشن میں کوئی ان کو ووٹ نہیں دے گا اور وہ منتخب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے لوگوں کی خواہش کو پورا کرتے ہیں اور انہیں کی مرضی کے مطابق قانون بناتے ہیں، لیکن بعض موقعوں پر لوگوں کے نظریہ اور اکثرچنیدہ افراد کے نظریہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کا ہدف یہ ہے کہ ایران میں حکومت علماء، ولایت فقیہ اور حکومت اسلامی کے مقام پر ڈیموکریٹک حکومت قائم ہونی چاہیے، ڈیموکریٹک کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی خواہش کے علاوہ کوئی دوسری چیز قانون کو معین کرنے میں دخالت نہیں رکھتی ہے کیا مسلمان اس کو تسلیم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

اسلام ڈیموکریسی کے ساتھ سازگار ہونے کا دعویٰ کرنے والے افراد کے بارے میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ لوگوں کی رائے اگر وہ خدا کے قطعی حکم کے برخلاف ہو تو کیا وہ پھر بھی معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر نہ ہو تو ڈیموکریسی ایجاد نہیں ہوئی ہے اور اگر ملاک اعتبار لوگوں کی رائے ہے اور خدا کے قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس صورت میں ڈیموکریسی اسلام کے ساتھ سازگار نہ ہوگی، کیا اسلام خدا و رسول کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

کیا اس کے علاوہ بھی کوئی دوسرا اسلام ہے؟ آجکل یہ کھا جاتا ہے کہ اسلام میں متعدد قرائت ہیں لیکن جس قرائت کی بنا پر انقلاب برپا ہوا وہ یہ ہے کہ احکام خدا اور الٰہی اقدار کو معاشرہ میں حاکم ہونا چاہئے، اور جن افراد نے اس انقلاب کو برپا کیا اور اپنے خون کے آخری قطرہ تک اس کی حمایت کی اور آئندہ بھی حمایت کرتے رہیں گے ان کا ہدف اسکے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اب اگر قانون گذاری کے مسئلہ میں ڈیموکریٹک کا مطلب انسانوں کی رائے کو اصل قرار دینا ہے یہاں تک کہ اگرچہ ان کی رائے حکم خداوندی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اسلام کے نقطہ نظر سے ایسی ڈیموکریٹک مردود ہے، لیکن اگر ڈیموکریٹک کا مطلب دوسرا ہو اور لوگ مبانی اور اصول اور اسلامی اقدار کی محافظت کرتے ہوئے اپنے اجتماعی معاشرہ اور قانونی مسائل میں اپنے چنے ہوئے افراد کے ساتھ حق دخالت رکھتے ہوں اور اپنے منتخب کئے ہوئے افراد کے ساتھ زمان و مکان کی خاص شرطوں کا خیال رکھتے ہوئے قوانین بنائیں تو یہی چیز ہمارے اسلامی ملک ایران میں پائی جاتی ہے، اور پارلیمنٹ کے ممبران بھی اس لائحہ کے بارے میں بحث اور مشورہ کر کے اسکو تصویب کر سکتے ہیں، لیکن پارلیمنٹ کے تصویب کئے ہوئے قوانین اس وقت معتبر ہوں گے جب وہ اسلامی احکام کے مخالف نہ ہوں۔

بہر حال یہ جو لوگوں کو زمان و مکان کی خاص شرائط کے ساتھ متغیر مقررات (قوانین) کو معین کرنے کی خاطر افراد کو منتخب کرنا پڑتا ہے، یہی چیز ہمارے ملک میں رائج ہے اور امام خمینی (رہ) نے بھی اسی روش کی تائید فرمائی ہے، اور ہمارے اساسی (بنیادی) قوانین نے بھی اس کی تائید کی ہے اگر قانون گذاری میں ڈیموکریٹک کا یہی مطلب ہے تو ایسی ڈیموکریٹک کا کوئی مخالف نہیں ہے۔

۱۰۔ اسلامی حکومت میں معتبر قانون

جامع مسئلہ کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ جب لوگوں کے نمائندے اسلامی پارلیمنٹ میں کسی قانون کو تصویب کرتے ہیں تو کیا یہ قانون اس لئے معتبر ہے کہ لوگوں کے نمائندوں نے اس کو ووٹ دے کر منتخب کیا ہے اور اصل میں لوگوں کے نمائندوں کو اسی

کام کیلئے منتخب کیا ہے یا اس لئے معتبر ہے کہ ولی فقیہ نے اسکی تائید فرمائی ہے؟ ہمارے نقطہ نظر سے انسان کو اپنی زندگی میں سب سے پہلے جس حق کی رعایت کرنا چاہیے وہ حق خدا ہے، اور اگر یہ بنا ہے کہ ہم حقوق کی رعایت کریں تو خداوند عالم کا حق سب سے پہلے مقدم ہے اور انسانوں پر خداوند عالم کا سب سے بلند وبالاحق، حق ربوبیت ہے اور یہ ربوبیت دو شعبہ رکھتی ہے:

۱۔ ربوبیت تکوینی -

۲۔ ربوبیت تشریعی

ربوبیت تشریعی کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم جو دستور دے وہ انسانوں کیلئے واجب المآجرا ہے، اب اگر خداوند عالم کسی چیز کی بھی فرمائے تو اس کو انجام نہیں دینا چاہیے اور خداوند عالم کے قوانین و احکام سے سرپیچی کرنا ربوبیت الہی کے حق کو ضائع کرنا ہے اور اس قانون کا انکار کرنا اور اسکو معتبر نہ جاننا ایک قسم کا شرک ہے، اس بنیاد پر اسلامی معاشرہ میں وہ قانون معتبر ہوگا جو خداوند عالم کی رضا کے مطابق ہوگا اگر خدا کسی قانون کی بھی فرمائے تو وہ قانون معتبر نہیں ہوگا، چونکہ حق خدا ضائع ہوا ہے اور جب حق خدا ضائع ہو گیا تو اسی کے زیر اثر انسانوں کا حق بھی ضائع ہو جائے گا، لیکن قانون گذاری کے مسئلہ میں خدا نفع کو اپنے سے مخصوص کرتا ہے؟ مگر خداوند عالم تشریعی احکام اور ہم کو امر و نہی کرنے میں انسان کی مصلحت کے علاوہ اور کیا چاہتا ہے؟ اب اگر کسی مقام پر ہم سے خدا کی مرضی کے خلاف رفتار ہوئی ہے تو گویا وہ انسانوں کی مصلحت کے خلاف رفتار ہوئی ہے۔

نتیجہ کے طور پر انسانوں کے مصالح کی حفاظت جو قانون کے معتبر ہونے کا اصلی رکن ہے وہ خطرہ میں پڑ جائے گا، تو پھر ایسا قانون معتبر نہ ہوگا، اسی وجہ سے نمائندوں کے ذریعہ کسی قانون کے تصویب ہو جانے کے بعد ایک اور چیز یہ معین کی گئی ہے کہ کچھ قانون اور دین کی معرفت رکھنے والے افراد اس قانون کی شرع سے مطابقت کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ قانون خداوند عالم کے حکم کے خلاف ہے یا نہیں؟ اس کو شورائے نگہبان کھا جاتا ہے۔

اگر صرف قانون کے معتبر ہونے میں لوگوں کی رائے کا ہی کافی ہوتی تو فقہاء شورائے نگہبان کس لئے؟ چنانچہ لوگ اپنے نمائندوں کو رائے (ووٹ) دیتے ہیں اور ان کے نمائندے بھی لوگوں کی درخواست پر ایک قانون تصویب کر کے وضع کر دیتے ہیں اور وہی قانون معتبر ہوتا ہے!

لہذا جمہوری اسلامی نظام میں شورائے نگہبان کا پہلا اور بالذات مقام یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے وضع کئے ہوئے قوانین یعنی جس کو لوگوں نے نمائندوں کے ذریعہ ووٹ دیا ہے اسکی احکام شرع سے مطابقت کریں کہ انھیں وہ قانون حکم خداوندی کے خلاف تو نہیں ہیں؟ یورپی ثقافت سے متاثر افراد اور جو لوگ دشمن کی مدد کرتے ہیں شورائے نگہبان کو حذف کرنے کا دم بھرتے ہیں اسکی وجہ بھی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا فلٹر نہ ہو جو قوانین اسلام کو غیر اسلامی قوانین سے الگ کرے۔

حقیر صرف آپ حضرات کی اطلاع کے لئے یہ عرض کر رہا ہے (شاید آپ کو یقین نہ آئے اور انشاء اللہ وہ دن نہ آئے کہ اسکا حقیقی مصداق وجود میں آجائے) کہ یورپی ثقافت اور لیبرال کے سارے افراد اسلام اور ولایت فقیہ کو اساسی قانون سے حذف کرنے کے چکر میں ہیں، خدا دشمنان اسلام اور نظام اسلامی کے دشمنوں کو کبھی ایسا موقع نہیں دے گا۔ انشاء اللہ۔

حوالہ

۱۔ سورہ بقرہ آیت ۱۵۹

۲۔ سورہ کھف آیت ۲۹

قانون کے سلسلے میں غرب کی مادی نگاہ

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ایسا قانون جو انسان کی دنیا و آخرت کی سعادت کا ضامن ہو، اور مجری قانون کو بھی قانون کو اسکے مصادیق پر مطابقت کرنے میں مکمل طور پر آگاہ، دلسوز، متقی، عادل اور طاقت ور ہونا چاہیے، جیسا کہ مدیریت کا لازمہ بھی یہی ہے۔

حکومت کے سلسلہ میں اسلام کا یہ اصل نظریہ ہے کہ جس کو ہمارا معاشرہ ولایت فقیہ کے نام سے جانتا ہے اس نظریہ کو بیان کرتے وقت ہم نے بیان کیا تھا کہ انسان کا تنہا جنگل یا غار میں زندگی بسر کرنا ممکن ہے، لیکن کبھی کبھی انسان کی مادی اور معنوی پیشرفت اجتماعی زندگی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، تمام علوم، فنون اور ٹیکنالوجی اجتماعی زندگی کا ہی ثمرہ ہے، یہاں تک کہ جو افراد خود سازی اور تہذیب و اخلاق اور سیر و سلوک اور عرفان کے راستوں کو طے کئے ہوئے ہیں وہ اجتماعی زندگی کے اثر اور اپنے اخلاق کے اساتذہ اور مربیوں کے ذریعہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔

اگر بشر کے مابین یہ ارتباط و رابطہ نہ ہوتا تو وہ کبھی مادی اور معنوی پیشرفت حاصل نہیں کر سکتے تھے، اس بنا پر انسان کیلئے اجتماعی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس لئے کہ افراد اس نعمت الہی سے استفادہ کریں تو اجتماعی زندگی کو گزارنے کے لئے ان سب پر حاکم ہونے والے کچھ قوانین کا ہونا ضروری ہے۔

بدیہی ہے کہ اگر قوانین نہ ہوں تو معاشرہ میں بے نظمی، اختلال اور عسرو حرج لازم آئے گا اور انسانی زندگی حیوانی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی، بعض محققین کہتے ہیں کہ انسان ذاتی طور پر ایک دوسرے کیلئے بھیڑیے کی مانند ہیں اور ان کو کسی زبردستی طاقت کے ذریعہ معتدل کرنا چاہیے لیکن اس طرح کا رویہ افراط کرنے والے انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، بہر حال انسان کے اندر بہت سے ایسے جاذبات پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کو نظم اور قانون کے ذریعہ مہار نہ کیا جائے تو معاشرہ میں فساد پھیل جائے گا۔

اس کے بعد یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ قوانین کس طرح کے قوانین ہونے چاہئیں اور ان میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں تاکہ وہ انسانی معاشرہ کی دنیا اور آخرت کی سعادت کی طرف ہدایت کر سکیں؟ مختصر طور پر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کو معاشرہ میں صرف نظم اور امنیت برقرار کرنے والا ہونا چاہیے اسکے علاوہ قانون کا اور کوئی فریضہ نہیں ہے، دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ قانون کو معاشرہ میں نظم و امنیت کے علاوہ عدالت کو بھی برقرار کرنے والا ہونا چاہیے اس بنا پر قانون کی تعریف کرنے میں مختلف نظریے بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ ہم نے مجمل طور پر بیان کیا ہے، اسی بارے میں کچھ افراد کہتے ہیں کہ معاشرہ میں انسانوں کے طبعی حقوق کے خلاف ہونے والے قوانین کو نافذ نہیں کرنا چاہئے۔

اس مندرجہ بالا نظریہ کی تائید میں اخباروں، رسالوں اور تقریروں میں مختلف طرح کے انگیزہ بیان کئے جاتے ہیں اور کھا جاتا ہے کہ آزادی انسانوں کے طبعی حقوق کی بیان گر ہے، اور کوئی قانون انسانوں سے اس طبعی حق کو چھین نہیں سکتا ہے، ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ نظریے مختلف اشخاص کی طرف سے اور مختلف انگیزوں کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور میرا بذات خود ان افراد کے ساتھ کوئی واسطہ بھی نہیں ہے کہ ان مطالب کو بیان کرنے والے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا کیا انگیزہ ہے اور وہ کیوں ان مطالب کو بیان کرتے ہیں؟ میں صرف اس عنوان سے کہ طالب علم ہوں اور پچاس سال سے میرا علوم دینی سے سروکار ہے میں صرف فلسفہ حقوق یا فلسفہ سیاست کے بارہ میں اسلامی نقطہ نظر سے تو بحث کر سکتا ہوں اور اپنا نظریہ پیش کر سکتا ہوں، اور شاید اکثر افراد کو معلوم ہوگا کہ میرا کسی گروہ، کسی حزب، اور کسی تشکیلات سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور حقیر صرف وظیفہ شرعی کے حکم سے مطالب پیش کر رہا ہوں۔

اگر کچھ افراد معاشرہ میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں، لوگوں کے سامنے غلط تفسیروں کو پیش کرتے ہیں یا مطالب میں تحریف کیا کرتے ہیں، وہ ان تفسیروں کی ابتدا یا آخر سے کچھ کلمات کو حذف کر دیتے ہیں اور ایک جملہ ہوتا کسی کا ہے اور اس کو کسی اور سے منسوب کر کے بیان کیا کرتے ہیں اور اس کو ذرہ بین کے سامنے رکھ کر اس سے غلط استفادہ کرتے ہیں تو میرا ایسے افراد سے کوئی رابطہ نہیں ہے، معاشرہ میں ایسے افراد ہمیشہ رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔

اگر آپ کے یاد ہو تو میں نے پہلے بھی مکرر اس مسئلہ کی تاکید کی ہے کہ ہم کبھی کبھی ایسا کلمہ استعمال کرتے ہیں کہ اس کا دقیق اور مشخص و معین مفہوم نہیں ہوتا اور ہر شخص اپنی قوت فہم کے مطابق اس سے مطلب اخذ کرتا ہے اور یہی اشتباہ غلطی کا سبب ہوتا ہے اور اس چیز کا باعث ہوتا ہے کہ سننے والا صحیح طریقہ سے کھنے والے کی بات کو نہیں سمجھ سکا اور بعض موقعوں پر یہ مغالطہ کا سبب ہوتا ہے، کبھی تو اتفاق سے مغالطہ ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی شخص جان بوجہ کر مغالطہ کرتا ہے۔

منجملہ ان کلمات میں سے ایک کلمہ ”حق طبعی“ ہے جو اس جگہ پر بیان کیا گیا ہے جبکہ اصولی طور پر اس طرح بیان ہونا چاہیے کہ ”حق“ کیا ہے اور اسکے طبعی ہونے کا کیا مطلب ہے؟

۲۔ مکتب حقوق طبعی

جو افراد فلسفہ حقوق سے آشنا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ فلسفہ حقوق کے مکاتب میں سے ایک ”حقوق طبعی“ ہے، گزشتہ زمانہ اور جب سے تاریخ فلسفہ مدون ہوئی ہے کچھ لوگوں نے اس موضوع سے متعلق بحث کی ہے۔

یونان کے بعض قدیم فلاسفہ معتقد تھے کہ: انسان حقوق رکھتے ہیں جن کو طبیعت نے ان کو دیئے ہیں انسان کی طبیعت میں حقوق وضع کئے گئے ہیں اور کوئی شخص ان حقوق کو ان سے سلب نہیں کر سکتا، اس لئے کہ انسانی طبیعت نے افراد کیلئے ان حقوق کا

ایجاب کر لیا ہے اور اسی بنیاد پر وہ نتیجہ گیری کرتے ہیں اور ظاہراً یہ نتائج ایک دوسرے کے سازگار نہیں ہوتے اور یھیں سے فلسفہ حقوق و اخلاق کے باب میں ایک معروف مغالطہ ایجاد ہوا جسکو ”مغالطہ طبیعت گرایا نہ“ کھا جاتا ہے، کیونکہ کچھ افراد کہتے ہیں کہ انسان متعدد طبیعتیں رکھتا ہے مثال کے طور پر سفید گورے انسانوں کی ایک طبیعت ہوتی ہے اور کالے انسانوں کی دوسری طبیعت ہوتی ہے، کالے انسان جسم کے اعتبار سے گورے انسانوں سے زیادہ طاقتور اور فکری اعتبار سے ضعیف (کمزور) ہوتے ہیں، اسی طرح کا نظریہ ارسطو کا بھی نقل ہوا ہے (یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ حقیران نظریات کو تسلیم نہیں کرتا ہوں اور فقط نقل کرتا ہوں) جب کالے انسان بدن کے اعتبار سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں تو ان کو صرف بدنی کام انجام دینا چاہیے؟! اور گورے افراد فکری اعتبار سے زیادہ قوی ہیں تو معاشرہ کے تمام اداری کام ان کے حوالہ کر دینے چاہیے، نتیجتاً بعض انسان دوسرے انسانوں کی خدمت کیلئے پیدا ہوئے ہیں اسی وجہ سے غلامی ایک ”طبیعی“ قانون ہے، ہم ابھی اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ کیا کالے انسانوں کی طبیعت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے یا نہیں؟ یہ خود ایک مفصل بحث ہے اور اس کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہے۔

بہر حال طول تاریخ میں حقوق طبیعی کے باب میں سب سے زیادہ عاقلانہ، معتدل اور سالم مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی چیز انسانوں کی طبیعت کھلی کی مقتضی ہوتی ہے تو وہ مستحق ہوتی، انسان کو اس طرح کی طبیعت کھلی کے اقتضا سے محروم نہیں کرنا چاہیے، یہاں تک تو مطلب کچھ قابل تسلیم ہے لیکن اس کے قطعی اثبات کے لئے استدلال کی ضرورت ہے کہ کیوں جو چیز انسان کی طبیعت کے متقاضی ہے اس کو بجالایا جائے اور انسان کو اس سے محروم نہ رکھا جائے؟ یہ بہر حال اس مطلب کے اصل مشترک کے عنوان سے تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جو انسان کی طبیعت کی اقتضا کرتی ہے اور طبعی طور پر وہ تمام انسان تقاضہ کے اعتبار سے مشترک ہے تو انسان کو اس طرح کی ضرورتوں سے محروم نہیں کرنا چاہیے اس مطلب کی تائید میں عقلی استدلال بھی موجود ہیں جن کو ہم فعلی طور پر بیان نہیں کرنا چاہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان ضرورتوں کے مصادیق کیا ہیں؟ انسان کی طبیعت کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تمام انسانوں کو غذا کی ضرورت ہے اس بنا پر کسی انسان کو کھانا کھانے محروم نہیں کرنا چاہیے یعنی نہ اسکی زبان کاٹی جائے یا اسکو کوئی ایسی دوا کھلا دی جائے جس کی وجہ سے وہ بات کرنے سے محروم ہو جائے اور یا اسی طرح کے دوسرے امور، لیکن اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ اس طرح کے مطالب بیان کرنے کے خاص اہداف ہوتے ہیں۔

۳۔ یورپ میں حقوق بشر کی حدود

آپ حضرات جانتے ہیں کہ اس عصر (دور) کے آخر میں عالمی پیمانہ پر حقوق بشر کے عنوان سے ایک مسئلہ کا اعلان کیا گیا، شروع میں اس اعلان کی چھیالیس ملکوں کے نمائندوں نے تائید کی اس کے بعد آہستہ آہستہ دوسرے ممالک بھی ان سے ملحق ہو گئے اور

نتیجتاً وہ اعلان عالمی اعلان کی صورت میں بدل گیا، اس اعلان میں انسانوں کیلئے حقوق بیان کئے گئے، منجملہ یہ حقوق کہ آزادی، بیان، مکان منتخب کرنے کی آزادی، شغل اختیار کرنے کی آزادی، مذہب انتخاب کرنے کی آزادی اور ہمسرا انتخاب کرنے کی آزادی ہے۔ یہ حقوق (جن کیلئے اس اعلان میں استدلال بھی نہیں کیا گیا) کھان سے وجود میں آئے اور کس طرح تمام انسانوں کے حقوق کے عنوان سے بیان کئے گئے اسکا مفصل ایک تاریخچہ ہے، فلسفہ حقوق سے آشنا حقوق دانوں کو (خاص طور سے مسلمان حقوق دان) کی طرف سے اس اعلان میں بہت سی بحثیں بیان کی گئی ہیں، منجملہ یہ بحث کہ! وہ فلسفی مطالب جن کو تم انسانوں کے حقوق کے عنوان سے بیان کرتے ہو اور ان کو مطلق جانتے ہو اور تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کو کسی کو محدود کرنے کا حق نہیں وہ کیا ہیں؟ اور ان کیلئے کون سا استدلال پایا جاتا ہے؟

کیا ان کی مشخص و معین کرنے کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ حقوق مطلق طور پر یہ حقوق قانون سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور کسی قانون کو ان حقوق کو محدود کرنے کی اجازت نہیں؟ کیا کوئی قانون آزادی بیان کی حدود کو معین کرنے کی اجازت نہیں رکھتا؟ کیا کسی قانون کو انتخاب ہمسرا کو محدود کرنے کی اجازت نہیں؟ کیا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو یہ بیان کر سکے کہ تم کو اپنی مملکت کی حدود سے باہر مسکن کو انتخاب کرنے کا حق نہیں ہے؟ کیا کسی قانون کو ان حقوق کی حدود کو مشخص و معین کرنے کی اجازت نہیں ہے؟ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں مطلب طبعی حق ہے اور انسان کی طبیعت کے متقاضی ہے اور بالفرض اس پر عقلی استدلال بھی موجود ہو تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حقوق کی کوئی حد نہیں ہے؟ اگر حد بندی ہے تو کون اس حد بندی کو کون معین و مشخص کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خود اعلان کو لکھنے والے اور اکثر اس اعلان کی تفسیر کرنے والے (جہاں تک حقیر کی اطلاع میں ہے) بھی ان سوالوں کا صحیح جواب دینے سے کتراتے نظر آتے ہیں۔

آخر کار یہ کہ آزادی قانون سے بلند و بالا ہے اس سے مراد کیا ہے؟ کیا کچھ ایسی آزادیاں بھی ہیں جن کو محدود کرنے کا کسی قانون کو حق نہیں؟ کیا ہم یہ سوال نہیں کر سکتے کہ ان آزادیوں کی حد کھان تک ہے؟ کیا آزادی بیان کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص جو کچھ اسکا دل کھے وہ سب کھ ڈالے؟! ہم تو یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ کوئی ملک ایسی اجازت نہیں دیتا اور آزادی بیان کیلئے حد بندی کا قائل ہوتا ہے، مثال کے طور پر با شخصیت افراد کی توہین کرنا دنیا میں کھیں بھی جائز نہیں ہے۔

۴۔ آزادی کی حد بندی میں تعارض کا ظاہر ہونا

اب یہ سوال درپیش ہے کہ آزادیوں کی حد بندی کھان تک ہے اور کون اس کو معین کرتا ہے؟ اس کا مجمل جواب یہ ہے کہ جب یہ کھا جاتا ہے کہ آزادی قانون سے بلند و بالا ہے اور اس کو محدود نہیں ہونا چاہیے اس سے مراد شرعی آزادیاں ہیں، کچھ افراد کہتے ہیں کہ مشروع اور معقول آزادیاں اور کچھ دوسرے افراد نے دوسری قید کا اضافہ کیا ہے، حقوق بشر کے اعلان میں اس کو ”اخلاقی“ سے

تعبیر کیا گیا ہے یعنی اخلاقی موازنہ کے ساتھ حقوق کی رعایت کرنا اور کم و بیش یہ ایک مبہم معنی رکھتا ہے اور مشروع قانون سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ دین اسلام جیسی شریعت نے اس قانون کو جائز قرار دیا ہو، اگرچہ لغت کے اعتبار سے ریشہ مشروع اور شریعت ایک ہے لیکن حقوق و سیاست کے بارے میں مشروع سے مراد وہ قانون ہے جسکو حکومت معتبر جانتی ہو نہ یہ کہ ہر حال میں شریعت نے ہی اس کو اجازت دی ہو، بعض متدین افراد کو یہ مطلب شک و شبہ میں نہ ڈال دے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مشروع حقوق یا مشروع آزادیاں تو ان کو شریعت اسلام نے مشخص و معین کیا ہے، مشروع سے ان کی مراد وہ حقوق ہیں جو معتبر اور قانونی ہیں، اور نامشروع سے مراد دوسروں کے حقوق سے تجاوز کرنا ہے۔

لیکن یہ سوال درپیش ہے کہ کونسے حقوق مشروع اور معقول ہیں اور کونسے نامشروع اور نامعقول ہیں؟ اور کس شخص کو انہیں معین و مشخص کرنا چاہیے؟ ان کے پاس اس جواب کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ آزادی سے مربوط جزئیات اور حدود کو قانون معین و مشخص کرتا ہے اور یچیں سے سب سے پہلے تناقض اور تعارض کا آغاز ہوتا ہے کھ: ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ حقوق اور آزادیاں قانون سے زیادہ اونچا درجہ رکھتی ہیں اور کوئی قانون ان کو محدود نہیں کر سکتا ہے، لیکن جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ آزادی مطلق ہے یا محدود؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کھ: مطلق آزادی نہیں ہے چونکہ وہ صحیح جواب نہیں دے سکتے اس لئے کہتے ہیں کہ ہماری مراد مشروع آزادیاں ہیں۔

جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ مشروع سے کیا مراد ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ جس چیز کو قانون نے تصویب کر دیا ہو، یعنی قانون آزادی کی حد بندی کو مشخص و معین کرتا ہے، اور ابھی تو تم نے تو یہ کھا تھا کہ یہ آزادیاں قانون سے بلند و بالا ہیں۔ ممکن ہے آپ اس کا یہ جواب دیں کہ مشروع اور معقول آزادیوں سے تمام انسان اور عقلائے عالم واقف ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں کہ جس مطلب کو تمام انسان اور عقلائے عالم جانتے ہوں تو پھر بحث ہی ختم ہو جاتی ہے، چونکہ ہم اور تمام مسلمان انہیں میں شمار کیے جاتے ہیں، اور دنیا میں تقریباً ایک میلارد اور چند لاکھ مسلمان ہیں اور عقلاء بھی انہیں میں شامل ہیں، اور سب یہ کھ سکتے ہیں کہ اسلام میں کس قسم کی آزادیوں کو قبول کیا گیا ہے اور وہ کس قسم کی آزادیوں کو قبول کرتے ہیں اور کس قسم کی آزادیوں کو رد کرتے ہیں، ہماری تمام معلومات اور مطالعات کے مطابق ابھی تک یہ سوال بلا جواب ہے اور فلاسفہ حقوق کے پاس اس کا کوئی قطعی جواب نہیں ہے کہ آزادیوں کو کونسی چیز محدود کرتی ہے؟

۵۔ حقوق بشر میں آزادی کی اہمیت

حقوق بشر کے اعلان کی شرح کرنیوالوں اور فلاسفہ حقوق نے اپنی فلسفہ کی کتابوں میں آزادی کی حد بندی کے بارے میں مندرجہ ذیل چیزیں لکھی ہیں:

۱۔ جس چیز کو فردی آزادیوں کو محدود کرنے کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے وہ دوسروں کی آزادی ہے، یعنی ہر فرد وہاں تک آزاد ہے جہاں تک وہ دوسروں کا مزاحم نہ ہو اور دوسروں کے حقوق سے تجاوز نہ کرے، فلاسفہ حقوق نے اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے بارے میں بہت زیادہ پافشاری کی ہے اور حقیقت میں حقوق بشر کے اعلان میں جو یورپ کے فلاسفہ حقوق کی انجیل کے مانند ہے اس چیز پر بہت زیادہ تاکید کی ہے کہ ہر انسان وہاں تک آزاد ہے جہاں تک وہ دوسروں کا مزاحم نہ ہوتا ہو، لیکن اگر فردی آزادی سے دوسروں کو زحمت ہوتی ہو وہ اس طرح کی آزادی سے محروم ہوگا اور یھیں پر آزادی محدود ہو جاتی ہے۔

یہاں پر بہت سے سوال پیش آتے ہیں: پہلا سوال: تم دوسروں کی مزاحمت کرنے کو کن مقولوں سے تعبیر کرتے ہو؟ کیا یہ مزاحمت صرف امور مادی میں ہے یا امور معنوی کو بھی شامل ہوتی ہے؟ کیا لوگوں کے دینی مقدسات کی مخالفت کرنا ان کی آزادی کی مخالفت کرنا ہے یا نہیں؟ یورپی لیبرل کا نظریہ کہتا ہے کہ آزادیوں کی حد بندی معنوی ادوار کو شامل نہیں ہوتی اور امور معنوی کی مخالفت آزادی کو محدود نہیں کرتی۔

لہذا جب یہ کھا جاتا ہے کہ دین اسلام خدا و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مقدسات اسلام کی اہانت کرنے والے کو مرتد سمجھتا ہے، مثال کے طور پر اسلام، سلمان رشدی کو مقدسات اسلام کی اہانت کرنے کی وجہ سے واجب القتل سمجھتا ہے تو وہ اس چیز کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ بیان آزاد ہے، وہ محقق ہے جو چاہے لکھ سکتا ہے، تم بھی جو چاہو وہ لکھو! تو ہمارا ان سے یہ سوال ہے کہ اس کتاب کے مطالب سے دوسروں کی مقدسات کی اہانت ہوتی ہے؟ تو حقیقت میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ توہین آمیز نہیں ہے۔

کیا آزادی بیان اتنا وسیع ہے کہ ایک شخص دنیا کے اس کونہ سے ایک میلیارڈ سے زیادہ مسلمانوں کی مقدس شخصیت پیغمبر جنکو مسلمان اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور اپنے ہزاروں عزیزوں کو آپ پر فدا کرنے کیلئے تیار ہیں ان کی شان میں گستاخی کرے؟ کیا اس کام کو آزادی بیان کھا جاتا ہے؟ اور یہ وہی مطلب ہے جس کو تمام لوگ درک کرتے ہیں؟ کونسی عقل، منطق استدلال اور شریعت اجازت دیتی ہے کہ ایک انسان دوسرے ایک میلیارڈ مسلمانوں کی مقدس شخصیت کی شان میں گستاخی کرے؟ اگر حقوق بشر کے اعلان میں آزادی بشر سے بھی چیز مراد ہے تو ہم بغیر کسی چون و چرا کے آرام کے ساتھ ایسے اعلان کو تسلیم نہیں کرتے۔

۶۔ یورپ میں آزادی کی حد بندی پر اعتراضات

جو افراد اس اعلان کو معتبر سمجھتے ہیں اور اس کا انجیل کی حد تک احترام کرتے ہیں ان سے ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ اعلان کیسے معتبر ہوتا ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی عقلی دلیل ہے؟ اس صورت میں تم کو اس پر عقل سے بھی استدلال کرنا چاہیے، بڑے آرام سے یہ نہیں کھا جاسکتا کہ ”آزادی قانون سے بلند درجہ رکھتی ہے اور اس کو محدود نہیں کیا جاسکتا ہے“ اگر تم یہ کہتے ہو کہ اس کا اعتبار اس وجہ سے ہے کہ ممالک کے نمائندوں نے اس اعلان پر دستخط کر دیئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اعتبار دستخط کا تابع ہے، اب جن ممالک نے اس اعلان پر دستخط نہیں کئے ہیں یا کسی شرط کے ماتحت دستخط کئے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ بھی بغیر کسی چون و چرا کے اس کی اتباع کر سکتے ہیں؟

ہر معاشرہ ثقافت، مقدس چیزیں اور خاص احکام رکھتا ہے اور اسی حقوق بشر کے اعلان کے ایک حصہ میں آیا ہے کہ ہر شخص اپنا مذہب منتخب کرنے میں آزاد ہے اور جب انسان کسی مذہب کا انتخاب کر لیتا ہے تو اس کو اس کے احکام پر عمل کرنا چاہیے کسی مذہب کے منتخب کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ صرف زبان پر جاری کر لیا جائے بلکہ انسان کو عمل کرنے میں بھی آزادانہ طور پر اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہئے۔

اب ہم نے بھی اسلام کو آزادانہ طور پر منتخب کیا ہے، اسلام کا بھی فرمان ہے کہ جو شخص بھی اولیا اسلام کی اہانت کرے گا اس کی سزا موت ہے، یورپی ثقافت کہتی ہے کہ اسلام کا یہ حکم حقوق بشر کے خلاف ہے انسانوں کے طبعی حقوق کے برخلاف ہے، اس لئے ہر انسان اپنی طبیعت کے اقتضا کے مطابق جو کچھ چاہے کھنے کا حق رکھتا ہے! نتیجہ کے طور پر حقوق بشر کے اعلان میں جو یہ دو مطلب آئے ہیں یہ ایک دوسرے کے معارض ہیں۔

ہم اپنی پہلی بحث کی طرف پلٹتے ہیں کہ ہر شخص جو چاہے وہ کھنے کا حق رکھتا ہے اس مطلب پر کونسی دلیل ہے؟ تو تم اپنے ملک میں ہر شخص کو جو کچھ وہ کہنا چاہے اس کی اجازت کیوں نہیں دیتے ہو؟ اگر کوئی شخص تھمت لگاتا ہے تو عدالت میں اس کی کیوں شکایت کرتے ہو، اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ ”آزادی بیان“ ہے اور جو میں نے چاہا وہ کھا ہے تو کس دلیل کی بنا پر اس سے یہ کہتے ہو کہ اس طرح کی باتیں مت کرو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق آزادی بیان نہیں ہے اور بعض مطالب کو بیان نہیں کرنا چاہیے، اس مطلب کو دنیا کے تمام انسان تسلیم کرتے ہیں کہ مطلق آزادی نہیں ہے ورنہ انسانیت اور معاشرہ باقی نہ رہتا جس میں کوئی قانون حاکم اور حقوق کی رعایت ہوتی۔

نتیجہ کے طور پر کوئی شخص مطلق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی حد کھاں تک ہے؟ آزادی بیان کو نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا اور ہم نے عرض کیا کہ آزادی کو لامحدود نہیں کہہ سکتے اور ایسا کسی شخص نے بھی نہیں کھا ہے اور عملی طور پر کوئی مملکت اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ ہر انسان کا جودل چاہے وہ بیان کرے اور لکھے اگرچہ وہ تھمت و افترا ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے لوگوں کی گمراہی کا سبب ہو، قومی امنیت کے برخلاف ہو۔

اگر گفتگو کرنا آزاد ہے تو ہم بھی گفتگو کرتے ہیں، اگر وہ ہم کو اجازت دیں تو ہم بھی ان سے ایک سوال کرتے ہیں، اور حقوق بشر کا اعلان لکھنے والوں کی خدمت میں مودبانہ زانوائے ادب تھے کمزریں اور ان کے سامنے اپنا سوال بیان کمزریں، ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ کس دلیل کی بنیاد پر انسان آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کچھ؟ اگر آزادی مطلق ہے تو تم خود کیوں تسلیم نہیں کرتے ہو؟ تھمت لگانے اور افترا باندھنے اور اہانت کرنے کو کیا تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ آزادی مطلق ہے؟

نتیجتاً تم نے یہ تسلیم کر لیا کہ آزادی محدود ہے، لیکن وہ کہاں تک محدود ہے؟ جہاں تک تمہارا دل چاہے وہاں تک محدود ہے؟ جب تم یہ کہتے ہو کہ دوسروں کی آزادی کا مزاحم نہیں ہونا چاہیے تو ہمارا تم سے سوال یہ ہے کہ تم دوسروں کی آزادی کو کس حد تک معتبر سمجھتے ہو؟ کیا آزادی کی حد بندی یہ ہے کہ جہاں تک دوسروں کا جانی مالی اور ان کی حیثیت کا نقصان نہ ہوتا ہو؟ کیا روح، حیات معنوی، افکار اور ان کی مقدس آرزوں پر صدمات وارد ہوتے ہیں وہ ممنوع ہیں یا نہیں؟ اگر ممنوع ہیں تو ہمارا بھی نظریہ ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ آزادی بیان حد بندی رکھتی ہے، مقدس چیزوں کی اہانت نہیں کرنا چاہیے چوں کہ یہ دوسروں کے حق سے تجاوز کرنا ہے۔

۱۔ مادی اور معنوی مصلح پر قانون اسلام کی توجہ

اب اس بحث کو برقرار رکھنے میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے آزادی کی اساس و بنیاد کیا ہے اور اس کی حد بندی کیا ہے؟ قانون کیلئے پہلے بیان کی گئی خصوصیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے معاشرہ میں اجتماعی زندگی کے اہداف و مقاصد اور مادی و معنوی مصلح کی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر قانون کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر اجتماعی زندگی نہ ہو تو افراد کے مادی اور معنوی مصلح پورے نہیں ہو سکیں گے، اجتماعی زندگی کے ماتحت انسان اس چیز کا منتظر رہتا ہے کہ وہ خدادادی نعمتیں جیسے علوم، ٹیکنالوجی اور صنعتوں سے بھی اور معارف و کمالات روحی کے بلند پایہ کے استادوں سے بھی کما حقہ استفادہ کرے گا، ان معارف و علوم کا صرف اجتماعی زندگی میں ہی حاصل کرنا میسر ہے۔

نتیجتاً قانون ایسا ہونا چاہیے جو انسانی رشد کی مادی اور معنوی جھتوں میں ضمانت لے قانون کا صرف معاشرہ میں نظم برقرار کرنا ہی کافی نہیں ہے، مثال کے طور پر اگر دو افراد یہ طے کریں کہ وہ دوسروں کو کوئی نقصان پہنچانے اور معاشرہ کے نظم میں خلل ڈالنے بغیر ایک دوسرے کو قتل کر ڈالیں گے تو کیا وہ یہ صحیح کام انجام دیں گے؟

اگر آپ حضرات کو یاد ہو تو کچھ دن پہلے امریکہ کے ایک شہر میں انسانوں کے ایک گروہ کو جلادیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ وہ افراد تھے جو اپنے رسم و رواج میں خودکشی کو کمال سمجھتے تھے! البتہ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے خود امریکا کی حکومت کے ممبران نے جب ان افراد کو اپنے نظام کے مخالف دیکھا ہو، تو سب کو نیست و نابود کر دیا ہو، فرض کر لیجئے کہ اس گروہ نے اپنے

مذہبی عقیدہ کے مطابق اس فعل کو انجام دیا تو کیا ان کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ کیا یہ کھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی کو کوئی اذیت نہیں دی اور خود ایک دوسرے سے موافقت کر کے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو انھوں نے یہ صحیح کام انجام دیا ہے؟ کیا حکومت کو ایسے قانون کی اجازت دیدینی چاہیے؟ کیا قانون کو ایسی اجازت دیدینی چاہیے یا نہیں؟ اگر نظم و انیت کی رعایت کرنا ہی صرف ملاک ہے تو یہ نظم و انیت تو کچھ افراد کے ایک ساتھ قتل کر دینے سے بھی باقی رہتی ہے! اور قانون دوسرا کوئی اور وظیفہ نہیں رکھتا۔

لیبرل نظریہ میں حکومت کا وظیفہ صرف نظم و امن برقرار کرنا ہے اور قانون کا کام ہرج و مرج کو روکنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اس طرز تفکر کا نتیجہ وہی چیز ہے جس کا یورپی ممالک میں مشاہد کیا جاتا ہے جیسے اخلاقی، جنسی، اور اجتماعی فساد وغیرہ یہ تمام مسائل ان کے اس قول کا نتیجہ نہیں کھ: حکومت کو افراد کے حقوق اور ان کی زندگی میں دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور حکومت کو تو صرف نظم برقرار رکھنا چاہیے، حکومت کو تو صرف مسلح پولیس کی طرح اسکولوں میں رہنا چاہیے تاکہ بچے ایک دوسرے کو یا اپنے استادوں کو قتل نہ کر دیں، وہاں پر برقراری نظم و انیت اسی حد تک ہے کیا قانون کا وظیفہ صرف یہی ہے؟ یا دوسرے وظایف جیسے انسانوں کے اندر رشد و نمو کرنا بھی قانون کی ذمہ داری ہے؟ اور کیا قانون کو اخلاقی برائیوں سے بھی روکنا چاہیے؟

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کا نتیجہ کھ: قانون کو مصالح معنوی کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے، اس بنا پر جو کچھ انسانوں کے معنوی مصالح اور ان کی شخصیت، روح الہی، مقام خلیفہ الہی اور انسانیت کیلئے مزاحمت ایجاد کرتا ہے اور اسی طرح جو مصالح مادی اور انسانوں کی انیت اور سلامتی کو ضرر پہونچاتا ہے وہ بھی ممنوع ہونا چاہیے، کیا اجتماع اسلئے نہیں ہوتا کہ انسان اپنی انسانیت کی وجہ سے رشد کمرے اور صرف اپنے حیوانی مقاصد ہی نہیں بلکہ انسانی مقاصد کو بھی حاصل کمرے؟ تو قانون مصالح مادی اور معنوی دونوں کا متکفل ہونا چاہیے، لہذا کسی کی حیثیت، کرامت اور لوگوں کی مذہبی مقدس گاہوں سے معارضہ کرنا یہ انسانوں کی روحی اور معنوی رشد و نمو کو روکتا ہے یہ بھی ممنوع ہونا چاہیے، جس طرح سے مواد مخدر کا رائج کرنا یا زہریلی دوا کا انجکشن لگانا منع ہے اس لئے کہ وہ انسان کو بیمار کرتا ہے اور ہستی سے ساقط کر دیتا ہے، اور اس کے مصالح مادی کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

اب اگر کوئی اس زہر کا عادی ہو جائے اور اسکے حیوانی افعال میں کوئی خلل ایجاد نہ ہو اور وہ ظاہراً صحیح و سالم ہو لیکن اس کا فہم و شعور ختم ہو گیا ہو تو کیا یہ اس کیلئے جائز ہو جائے گا؟ اور اگر دوسری طرح کی آفتیں اور زہر اپنا کام کر جائے جو اس کی سلامت معنوی اور ایمان کے ختم ہو جانے کا باعث ہو جائے تو کیا ان امور کا انجام دینا ممنوع نہیں ہے؟ کیا یہ انسان کی انسانیت کو ضرر پہونچانا نہیں ہے؟ اگر کچھ افراد معاشرہ میں ایسی شرطیں فراہم کریں جو لوگوں کو دینداری سے دور کریں تو ان کو آزاد ہونا چاہیے؟ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے کھ:

﴿صَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفِّرَ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ...﴾^(۱)

”اور (یہ بھی یاد رہے) کہ خدا کی راہ سے روکنا اور خدا سے انکار اور مسجد حرام (کعبہ) سے روکنا (اس سے بڑھ کر گناہ ہے)“ جو چیز خداوند عالم کی راہ، ترقی اور انسانوں کے حقائق دین سے آشنا ہونے کے راستہ کو بند کر دے اور دین کو جو انہوں کے نزدیک مشتبہ جلوہ دینے کا باعث ہوتا ہے وہ منع ہے چونکہ وہ انسان کی انسانیت کو ضرر پہونچاتا ہے، کیسے جو چیز انسان کی حیوانیت کو لطمہ پہونچاتی ہے تو وہ ممنوع ہوتی ہے لیکن جو چیز انسان کی انسانیت کو ضرر پہونچائے وہ آزاد ہوتی ہے؟ دنیا کھتی ہے: ہاں، لیکن دین کھتا ہے کھ: نہیں، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ معاشرہ میں اس قانون کا اجرا ہونا چاہیے جو انسانوں کی مصلح معنوی کی رعایت کرے اور مصلح معنوی کی رعایت کرنا مصلح مادی سے زیادہ اہم ہے۔ (قارئین کرام اس بات کا خیال رکھیں کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کا علمی بحث سے تعلق ہے اور ممکن ہے اس کا عینی مصداق نہ مل سکے لہذا اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم نے اقتصاد کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔)

۸۔ مصلح معنوی اور دینی کا مصلح مادی پر مقدم ہونا

اگر کوئی ایسا موقع آجائے کہ ہماری اقتصادی حالت تو اچھی ہوتی ہو لیکن ہمارے دین پر آنچ آتی ہو یا دینی حالت تو سدھرتی ہو لیکن اقتصادی حالت پر آنچ آتی ہو تو ہم کو دونوں میں سے کونسی چیز انتخاب کرنی چاہیے؟ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ اسلام کی پیشرفت اقتصادی پیشرفت کی بھی ضامن ہے، مگر ایک طولانی عرصے کے بعد، لیکن کبھی یہ امکان ہے کہ اقتصادی منافع کچھ تھوڑی مدت تک کیلئے ختم ہو جائیں اور افراد کیلئے کچھ تنگی کا باعث ہو جائے، اب اگر اس طرح کی وضعیت پیش آجائے تو بیان کئے گئے مقدمات اور استدلال کو مد نظر رکھتے ہوئے مصلحت دینی کو مقدم ہونا چاہیے یا دنیوی کو مقدم کرنا چاہیے؟ جیسا کہ نہج البلاغہ میں امام حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

”فان عرض بلاء فقدم مالک دون نفسک فان تجاوز البلاء فقدم مالک و نفسک دون دینک .“ (۲)

”اگر تمہاری جان خطرہ میں پڑ جائے تو تم اپنے مال کو اپنی جان پر فدا کر دو اگر جان و مال کے درمیان خطرہ ہو تو مال کو قربان کر دو لیکن اگر جان اور دین کے درمیان خطرہ ہے یعنی زندگی کفر کی حالت میں ہو اور ایمان کی حالت میں شہادت ہو تو پھر اپنی جان و مال کو دین پر قربان کر دینا چاہئے، اس موقع پر اگر انسان قتل ہو جائے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا“ کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيْنِ﴾ (۳)

”(اے رسول) تم منافقوں سے کہہ دو کہ تم تو ہمارے لئے (فتح یا شہادت) دو بھلائیوں میں سے ایک کے (خواہ منحواہ) منتظر ہی

”ہو“

جو شخص دین اسلام کی راہ میں قتل ہو جائے اس کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ وہ سیدھا جنت میں جائے گا، لیکن بالفرض اگر کوئی شخص بے دین سو سال تک زندہ رہے تو دن بہ دن اسکے عذاب میں زیادتی ہونے کے علاوہ اس کا اور کیا فائدہ ہوگا؟، پس اسلامی نقطہ نظر سے مصلح دینی اور معنوی مصلح مادی سے اہم ہیں، اس بنا پر قانون کو مصلح معنوی کی رعایت کے علاوہ مصلح معنوی کو اولیت بھی دینا چاہیے، ہماری بحث استدلالی ہے اور ہم اپنے استدلال کو کسی دوسرے پر نہیں چھوڑ دیتے ہیں جو افراد تسلیم نہیں کرنا چاہتے وہ رد کر سکتے ہیں، ان استدلالوں کی بنیاد پر ہم نے کوئی غیر منطقی مطلب بیان نہیں کیا۔

۹۔ اسلام اور لیبرالیزم کے مابین آزادی اور قید میں فرق

ساری دنیا کے تمام عقلا کے مانند ہماری نگاہ میں بھی آزادی محدود ہے، لیکن ان کے اور ہمارے مابین یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں آزادی کے مقید ہونے کا یہ مطلب دوسروں کی آزادی سے تجاوز کرنا ہے اور ہمارے یہاں آزادی کے محدود ہونے کا مطلب مصلح اجتماعی کی ہر مصلحت سے تجاوز کرنا ہے، انسان اپنی زندگی میں آزاد ہے وہ بات کریں، کھائیں، کام کریں، تجارت کریں، اقتصادی حالت درست کریں، بحث کریں، سفر کریں، قرارداد پر دستخط کریں، بہ طور خلاصہ انکو ہر کام کرنے کی اجازت ہے لیکن کس حد تک؟ جہاں تک معاشرہ کے مادی اور معنوی مصلح تباہ و برباد نہ ہوتے ہوں۔

جہاں آزادی مادی لحاظ سے معاشرہ کے مصلح کو نقصان پہونچانا شروع کر دے وہ ممنوع ہے، اور اسی طرح جہاں پر آزادیوں سے استفادہ کرنا معاشرہ کی معنوی مصلح سے معارضہ کر جائے تو ایسی آزادیاں ممنوع ہیں مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں آزادی سے استفادہ کرنا منع ہے یہ ہماری دلیل و منطق ہے، اور اگر کسی کے پاس ہم سے بہت ر منطق ہے تو ہم اس کو سننے اور اس سے استفادہ کرنے کیلئے تیار ہیں، فلسفہ حقوق کے استادوں سے میری گزارش ہے کہ وہ زیادہ دقت سے کام لیں۔

جہاں تک ہم کو اطلاع ہے آج تک حقوق اور سیاست کے فلاسفہ نے اس سوال کا کوئی قطعی اور منطقی جواب نہیں دیا کہ آزادی کی حد بندی کیا ہے؟ اگر ہمارے اساسی قانون یا عادی قوانین یا بزرگان عالم کے کلمات میں یہاں تک کہ اگر امام خمینی (رہ) قدس سرہ کے کلمات میں اس سے مشابہ کوئی تعبیر موجود ہو تو اسکی تفسیر کی خاطر اسکے اہل سے رجوع کرنا چاہیے، ہم بھی قانون کے جاری ہونے کے طرفدار ہیں اسلامی ملک میں قوانین کی بہ نسبت ہماری ذمہ داری دوسروں سے کھیں زیادہ ہے۔

لیکن ہمارا دوسروں سے یہ فرق ہے کہ ہم قانون کو اس لئے معتبر سمجھتے ہیں کہ ولی فقیہ نے ان پر دستخط کر دیئے ہیں، اور چونکہ امام خمینی (رہ) قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ ”اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا واجب ہے“ کچھ افراد کہتے ہیں کہ: چونکہ لوگوں نے اپنے ووٹ بھی دیئے ہیں، اب کونسی منطق قوی ہے؟ کسکا اثر زیادہ ہے؟ جب کسی شخص سے کھا جائے چونکہ لوگوں نے ووٹ دئے ہیں

، اس لئے اس قانون پر عمل کرنا واجب ہے؟ ممکن ہے وہ شخص یہ جواب دے کہ میں نے اس نمائندے کو ووٹ ہی نہیں دیا ہے، یا میں اس قانون سے راضی ہی نہیں ہوں!

لیکن امام خمینی (رہ) قدس سرہ نے فرمایا دیا ہے کہ: اگر اسلامی حکومت کوئی حکم صادر کرے اور مجلس شورائے اسلامی کسی حکم کو تصویب کر دے تو وظیفہ شرعی کے عنوان سے اس کی اطاعت کرنا چاہیے؟ اس وقت دیکھیں کیا چیز وقوع پذیر ہوتی ہے، اب ہم قانون کے پابند ہیں یا وہ؟ یہاں تک کہ اگر کسی اساسی (بنیادی) قانون میں بھی کوئی ابھام پایا جاتا ہو تو اسکی تفسیر کی خاطر کسی صلاحیت دار مرجع کی طرف رجوع کرنا چاہیے کسی اور کی طرف نہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ: تمام ملتوں اور تمام عقلاء کے درمیان آزادی محدود ہے، لیکن اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ کی مصالح مادی اور معنوی اسکی حد ہیں، تمام انسان وہاں تک آزاد ہیں جہاں تک معاشرہ کے مادی اور معنوی مصالح کو کوئی نقصان نہ پہونچتا ہو۔

حوالہ

۱. سورہ بقرہ ۲۱۷

۲. شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۸ ص ۲۵۰

۳. سورہ توبہ ۵۲

پندرہواں جلسہ

اسلامی حکومت اور ثقافتی حربے

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ہماری بحث اسلام کے سیاسی نظریہ کے بارے میں ہے اور گذشتہ جلسوں میں اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں بیان ہوئیں کہ جس میں مہم چیز سیاست کا دین سے جدا نہ ہونا تھا، اور ہم نے عرض کیا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے وہ قانون معاشرے میں معتبر ہے جو یا خدا کی طرف سے براہ راست قرآن کریم میں بیان ہوا ہو، یا پیغمبر اکرم اور ائمہ معصومین علیہم السلام یا اس شخص کی طرف سے بیان ہوا ہو جس کو امام معصوم نے اجازت دی ہو بہر حال قوانین خدا کی مرضی کے مطابق اور اسلامی نظریہ کے مطابق ہو، اس سلسلہ میں گفتگو بہت زیادہ ہے، اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ بعض لوگ اس کے مخالف ہیں کہ معاشرہ میں احکام دینی کی حکومت ہو، ان مخالف لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ جو لوگ دین کو بالکل نہیں مانتے، ظاہر ہے کہ یہ لوگ بالکل بھی پسند نہیں کریں گے کہ کسی ملک میں دینی احکام جاری ہوں، لیکن الحمد للہ ایسے افراد ہمارے معاشرے میں بہت کم ہیں۔

۲۔ جو لوگ دین کو قبول کرتے ہیں لیکن مغربی کلچر کے تحت تاثیر واقع ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ دین کا دائرہ سیاست و معاشرے سے جدا ہے اور دین کو فقط انفرادی اور خدا سے رابطہ میں منحصر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اجتماعی زندگی کے مسائل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اسی نظریہ کو عمومی طور پر سیکولیزم یا دین کا مسائل زندگی سے جدا کرنا کہا جاتا ہے۔

۳۔ جو حضرات واقعاً معتقد ہیں کہ اسلام میں اجتماعی اور اسلامی مسائل موجود ہیں، لیکن ناخواستہ طور پر مغربی کلچر سے متاثر ہیں اور کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

۲۔ علماء اور ان کی خطرناک ذمہ داری

بہر حال ہم خداوند عالم کے معین کردہ وظیفہ اور ذمہ داری کے تحت موظف ہیں کہ حتی المقدور اسلامی عظمت کو بیان کریں اور فکری دینی انحرافات سے لوگوں کو روکیں، اور اس چیز کی طرف بھی اشارہ کریں کہ بعض اجاب اور خیر خواہ حضرات فکر کرتے ہیں کہ اس سیاسی و اجتماعی زمانے میں ان بحثوں کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے! یہاں تک کہ بعض حضرات کا تصور یہ ہے کہ ان باتوں کو چھیڑنا نقصان دہ ہے، کیونکہ ان سے افکار و عقائد متاثر ہوتے ہیں، ان حضرات کا تصور یہ ہے کہ ہم جس قدر سعی و

کوشش کر سکتے ہیں کمزری و اعتقادی وحدت ایجاد ہو جائے، لہذا ان چیزوں سے پرہیز کریں کہ جن کی وجہ سے اختلاف و افتراق ہوتا ہے تو یہ معاشرے کیلئے زیادہ سودمند ہے۔

بعض حضرات خیر خواہی کی وجہ سے کہتے ہیں آپ ان بحثوں کو چھوڑ کر دوسری ضروری اور بہت ربحثوں کو معاشرے میں بھٹا کریں اور بلند مقامات کو حاصل کریں اور ایسے کام کریں جو آپ کے لئے بھی سودمند ہوں اور معاشرے کیلئے بھی مفید ہوں۔ ان حضرات (کہ جن میں بعض خیر خواہ بھی ہیں) کی خدمت میں عرض کریں کہ ہم بھی اس راستہ کو اچھا سمجھتے ہیں کہ جس میں عافیت و بھلائی ہو، اور ان لوگوں کے مزاج کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو واہ واہ کرتے ہیں، لیکن ہماری یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ جس کو خداوند عالم نے ہم پر واجب کیا ہے البتہ یہ ذمہ داری سب سے پہلے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی ہے اور اسکے بعد علمائے کرام کی ذمہ داری ہوتی ہے اور واقعاً یہ راستہ بہت مشکل اور خطرناک ہے اور واہ واہ، سبحان اللہ سبحان اللہ کی جگہ تہمت، بہت ان، بدگوئی اور کبھی کبھی جلا وطنی، زنداں اور قتل وغیرہ کو قبول کرتے ہیں، بہر حال اس راہ میں بہت سی مشکلات ہیں جیسا کہ ہمیں تاریخ میں انبیاء، ائمہ معصومین علیہم السلام نے ان کو برداشت کیا ہے لہذا ہم بھی اس راستہ پر قائم ہیں اگرچہ ہمارے دوست و اجا بھی ہم پر ملامت کریں، کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللَّاٰعِنُونَ...﴾^(۱)

”بے شک جو لوگ (ہماری) ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنھیں ہم نے نازل کیا ہے اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب (تورات) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر خدا (بھی) لعنت کرتا ہے (اور) لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں“

جو حضرات اپنے حقائق سے آگاہ ہیں لیکن اپنے ذاتی یا کسی خاص گروہ کے نفع کی خاطر ان حقائق کو مخفی رکھتے ہیں ان پر خدا، ملائکہ اور اولیا خدا کی لعنت ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بیان ہوا ہے:

”إِذَا ظَهَرَتِ الْبِدْعُ فِي أُمَّتِي فَلْيُظْهِرِ الْعَالَمُ عِلْمَهُ وَلَا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ.“^(۲)

”جس وقت دین میں بدعت ہونے لگیں تو علماء پر واجب ہے کہ اپنے علم کو بیان کرے، اور لوگوں کو انحرافات سے روکیں، ورنہ اس پر خدا کی لعنت ہوگی“

لہذا ہمارے سامنے دو راستے ہیں یا تو ہم اپنے دوستوں کی ملامت اور دشمنوں کی تہمتوں کو برداشت کریں، اور خدا کی رضایت حاصل کریں، یا لوگوں کی داد و تحسین کو پسند کریں اور خدا کی لعنت کے مستحق ہوں، لہذا ہم ترجیح دیتے ہیں کہ لوگوں کی تہمتوں

اور بدگوئیوں کو برداشت کریں، لیکن ہم خدا کی لعنت کے مستحق نہ بنیں، لہذا ہم پر یہ اہم ذمہ داری ہے اور ہمارے لئے نیز دوسرے علما کیلئے ان مسائل پر بحث و گفتگو کرنا دوسری چیزوں سے زیادہ واجب ہے۔

ٹھیک ہے آج کل سرحدی علاقوں میں ہمارے لئے بہت سی مشکلات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ ہمارے لئے فوجی مشکلات کا سامنا ہو، ٹھیک ہے افغانستان میں طالبان کے ذریعہ کہ ہمارے سفارتخانہ کے ذمہ دار افراد اور ۳۵ ڈرائیور گرفتار ہوں کہ جس کی وجہ سے ہماری ملت اور حکومت کو دکہ پہونچا، مظاہرے ہوئے اور بین الاقوامی سطح پر اس مسئلہ کو پیش کیا گیا، لیکن ان ۳۰ یا ۵۰ لوگوں کا دشمن کے ذریعہ گرفتار ہونے کا خطرہ ہماری یونیورسٹیوں میں ہزاروں جوان مسلمانوں کا امریکائی عناصر کے ذریعہ ان کے جال میں پھنسا زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

یعنی مغربی ثقافتی عناصر کے ذریعہ گرفتار ہونے کا خطرہ، چند ایرانیوں کا دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے کھیں زیادہ خطرناک ہے، اگرچہ وہ لوگ مشکلات میں ہیں لیکن ان کا اجر خداوند عالم کے نزدیک محفوظ ہے، لیکن اگر ہمارے جوان و نوجوان خصوصاً شہداء و اسیروں کے کی اولاد یونیورسٹیوں میں دین سے منحرف ہو جائیں تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیا فکری گرفتاری مزید خطرناک نہیں ہے؟ کیا اس سلسلے میں کسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟

(ممکن ہے کوئی ہم کو مقصر ٹھہرائے اور کہے کہ آپ غلط سوچتے ہیں اگر انسان آزاد ہے تو پھر اس کو اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے، تو پھر ہمیں بھی حق ہونا چاہیے کہ ہم بھی اپنی رائے کا اظہار کریں چونکہ ہم بھی تقریباً ۵۰ سال سے دینی علوم کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں اور ہم بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں)

ہماری بحث یہ تھی کہ ہماری اس بات (کہ معاشرے میں اسلامی و الہی قوانین کو حاکم ہونا چاہیے) کے مقابلے میں بعض لوگوں شبہات و اعتراض کئے تھے اور ہم بھی اس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا، بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ معاشرے میں اسلامی احکام کا جاری ہونا انسان کے مسلم حقوق سے ہم آہنگ نہیں ہے، انسان کے مسلم حقوق میں سے ایک آزادی ہے تو پھر فکر، دین، سیاست اور بیان میں آزادی ہونا چاہیے، طبعی طور پر ہر انسان یہ حق رکھتا ہے کہ کسی بھی دین کو منتخب کرے، اور اس کو یہ اختیار ہے کہ اپنے دین کو بدل دے، اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ اپنے نظریات و عقائد کی ترویج و تبلیغ کرے، اگر آپ یہ کہیں کہ اس ملک میں اسلامی قوانین کا حاکم ہونا ضروری ہے، تو بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو ان قوانین کو نہیں چاہتے، کیا ان کو حق ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کریں اور کہیں کہ ہم ان قوانین کو نہیں چاہتے، ظاہر ہے کہ جو لوگ دیں کے منکر ہیں ان کی طرف سے اس طرح کے سوالات پر کوئی تعجب نہیں ہے لیکن افسوس تو ان لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو دیندار ہونے کا دم بھرتے ہیں اور اس طرح کے سوالات پیش کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنے ساتھ اسلامی القاب بھی شامل کرتے ہیں یا خود کو امام خمینی کا پیرو کھلاتے ہیں !!

۳۔ ملکی اخباروں میں مغربی غلط آزادی کی تبلیغ

حد تو یہ ہے کہ بعض اخباروں میں (کبھی مزاحاً اور کبھی حقیقتاً کبھی کسی کے قول کو نقل کرتے ہیں کبھی کسی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے) لکھتے ہیں کہ کیوں صرف مرد کیلئے چند بیویوں کا رکھنا جائز ہے لیکن عورتوں کیلئے چند شوہروں کا رکھنا جائز نہیں ہے، یا یہ کہ کبھی کبھی مشورہ، پیش کیا جاتا ہے کہ چند مرد مل کر کسی ایک عورت سے شادی کر سکتے ہیں! توجہ رہے کہ یہ باتیں کسی کیمونسٹ ملک کے اخباروں کی نہیں ہے بلکہ جمہوری اسلامی ایران کے اخباروں میں ایسی باتیں لکھی جاتی ہیں! یا کسی ایک اسلامی یونیورسٹی میں اس طرح کی تقریر ہوتی ہے اور خود کو کسی اسلامی ادارہ سے منسلک ہونے کے اعتبار سے تقریر ہوتی ہے، اور کھا جاتا ہے کہ آج کل رہبری (ولی فقیہ) کی مخالفت، پیغمبر کی مخالفت میں کوئی صرح ہی نہیں بلکہ اگر چاہیں خدا کے خلاف بھی مظاہر کریں تو کوئی ایسا قانون نہیں کہ ان کو روک سکے! یہ باتیں اگر کسی غیر اسلامی یا کسی کافر و مشرک سے سنی جائیں تو کوئی جائے تعجب نہیں لیکن اگر یہی باتیں جمہوری اسلامی ایران، حاکمیت اسلامی اور حاکمیت ولایت فقیہ میں یونیورسٹیوں کے درمیان کی جائیں اور کوئی بھی ان کے مقابلہ کیلئے کھڑا نہ ہو تو واقعاً شرم آور ہے، اور اگر کوئی طالب علم اعتراض کرے تو اس کو اہمیت نہیں دی جاتی۔

اس وجہ سے ہم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا، اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ واقعاً یہ چیزیں بدعت اور خطرناک ہیں اور اسلام کے مخالف ہیں اور اگر کوئی شخص اپنی تقریروں میں ایسی باتیں کرنا چاہتا ہے تو کم از کم اسلام کے نام سے ایسی باتیں نہ کرے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کیا ہے اور کفر کیا ہے اور ہر انسان اپنی مرضی کے مطابق اس کا انتخاب کرے، یہ آزادی دین اور آزادی بیان مغربی ثقافت کا ثمرہ ہے یہ ایسا انپورٹ پھل ہے کہ جو ظاہر میں بہت عمدہ اور میٹھا ہے لیکن اندر سے زہریلا ہے، یہ پہل مغربی ثقافت کے درخت کے مناسب ہے لیکن ہمارے اسلامی ثقافت سے اس صورت اور اس وسعت میں بالکل بے تکا ہے۔ مغربی ماحول اور کلچر کی عکاسی کرنے کے لئے ہمیں مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کل مغربی ممالک میں مذہب کو صرف ایک پارٹی کے نظریہ کی طرح دیکھا جاتا ہے مثلاً کسی ملک میں چند پارٹیاں ہوں اور وہاں کوئی نئی پارٹی وجود میں آئے، یا کوئی کسی دوسری پارٹی میں چلا جائے تو یہ کام ہمارے لئے باعث تعجب نہیں ہے، مذہب کے سلسلے میں بالکل اسی طرح کا ماحول مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں موجود ہے جہاں ہر روز ایک نیا مذہب اور نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے یہ مسئلہ واقعاً ہمارے لئے باعث تعجب ہے، تقریباً سو سال پہلے ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام ”باب“ تھا اس نے دعویٰ کیا کہ ”میں ایک نیا اسلام لے کر آیا ہوں، اور میں شیعوں کا امام زمانہ ہوں جس نے ظہور کر لیا ہے“ اس بات پر سب کو تعجب ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایک نیا مذہب لے کر آئے (البتہ ایران سے باہر خصوصاً امریکہ میں اس باطل و بے بنیاد مطلب کو جدید اسلام کے نام سے فروج کیا جاتا ہے، اور وہاں کوئی جائے تعجب نہیں ہے) لیکن امریکہ، کناڈا اور یورپی ممالک میں ہر سال چند جدید مذہب اور فرقے پیدا ہوتے ہیں، مثال کے طور پر عیسائیت کہ اصل مذہب ارنوڈوکس، کاتولیک اور پروٹسٹان ہیں لیکن صرف پروٹسٹان کے پانچ سو سے زائد فرقے مغربی مالک میں موجود ہیں۔

جس وقت ہم نے سال گذشتہ امریکہ لاتین کا سفر کیا تو ہم نے دیکھا کہ امریکہ میں کئی نئے مذہب وجود میں آچکے ہیں اور ان کے مبلغ تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں، وہاں اس طرح کے مسائل ہوتے رہتے ہیں جب کسی اخبار میں اعلان ہوتا ہے کہ ایک نیا فرقہ پیدا ہو چکا ہے اور اس جدید فرقہ کا کشنیں (اس مذہب کا عالم) پیدا ہو چکا ہے اور اس کی کلیسا بن چکی ہے تو وہاں کوئی تعجب نہیں ہوتا، اور لوگ بھی بہت آسانی سے اس فرقہ میں شامل ہو جاتے ہیں، اسی کو ”مذہب کی آزادی“ کہا جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی پروٹسٹانٹزم، اسلام پر ایک حملہ

بعض لوگوں کی توقع اور امید یہ ہے کہ اسلامی جمہوری ایران میں بھی مذہب جیسی آزادی ہونا چاہیے اس بنا پر بہت سے لوگوں نے مشورہ پیش کیا کہ اسلام میں بھی ایک مذہب پروٹسٹانٹزم ہونا چاہیے ہماری اصطلاح کے مطابق اس مشورہ کو سب سے پہلے فتح علی آخوندزادہ (آخوند اف) نے پیش کیا، اس کے بعد دوسرے دانشمند نے بھی اپنی اپنی تقریروں میں اس مسئلہ کو بیان کیا، بعض مورخوں، رائیٹروں نے اپنی کتابوں میں لکھا اور مشورہ پیش کیا کہ اسلام میں بھی ایک پروٹسٹانٹزم ہونا چاہیے، اور آج کل امریکہ میں اس طرح کی تبلیغات ہوتی رہتی ہیں کہ ایران میں بھی ایک دوسرا ”مارٹن لوتر“ پیدا ہو جو ایک نیا پروٹسٹانٹ اور جدید اسلام کو تشکیل دے، تاکہ آج کی اس ماڈرن زندگی کے مناسب ہو اور یہ ۱۳۰۰ سال پرانا اسلام آج کی زندگی کیلئے مناسب نہیں ہے اگر امریکہ ایسا مشورہ پیش کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

کیونکہ ان کا مقصد اسلام کو ختم کرنا ہے خود ان کے کھنے کے مطابق انھوں نے اس سلسلے میں پروگرام بنا رکھے ہیں اور اس کے لئے مخصوص کوٹہ بھی معین کر رکھا ہے اور بارہا اس چیز کا اقرار بھی کیا ہے کہ اس زمانے میں ان کا اصلی دشمن اسلام ہے لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کی تبلیغات کا اثر آہستہ آہستہ ہمارے ملک میں بھی ہوتا جا رہا ہے، اور بعض لوگ ایسے ملتے ہیں جو اخباروں اور ماہانہ رسالوں میں اسلام کے ضروری مسائل پر اعتراض کر ڈالتے ہیں مثال کے طور پر کیوں ارث میں مرد و عورت کا حصہ برابر نہیں ہے یا یہ کہ عورت چند شوہر کیوں نہیں رکھ سکتی وغیرہ وغیرہ اور کبھی کبھی تو اسلام کے ضروری احکام کا مذاق بناتے ہیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ انقلاب کے شروع میں جب قصاص کے بارے میں بحث ہوئی تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ قصاص کی بحث انسانیت سے دور ہے، اس وقت امام خمینی نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی جانتے ہوئے ایسی باتیں کرتا ہے تو ان کی مسلمان بیویاں ان پر حرام ہیں، اور انکا مال مسلمان ورثاء میں تقسیم ہوگا، لیکن ان کی جان قابل احترام نہیں ہے، البتہ ارتداد کے احکام صرف قصاص کے منکرین منحصر نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی اسلام کے کسی بھی ضروری حکم کا انکار کرے تو وہ مرتد

ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ بغیر کسی شرم و حیاء کے اخباروں، رسالوں یا جہاں تک کہ کبھی ان اخباروں کے ذریعہ کہ جو بیت المال سے نکلتے ہیں، ایسی باتوں کو لکھتے ہیں اور اسلام کے ضروری احکام کا انکار کرتے ہیں۔

واقعاً کوئی ہونا چاہیے جو ان لوگوں کو یاد دہانی کرے کہ امام خمینی کا نظریہ صرف قصاص کے منکروں سے مخصوص نہیں ہے (بلکہ ہر اس شخص کو شامل ہے جو اسلام کے کسی بھی ضروری احکام کا منکر ہو) اور کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ مسائل جو شیعہ و سنی دونوں فرقوں میں متفق علیہ ہیں اور سنیوں نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، ان پر بھی اعتراض کرتے ہیں یا ان کا مذاق بناتے ہیں!

کیا باصلاحیت مراجع اس طرح کے مسائل کی تحقیق و بررسی کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں؟ یا کم از کم یہ ضروری نہیں کہ کوئی یاد دہانی کرائے کہ ایسا خطرہ آئندہ کی نسل کیلئے موجود ہے؟ جن لوگوں نے امام خمینی کے بیان کو نہیں سنا ہے، اور ان کے درس میں شرکت نہیں کی ہے کیا ان کیلئے خطرہ نہیں ہے کہ وہ جمہوری اسلامی ایران کے اخباروں میں لکھے گئے ان مطالب کے تحت تاثیر قرار پائیں اور سوچیں کہ ان نظریات سے ہماری اسلامی حکومت بھی متفق ہے اور یہ اسلامی نظریات ہیں؟ کم از کم کوئی تو ہو جو ان کو بتائے کہ ان نظریات کا اسلام سے کوئی ربط نہیں ہے۔

بہر حال یہ نظریہ واقعاً خطرناک ہے کہ دین ایک طرح کا سلیقہ ہے اور انسان جس دین کو چاہے انتخاب کرے، اور اس کو عوض کرنا چاہے تو عوض کر لے، مغربی ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک جوان اپنے دوست کے ساتھ کسی ایک کلیسا میں جاتا ہے اور اس کا دوست کہتا ہے کہ میں فلاں کلیسا کو بہت دوست رکھتا ہوں جس کے نتیجے میں وہ اپنے مذہب کو بدل دیتا ہے اس کا دوست بھی تحت تاثیر قرار پاتا ہے اور اپنے دوست کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی اپنا مذہب بدل لیتا ہے کیا مذہب ایک لباس کی طرح ہے، کہ جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا بدل لیا یا اس کا ماڈل عوض کر لیا، اسلام کی بنیاد اس چیز پر نہیں ہے کہ انسان کی سعادت و شقاوت دلخواہ اور مختلف طریقوں سے حاصل ہو سکے، تاکہ یہ نتیجہ نکل سکے کہ دین ایک طرح کا سلیقہ ہے کبھی یہ دین کبھی دوسرا دین، کبھی وہ مذہب جس کو بھی چاہو انتخاب کر لو، اور حکومت بھی لوگوں کو اس طرح کی آزادی دے، اسلام دین کو زندگی کا اہم مسئلہ مانتا ہے اور دنیا و آخرت کی سعادت و شقاوت کو صحیح دین کے انتخاب کرنے میں جانتا ہے۔

لہذا اس طرح کی گفتگو کرنے میں یہ خطرہ موجود ہے کہ جس کو احساس کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں افسوس کہ بعض لوگ غفلت کرتے ہیں یا خود کو غافل بنا لیتے ہیں، اب ان بحثوں کو بیان کرنے کی وجہ ہمارا ان انحرافات سے مقابلہ کرنا اور اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہے۔

۵۔ حق مسلم کا مفہوم حقیقی

یہاں پر اس مسئلہ کی وضاحت کرنا بہت ضروری ہے کہ طبعی اور حق مسلم سے کیا مراد ہے؟ اور آزادی کس معنی میں انسان کا حق مسلم ہے؟ جن ضروریات کا انسان کی طبیعت تقاضا کرتی ہے اس کو حق طبعی کھا جاتا ہے لہذا گفتگو کرنا، اپنی رائے کا اظہار کرنا یہ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے اور کسی کو بھی اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ کھانا پینا انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے بلکہ انسان کا سب زیادہ طبعی ترین حق کھانا پینا ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ کھانا پینا انسان کا حق طبعی ہے تو کیا وہ دوسروں کے مال کو کھا سکتا ہے؟ اور کیا کسی بھی قانون کو یہ معین کرنے کا حق نہیں ہے کہ کونسی چیز کھانا حلال ہے اور کون سی چیز کا کھانا حرام ہے؟ کس کے مال کو کھا سکتا ہے اور کس کے مال کو نہیں کھا سکتا، کیا کوئی عقلمند انسان اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ انسان آزاد ہے اور اپنی مرضی سے جو بھی چاہے کھائے کسی کا بھی مال ہو اس کو تناول کرے؟ اس طرح گفتگو کرنا بھی ہر انسان کا مسلم حق ہے لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ جو بھی منہ میں آجائے وہ بکتا پھرے، جس طرح قانون کو یہ اجازت ہے کہ وہ یہ کھے کہ کیا کھائے اور کیا نہ کھائے؟ جس طرح دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ کھے کہ خنزیر کا گوشت یا الکحل والی چیزوں کو نہ کھائے، جبکہ کھانا پینا انسان کا طبعی حق ہے، گفتگو کے بارے میں بھی اس طرح ہے گفتگو کی قسم، زمانہ اور جگہ سب قانون معین کرتا ہے جس کو تقریباً تمام دنیا نے قبول کیا ہے لیکن مغربی حضرات دین کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ جو چاہیں کھیں کیونکہ دین ایک ذاتی امر اور ایک سلیقہ ہے انسان کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی ربط نہیں ہے بلکہ انسان کے خدا سے رابطہ کا نام دین ہے، اور خدا سے یہ رابطہ مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے، انسان کوئی بھی طریقہ اپنا سکتا ہے۔

یہ دین بھی صراط مستقیم ہے اور وہ دین بھی صراط مستقیم ہے، بت پرستی بھی صراط مستقیم ہے اور اسلام بھی صراط مستقیم ہے!! لیکن اسلام کا یہ نظریہ نہیں ہے، کس اسلام کا، اس اسلام کا جس کو حضرت محمد مصطفیٰ ۱۳۰۰ سال پہلے لے کر آئے تھے نہ کہ ”باب“ اور ”مارٹن لوٹر“ جیسے کذاب لوگوں کا اسلام، پھر ہم تو اس اسلام کی بات کرتے ہیں جس کو حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

۶۔ اسلام کی حقیقی قرائت اور اس کا صحیح مطلب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی اس اسلام کو مانتے ہیں، لیکن اس اسلام کی مختلف قرائتیں ہیں آپ ایک قرائت کو بیان کرتے ہیں، تو کچھ لوگ دوسری قرائت بھی بیان کرتے ہیں، یہ نظریہ بھی مغربی ثقافت کا ایک ثمرہ ہے کہ اسلام کیلئے مختلف قرائت کے معنی کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ کینیڈا میں چند سال پہلے عیسائیت کا ایک فرقہ بنا، اور اس فرقے کے پاپ سے سوال کیا گیا کہ ہم جنس بازی کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ اس وقت تو میں اپنی رائے کا اظہار

نہیں کر سکتا لیکن میرا یہ مشورہ ہے کہ انجیل کو دوبارہ پڑھا جائے! کیونکہ تورات و انجیل میں اس کا کام کی سخت مذمت کی گئی ہے جس طرح اسلام نے بھی اس کی مذمت کی ہے، جب اس سے سوال ہوا کہ تو اس مقدس کتاب کا احترام کرتے ہیں آپ اس بارے میں اپنی نظربیان کریں؟ وہ اگرچہ ہم جنس بازی کا حامی تھا لیکن صاف صاف بیان نہیں کر سکتا تھا تو اس نے جواب دیا انجیل کا پھر سے مطالعہ کرنا چاہئے!!

اس طرح یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ اسلام اور قرآن کی دوبارہ قرائت کی جائے، ان کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ہم لوگ شیعہ و سنی علما کی ۱۳۰۰ سال پرانی قرائت کو معتبر جانتے ہیں ہم جس اسلام کا دم بھرتے ہیں یہ وہی اسلام ہے کہ جس کی آئمہ معصومین علیہم السلام نے قرائت کی ہے اور ان ہی کی اتباع میں ۱۳ صدی کے علماء نے اسلام کی قرائت کی ہے، یہی قرائت ہمارا معیار و ملاک ہے، اور اگر اسی اسلام میں جدید قرائت پیدا ہو جائیں اور ان کی بنا پر اسلامی احکامات بدل دئے جائیں تو ہم اس اسلام کو نہیں مانتے، اور نہ ہی ایسے اسلام کو پسند کرتے ہیں اور ہماری نظریہ کے مطابق کوئی بھی عقلمند مسلمان ”باب“ اور ”مارٹن لوٹر“ جیسے افراد کا اختراع کئے ہوئے اسلام کو پسند نہیں کرے گا۔

ہم جس اسلام کو مانتے ہیں اور اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اس کے منابع قرآن، سنت پیغمبر و آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں، جنہیں شیعہ اور اہل سنت فقہاء چودہ سو سال سے بیان کرتے آرہے ہیں، خصوصاً وہ احکام کہ جن میں شیعہ سنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ اسلام ہم سے کہتا ہے کہ جس طرح کھانے پینے میں قوانین کی رعایت ضروری ہے اسی طرح گفتگو کرنے میں بھی قوانین کی رعایت ضروری ہے اسلام کوئی لباس تو ہے نہیں کہ جس کو آج پہنا اور دوسرے دن اتار پھینکا، دین کے سلسلے میں تحقیق و جستجو کرنا ضروری ہے اور دین حق کو قبول کرنا چاہیے۔

اسلام کے دامن میں اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے اتنی دلیلیں موجود ہیں کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کون سا دین حق ہے؟ مگر یہ کہ کوئی صحیح طریقہ سے تحقیق و مطالعہ نہ کرے، اگر کوئی ”میکرو نیوزی جزائر“ کا رہنے والا یہ کہے کہ مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح نہیں ہو سکی ہے، تو شاید اس کی یہ بات قبول کر لی جائے لیکن اگر کوئی ۱۳۰۰ سالہ اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے علماء اسلام کی مہم ترین کتابوں کے ہونے کے باوجود بھی یہ کہے کہ میں اسلام کو نہیں پہچان سکا تو کوئی بھی اس کی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

بہر حال جس اسلام کو ہم مانتے ہیں وہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح آپ نے کھانے پینے کی چیزوں کی حد بندی کر رکھی ہے اسی طرح گفتگو کرنے میں بھی قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے، یعنی کسی کو یہ حق بالکل نہیں ہے کہ جو چاہیں کہہ ڈالیں، بلکہ اسلامی قوانین کے تابع ہونا ضروری ہے، اگر اسلامی قوانین کے برخلاف عمل کیا تو آپ کا یہ کام اسلامی معاشرے کیلئے نقصان دہ ہے، جس طرح آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ گمراہ کنندہ اور کتب ضالہ کی خرید و فروخت حرام ہے، اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ جن

لوگوں میں حق و باطل کے شناخت کی صلاحیت نہیں ہے وہ کسی بھی کتاب کو خریدیں اور پڑھنا شروع کر دیں، ہر کس و ناکس کی تقریروں کو سنیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صاف صاف ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِذَا رَأَتْ الَّذِينَ يُخَاضِعُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرَضَ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ...﴾ (۳)

”اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں بے ہودہ بحث کر رہے ہیں تو ان (کے پاس) سے ٹل جاؤ یہاں تک کہ وہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں“

یا مومنین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے جو لوگ دین پر اعتراض کرتے ہیں ان کی صحبت میں نہ بیٹھو:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي

حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذَا مِثْلُهُمْ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا...﴾ (۴)

”(مسلمانو) حالانکہ خدا تم پر اپنی کتاب قرآن میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سن لو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جاتا ہے اور اس سے مسخر اپن کیا جاتا ہے تو تم ان (کفار) کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں غور کرنے لگیں ورنہ تم بھی اس وقت ان کے برابر ہو جاؤ گے اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا تمام منافقوں اور کافروں کو (ایک نہ ایک دن) جہنم میں جمع ہی کرے گا“

بس وہ لوگ جو اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن اسلام کے دشمنوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اور اسلام کے دشمنوں کی باتوں کو رائج کرتے ہیں یہ وہی منافقین ہیں جن کا ٹھکانہ بھی کافروں کی طرح جہنم ہے، ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں کہ اسلام فرماتا ہے:

جاؤ اور حقیقت کو تلاش کرو اس کے بعد دشمنوں سے بحث کرو اور اسلام کے تعلیم شدہ حقائق کے ذریعہ ان کو مغلوب کرو، لیکن جب تک تم میں اتنی صلاحیت نہ ہو کہ اسلامی عقائد سے اچھی طرح دفاع کر سکو، تو پھر تم گمراہ اور انسانی شیاطین کی ہم صحبت نہ ہو، اس کشتی گیر کی طرح کہ جس کو پہلے تمرین اور پریکٹس کرنا ہوتی ہے تب وہ کشتی کے میدان میں اترتا ہے اور کشتی لڑتا ہے اور وہ جو ان کے جس نے ابھی تک تمرین نہیں کی ہے وہ کس پہلوان سے کشتی نہیں لڑ سکتا، چونکہ پہلوان اس کو ذرا سی دیر میں زمین پر دے مارے گا، اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی، یہ آزادی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ اپنے جوانوں کو ایک نصیحت ہے کہ پہلے اسلامی علوم اور اسلامی معارف کو حاصل کریں، اس کے بعد دشمن سے بحث کریں۔

بہر حال جس اسلام کو ہم پہچانتے ہیں اس کی آزادی محدود ہے، اور اس نظریہ کا مخالف ہے کہ جب گفتگو کرنے کو انسان کی طبیعت تقاضا کرتی ہے لہذا گفتگو کرنا آزاد ہو ورنہ تو انسان کی دوسری خواہشات بھی ہیں اور وہ بھی انسان کے طبعی حق میں شمار ہوتی ہیں مثلاً جنسی خواہشات کھانا پینا ان میں بھی کوئی محدودیت نہیں ہونا چاہیے، جس طرح کھانے پینے میں محدودیت کا قائل ہونا کسی بھی عقلمند انسان کو قابل قبول نہیں ہے گفتگو کرنے میں بھی اس طرح ہے، لہذا چونکہ گفتگو انسان کی فطرت کا تقاضا ہے اس

کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ کوئی حد و قانون نہ ہو لہذا عقل اور دین ان حدود کو بیان کرنے میں اور اس کی حدیں معاشرے کی مادی اور معنوی مصالح ہیں کہ جن کو دین نے بیان کر دیا ہے۔

۱۔ شرعی آزادی

شاید آپ حضرات نے اخباروں میں پڑھا ہو کہ بعض لوگوں نے ہماری باتوں پر اعتراضات کرتے ہوئے کہا ہے کہ فلاں صاحب مغالطہ کرتے ہیں ہم آزادی کو مطلق نہیں کہتے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کچھ جائز آزادی ہونا چاہیے۔

ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ جائز آزادی سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا آپ کی مراد وہ چیز ہے کہ جس کو شرع پسند کرتی ہے، لغت میں مشروع کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ مشروع یعنی جس کو شریعت نے جائز کیا ہے (البتہ آپ کی مراد یہ ہونا مشکل ہے کیونکہ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ شریعت کے زیادہ پابند نہیں ہوتے) بہر حال اگر مشروع کا مطلب یہ ہے کہ جس کو شرع پسند کرتی ہو تو اسی کو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ آزادی شرعی قوانین کے تحت ہونا چاہئے۔

۲۔ مشروع کے دوسرے معنی از لحاظ قانون جائز ہو اس معنی کے لحاظ سے بھی جیسا کہ ایران کے قانون اساسی میں بیان ہوا ہے قانون کو اسلام کے موافق ہونا چاہیے، ہمارے قانون اساسی اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ تمام قوانین و احکام اسلام کے موافق ہونا چاہیں، اور قانون اساسی میں فقہائے شوارائے نگہبان کا فلسفہ ہی یہی ہے کہ وہ قوانین جو پارلیمنٹ میں بنائے جاتے ہیں ان کی تحقیق کریں کہ یہ قوانین اسلام کے موافق ہیں یا نہیں؟ کیونکہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران (اقلیت کے نمائندوں کے علاوہ کہ ان کے حقوق بھی محفوظ ہیں) مسلمان، مومن اور متقی ہیں، لیکن ممکن ہے کہ یہ ممبران کبھی کبھی غفلت کر بیٹھیں اور اس قانون کو اپنی رائے دیں کہ جو اسلام کے مخالف ہو، یعنی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین شورای نگہبان میں جانچے جائیں کہ یہ قانون، قانون اساسی اور اسلامی نقطہ نظر سے موافق ہیں یا نہیں؟ اور شورائے نگہبان پارلیمنٹ کے بنائے قانون کی تائید کرتے ہیں اور شورای نگہبان کے حقوق واناں مشورت قانون اساسی سے موافق ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

اگر ہمارا قانون اساسی قانون کے اسلامی ہونے کو ضروری نہ سمجھے تو پھر شورائے نگہبان کا کیا مطلب؟ اور یہ سب تاکید حاکمیت اسلام اور ولایت فقیہ کا قانون اساسی میں ہونے کا کیا مطلب؟ اس وقت کوئی جائے تعجب نہیں کہ کوئی حقوق دان کے عنوان سے کہے چونکہ قانون اساسی کہتا ہے آزادی کی رعایت کی جائے تو پھر کوئی بھی اس آزادی کو محدود نہیں کر سکتا، قانون اساسی کہتا ہے کہ آزادی مشروع ہو یا نا مشروع؟ اور آپ کہتے ہیں مشروع آزادی؟ مشروع آزادی یعنی کیا؟ اگر مشروع شرع سے بنا

ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آزادی جس کو شرع اجازت دیتی ہو اور اگر مشروع قانون ہو تو پھر بھی قانون اساسی کے مطابق وہ آزادی کہ جن کو شرع اور قانون نے تائید کیا ہو مشروع اور جائز آزادی ہیں۔

۸۔ دین اور قانون آزادی کو محدود کرتے ہیں۔

آزادی قانون کے مافوق نہیں ہو سکتی، لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ آزادی دین اور قانون سے بالاتر ہے، تو پھر ان سے ہمارا یہ سوال ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر دین اور قانون کس لئے ہیں؟ حقیقت قانون کیا ہے؟ کیا قانون اس کے علاوہ ہے کہ کھے فلاں پروگرام خاص قوانین کے تحت ہو، فلاں کا انجام دیں اور فلاں کام انجام نہ دیں۔

مجبوراً گزشتہ مطالب کی یاد دہانی کرنا ضروری ہے کہ ہر قانون صاف صاف یا اشارہ کے طور پر یہ کہتا ہے کہ انسانی کردار کو محدود ہونا چاہیے اور خاص دائرے میں انجام پائیں، لہذا قانون کا کام ہی آزادی کو محدود کرنا ہے، اگر دین اور قانون آزادی کو محدود کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں تو پھر دین اور قانون کا ہونا بے کار ہے، چونکہ دین اجتماعی و سیاسی مسائل پر مشتمل ہوتا ہے اور انسان کے اجتماعی و سیاسی امور کو محدود کرتا ہے اور دین کا حکم ہوتا ہے کہ یہ امور خاص قوانین کے تحت انجام پائیں اور اگر دین کے معنی اس کے علاوہ ہوں تو پھر دین کی کیا ضرورت ہے؟

اگر دین اس وجہ سے آیا ہو کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرے تو پھر دین کا کیا فائدہ؟ دین کی جایگاہ و مقام کھان ہے؟ دین کا وجود بالفاظ دیگر قانون انسان کی آزادی کو محدود کرتے ہیں، لہذا آزادی کو دین اور قانون سے اوپر کہنا باطل ہے۔

جی ہاں ممکن ہے کہ بعض حضرات دین کی وجہ سے مشروع آزادی سے بھی روکیں اور جس چیز کو خدا نے حلال کیا ہے خرافات و قومی رسم و رواج کی وجہ سے حرام قرار دیں، جیسا کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج بھی ہمارے ملک کے مختلف مقامات پر بعض قومیں اور عشائری قوموں میں کہ جس نے خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کر رکھا ہے، اور اسی طرح ہمارے معاشرے میں اب بھی خدا کی حلال کردہ چیزوں کو برا سمجھا جاتا ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سی جنسی برائیاں ختم ہو جاتیں، حضرت امیر المومنین علیہم السلام نے فرمایا:

”لولا ما سبق من ابن الخطاب في المتعة ما زنا الا شقى...“^(۵)

”اگر عمر متعہ کو حرام نہ کرتا تو کوئی بھی زنا نہ کرتا مگر یہ کہ شقی ہو“ افسوس کہ ابھی بھی اس حلال خدا کو برا سمجھا جاتا ہے جو بہت سی مشکلات کو ختم کرنے والا ہے ہاں اگر کوئی شخص دین کے نام پر خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنا چاہے، تو یہ کام بھی برا ہے نہ صرف یہ کہ برا ہے بلکہ حرام اور بدعت ہے، جس طرح اس کے برعکس خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنا بھی بدعت ہے:

”اِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ اَنْ يُّؤَخَذَ بِرِخْصَةٍ كَمَا يَحِبُّ اَنْ يُّؤَخَذَ بِعِزٍّ اَمَةٍ“ (۶)

خداوند عالم جس طرح دوست رکھتا ہے کہ لوگ مباح اور حلال کردہ چیزوں سے فیض اٹھائیں اسی طرح دوست رکھتا ہے کہ واجبات کو انجام دیں اور محرمات کو ترک کریں۔

تو معلوم یہ ہوا کہ دین یا قوم کے نام پر خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے، اور آزادی کو اس طرح محدود کرنا حرام و بدعت ہے، اور کوئی بھی اس کا موافق نہیں ہے لیکن اگر اس آزادی سے مراد نامشروع آزادیاں ہیں تو کسی کو یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ دین نامشروع آزادی کی بھی مخالفت نہ کرے!

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ آزادی دو حال سے خالی نہیں: یا مشروع ہیں، یا نامشروع، اگر مشروع ہیں تو دین نے ان کو جائز قرار دیا ہے، اور اس کی کوئی مخالفت نہیں کی ہے، اور پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ دین اور قانون کو یہ حق نہیں ہے کہ معاشرے سے مشروع آزادی کو بھی چھین لے، اور اگر کوئی دین اس کی اجازت دے تو پھر کس طرح کھا جا سکتا ہے کہ جس چیز میں ہم نے اجازت دی ہے اس کو انجام نہ دیں؟ یہ تو خود ایک تناقض ہے لیکن اگر آزادی نامشروع ہو، اور دین نے اس کو منع کیا ہو تو پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کو منع کرنے کا حق نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ایک طرح کا تناقض ہے۔

۹۔ آزادی کو محدود کرنے کی ضرورت

ہماری مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہم آزادی کو شریف چیز، خدائی عطا اور انسان کی معنوی و مادی ترقی کیلئے ایک شرط جانتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر انسان آزادی نہ رکھتا ہو اپنے اعتبار سے دین کا انتخاب اور اس پر عمل نہ کرے، تو پھر اس کے اعتقاد کی کوئی قیمت نہیں ہوگی، انسان کی ترقی اور کمال اسی میں ہے کہ دین کو اپنے علم کے ذریعہ انتخاب کرے، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی اشارہ ہوتا ہے:

﴿لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ﴾ (۷)

”دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے“

اجبار کا مطلب ہی یہی ہے، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آزادی خداوند عالم کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے لیکن ہر نعمت سے استفادہ کیلئے بھی حد معین ہے:

﴿وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاِنَّ لَّيْكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۸)

”اور جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود سے آگے بڑھتے ہیں وہ ہی لوگ تو ظالم ہیں“

اپنی حدود سے تجاوز کرنا شقاوت اور الہی نعمت کے چھن جانے کا سبب ہے، جو چیز انسان کی سعادت و کامیابی کا سبب ہے، اگر اس سے تجاوز کیا جائے تو پھر بھی چیز اس کیلئے شقاوت و بد بختی کا سبب بن جاتی ہے، جب انسان کھانے پینے میں حد سے بڑھ جائے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مرنے کی نوبت بھی آجاتی ہے، جنسی شہوت کا ہونا بھی ایک خداداد نعمت ہے، وہ جب اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر معاشرے میں برائیاں پھیل جاتی ہیں اور کبھی کبھی معاشرے کی ہلاکت اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہونے کی باعث ہوتی ہیں۔ لکھنا، گفتگو کرنا بھی اس طرح ہے، ہمیں اس چیز کا حق نہیں ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ انسان کی طبیعت گفتگو کا تقاضا کرتی ہے لہذا جو چاہے کھیں، جبکہ ان تمام چیزوں میں حدود کی رعایت کرنا ضروری ہے، ٹھیک ہے کہ اسلامی حکومت کو لوگوں کو مشروع آزادی دینا ضروری ہے لیکن اسلامی حکومت کو بھی نا مشروع آزادی کو روکنے کا حق ہے۔

اخباروں کے بیان کردہ شبہات میں سے ایک شبہ یہ بھی ہے کہ ہم اور آپ (مولف) اس طرح گفتگو کر کے قانون اساسی اور قومی حاکمیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ قانون اساسی کے مطابق ہر انسان اپنی زندگی کے مالک ہیں اور اگر ان کو مجبور کیا جائے کہ فقط دین کی رعایت کریں تو پھر انسان اپنی زندگی کا مالک نہیں! واقعاً یہ شبہ بڑا ہی فریب دینے والا ہے۔

ہم ان کے جواب میں یہ عرض کرتے ہیں کہ کیا قانون اساسی میں صرف اس چیز کو بیان کیا گیا ہے؟ کیا اس قانون اساسی میں یہ نہیں ہے کہ حاکمیت و حکومت کا مالک خدا ہے؟ کیا اس قانون میں یہ نہیں ہے کہ معاشرے میں وہ قانون جاری ہوں جو اسلام کے موافق ہوں؟ کیا یہ چیزیں قانون اساسی میں نہیں ہیں کیا صرف قانون اساسی میں یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی زندگی پر خود حاکم رہیں؟ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ قانون اساسی کی یہ دو باتیں آپس میں ٹکراتی ہیں لہذا ان کے لئے تفسیر اور کسی راہ حل کی ضرورت ہے، لیکن اگر واقعاً غور کیا جائے تو یہ ان دو باتوں کو سمجھنا آسان ہے جب پہلی اصل میں یہ کھا جاتا ہے کہ حاکمیت اور حکومت کا خدا مالک ہے اور دوسری اصل میں یہ کھا جاتا ہے کہ انسان اپنی زندگی پر خود حاکم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ خدا کی حاکمیت کے زیر سایہ دین زندگی پر حاکم ہیں، لہذا اسلامی معاشرے کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنا مذہب اور اپنا قانون ہم پر تھوپنے، یعنی امریکہ کو اپنا قانون ہم پر نافذ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، ہمارے افراد خود اپنے لئے مفید قانون کو ووٹ دیں، اور ہمارے افراد نے ہی اسلامی قانون کو اپنا ووٹ دیا ہے۔

ایک شخص ”اہوازیونیورسٹی“ میں اپنی تقریر کے دوران کہتا ہے: اگر لوگ خدا کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہیں تو قانون کو ان کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے؟! کیا انسانوں کی حکومت کا بھی مطلب ہے؟ کیا قانون اساسی اس چیز کو کہتا ہے؟ اگر کوئی قانون اساسی کو نہ جانتے ہوئے اس طرح کی باتیں کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خود کو قانون داں کھلاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں!

ممکن ہے کوئی یہ کھے ہم نہیں مانتے کہ جو آپ کہتے ہیں وہی قانون اساسی ہے، تو اس کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر قانون میں کسی طرح کی پیچیدگی ہے تو اس کی مفسر شورائے نگہبان ہے اگر آپ اس قانون اساسی کو قبول کرتے ہیں تو بھی یہ قانون آپ کو تفسیر کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اور پیچیدگی اور تعارض کے حل کو بھی خود ہی معین کرتا ہے اگر آپ اسی قانون اساسی کو مانتے ہیں تو اس کی تفسیر شورائے نگہبان سے پوچھئے، وہ شورائے نگہبان جو اسلام و قانون اساسی کی محافظ ہے، اور یہ شورائے نگہبان احکام اسلامی کی محافظت کیلئے نہیں ہے، اس وقت اگر آپ کی تائید ہوتی ہے تو پھر آپ اسلام پر اعتراض کرنے میں حق بجانب ہیں۔

بہر حال جو کچھ ہم نے بیان کیا اسلام کے دشمنوں کے بعض شبہات تھے جو مکڑی کے جالے سے بھی ضعیف و کمزور ہیں، اور اسلام کے دشمنوں کے پاس ان سست اور کمزور باتوں کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

حوالے

۱۔ سورہ انعام آیت ۶۸

۲۔ سورہ نساء آیت ۱۴۰

۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱۲، ص ۲۵۳

۴۔ بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۳۶۰

۵۔ سورہ بقرہ آیت ۲۶۵.

۶۔ سورہ بقرہ آیت ۲۲۹.

قانون اور آزادی کے لحاظ سے الہی اور الحادی ثقافت میں فرق

۱۔ انتخاب کی اہمیت اور ہدف تک پہنچنے کے لئے قوانین کی آگاہی اور رعایت

اسلام کے سیاسی نظریہ کے بارے میں بحث کے دوران مذکورہ نظریہ سے متعلق اصول موضوعہ اور مقدمات تینکے سلسلے میں بہت سی چیزیں عرض کی، اور اس سلسلہ میں کئے گئے اعتراضات کا جواب بھی دیا، اس وقت بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مجموعی اعتبار سے اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں:

اسلامی نظریہ کے مطابق ہر موجود متحرک ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسے مسافر سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو ایک جگہ سے اپنے سفر شروع کر کے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ رہا ہے (اور یہی آخری منزل اس کی سعادت اور اخروی کمال ہے) زندگی کا طول و عرض ایک ایسے راستے کی طرح ہے کہ اصل مقصد تک پہنچنے کے لئے اس راستہ کا طے کرنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں آپ حضرات کے سامنے ایک مثال پیش کرتے ہیں، تاکہ یہ بات ہمارے جوانوں کے ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھ جائے: فرض کریں ایک ڈرائیور کو تھران سے مشہد جانا چاہتا ہے لیکن اگر اس ڈرائیور کے ہاتھ پیر مفلوج ہو جائیں تو اس صورت میں یہ ڈرائیور ڈرائیونگ نہیں کر سکتا، یعنی ڈرائیونگ اس صورت میں کر سکتا ہے جب اس کا بدن اور دوسرے اعضاء صحیح و سالم ہوں، اور ان پر قدرت و اختیار رکھتا ہو۔

یعنی جب وہ چاہے گاڑی کو دائیں بائیں موڑ دے یا ایکسیلیٹر یا بریک کو دبا سکے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے کمال کو حاصل کرنے و ترقی یافتہ بنانے میں بھی آزاد، اختیار، صاحب قدرت اور انتخاب کرنے والا ہے، ورنہ اس کمال کے راستہ پر گامزن نہیں رہ سکتا، اسی وجہ خداوند عالم نے انسان کو انتخاب و اختیار کی قدرت دی ہے کہ اپنی مرضی سے اس راستہ پر قدم بڑھائے اور منزل مقصود تک پہنچ جائے، اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر انسان اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتا، لہذا یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر کوئی شخص بغیر سوچے سمجھے اور بغیر اختیار کے اس کمال کے راستہ پر چلے اور مقصد تک پہنچنا چاہے، تو یہ اس کی غلط فہمی ہے، انسان کا آزاد ہونا اور قدرت انتخاب رکھنا ضروری ہے تاکہ اس راستہ کو طے کر سکے۔

انسان جتنا انتخاب میں آزاد ہوتا ہے اتنا ہی اس کا کام ارز شمند ہوتا ہے، لیکن جس طرح ایک صحیح و سالم ڈرائیور ہونے کے باوجود کوئی گارنٹی نہیں ہے وہ منزل مقصود تک پہنچ ہی جائے گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بھول چوک یا جان بوجہ کر غلط راستہ کا انتخاب کر بیٹھے، اور کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ گھما کر اور اپنے پیروں کے ذریعہ ایکسیلیٹر کو دبا دے اور گاڑی کو کسی کھائی میں گرا دے، لہذا معلوم یہ ہوا کہ کسی مقصد کے لئے صرف انتخاب و اختیار کافی نہیں ہے، بلکہ علت تامہ کو حاصل کرنے کے

لکے یہ شرط بھی ضروری ہے، یعنی ہماری اصطلاح کے لحاظ سے انسان کو سعادت اور کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ راہنمائی کی علامتوں اور نشانیوں پر توجہ کمرے اور ڈرائیورنگ کے تمام اصولوں کی صحیح رعایت کمرے تاکہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

اگر کوئی شخص یہاں پر یہ کھے کہ میں جسم و جسمائیت کے اعتبار سے طاقتور بھی ہوں اور صحیح انتخاب کرنے والا بھی ہوں، لیکن میرا دل یہ چاہتا ہے کہ ڈرائیورنگ کے اصولوں کے خلاف عمل کروں اور کسی کو میرے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس شخص کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ اس کے سفر کا نتیجہ ہلاکت ہے اور اس کا کسی کھائی میں گرنا یقینی ہے، لہذا انسان کو صحیح و سالم ہونے کے ساتھ ساتھ راستہ کا علم بھی ضروری ہے اور قوانین کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے۔ ٹریفک قوانین کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کچھ ایسے قوانین ہیں کہ اگر ان کی رعایت نہ ہو تو خود ڈرائیور کو نقصان پہنچے گا، مثال کے طور پر اگر سڑک سے ہٹ کر چلے تو ممکن ہے کہ کسی کھائی میں گر پڑے، یا پل سے نیچے جا گرے، تو اس صورت میں اس کا نقصان خود اس کو یا اس کی گاڑی کو پہنچے گا، ایسے خطروں سے بچانے کے لئے ہوشیار کرنے والے بورڈ لگائے جاتے ہیں مثلاً خطرناک موڑ کا بورڈ، یا بائیں طرف ڈرائیورنگ کریں یا رفتار کم کریں وغیرہ، تاکہ ڈرائیور قوانین کے خلاف ڈرائیورنگ نہ کمرے اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے صحیح و سالم اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

۲۔ کچھ ایسے قوانین ہوتے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے صرف ڈرائیور کو ہی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ دوسروں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور کبھی کبھی ایسے حادثات رونما ہوتے ہیں کہ سیکڑوں لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض ”ہائی وے“ یا بڑے بڑے چوراہوں پر خصوصاً دوسرے ممالک میں کہ جہاں تیز رفتار سے گاڑی چلانا جائز ہے، بعض خلاف ورزیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیکڑوں گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں کہ جن میں بہت سے لوگوں کی جان چلی جاتی ہے، آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ جرمنی میں ۱۵۰ گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں، ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر صرف احتیاط کی رعایت اور ہوشیار ہونے والی نشانیوں پر ہی اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ ریڈ لائٹیں (لال بٹی) یا ہوشیار رہنے والے کی بڑے بڑے بورڈ لگائے جاتے ہیں، اور بعض جگہوں پر پولیس کو الیکٹرونک آنکھیں اور مختلف ویڈیو کیمرے لگانے پڑتے ہیں تاکہ خلاف ورزی کرنے والے ڈرائیوروں کو پکڑ کر ان کا چالان کر کے سزا دی جاسکے، خلاف ورزی کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے گاڑی سڑک سے نیچے اتر جاتی ہے اور الٹ پلٹ ہو جاتی ہے اور ڈرائیوروں کے ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے ہیں اور کبھی کبھی مر بھی جاتے ہیں، اس صورت میں ڈرائیوروں کا چالان نہیں کیا جاتا کیونکہ نقصان خود اسی کا ہوا ہے، لیکن اگر خلاف ورزی کے نتیجہ میں کسی دوسرے کو نقصان پہنچا ہے تو پھر پولیس ان کو پکڑ کر ان کے خلاف کارروائی کرتی ہے۔

۲۔ اخلاقی اور حقوقی قوانین میں فرق

انسان کی زندگی میں دو طرح کے خطرے لاحق ہیں :

۱۔ وہ خطرہ جس کا تعلق صرف ہم سے ہوتا ہے، کہ اگر قوانین کی رعایت نہ کریں تو خود ہم کو نقصان پہنچتا ہے، درحقیقت قوانین کی خلاف ورزی کا نقصان ذاتی اور شخصی ہے، اس موقع پر جو احکام وضع کئے جاتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی تاکید ہوتی ہے اصطلاح میں ایسی چیزوں کو قواعد اخلاقی یا قوانین اخلاقی کہا جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا یا نعوذ باللہ تھائی میں دوسرے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس کے گناہوں کو نہیں دیکھ پاتا تو ایسی صورت میں خود اس شخص نے اپنے اوپر ظلم کیا، لہذا کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے اور کوئی نہیں پوچھے گا کہ کیوں آپ نے تھائی میں ایسا گناہ کیا ہے، ایسے موقعوں پر کسی کو حق بھی نہیں کہ کوئی اس کے کاموں کی تحقیق و جستجو کرے، کیونکہ انسان کے خصوصی کاموں میں تجسس (جاسوسی) کرنا حرام ہے۔ کیونکہ یہ کام خود اس کی ذات سے مربوط ہیں، اگرچہ اس کو اخلاقی نصیحت ضرور کی جاتی ہے، اور اس کے بارے میں حکم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تھائی میں گناہ یا گناہ کا تصور بھی نہ کرے، لیکن یہ نصیحتیں ان بورڈوں کی طرح ہیں جو سڑکوں پر ہوشیار اور متوجہ رہنے کے لئے لگائے جاتے ہیں، مثلاً لکھا جاتا ہے کہ اہستہ چلیں لیکن اس کی خلاف ورزی کرنے پر رفتار بڑھ جاتی ہے اور موڑ وغیرہ میں خود ڈرائیور کو نقصان پہنچتا ہے ایسی صورت میں پولیس اس کا پیچھا نہیں کرتی۔

۲۔ وہ خطرہ ہے جس کا تعلق صرف اسی شخص سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر دوسروں تک بھی پہنچتا ہے اس صورت میں ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کو قوانین حقوقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی اس خطرے کا اثر اس شخص پر بھی ہوتا ہے اور معاشرے پر بھی، نتیجہً یہ قوانین اجرائی اس بات کی ضمانت رکھتے ہیں کہ اگر ان کی خلاف ورزی کی جائے تو خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکے، جس طرح ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر اس کے خلاف کارروائی ہوتی ہے، یہ وہ موقع ہے کہ جب اخلاقی قوانین کے مقابلہ میں حقوقی قوانین کی بات آتی ہے ان ہی حقوقی قوانین کے تحت جزائی و کیفری قانون میں آتے ہیں؛ یعنی یہ دائرہ علم حقوق اور قانون بنانے والے اداروں کے قوانین جن کی اجرائی ضامن حکومت ہوتی ہے ان سے کام پڑتا ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ اخلاقی اور حقوقی قوانین میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اخلاقی قوانین میں کوئی بھی شخص ضامن نہیں کہ ان کو عملی جامہ پہنائے، اگر کسی نے ان قوانین کی مخالفت کی تو اس کو سزا دی جائے اور اگر کسی کے خلاف کبھی کوئی کارروائی ہوتی بھی ہے تو اخلاقی خلاف ورزی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ حقوقی پہلو کی وجہ سے ہوتی ہے کہ جو قانون سے متعلق ہے اور اگر کوئی مخصوص شکایت کرنے والا ہے تو حقوقی بمعنی خاص ہوگا ورنہ جزائی و کیفری ہوگا۔

بہر حال جس طرح ایک ڈرائیور اپنی اور مسافروں کی جان کو خطرات سے بچانے کی ذمہ داری رکھتا ہے اسی طرح انسان بھی ایک مسافر کی طرح ہے کہ ایک جگہ سے اپنا راستہ شروع کرتا ہے اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے بہت سے خطروں سے روبرو ہوتا ہے، یہ خطرات کبھی تو خود اسی سے مخصوص ہیں، کہ جن کے احکام خود اس کی ذات سے مربوط ہیں اور ان کے لئے اخلاقیاتی نصیحتیں موجود ہیں، لیکن اگر کسی موقع پر کسی دوسرے کے لئے خطرہ ہے یا کسی بھی طرح سے دوسروں کے عقائد کو خراب اور لوگوں کے جان مال اور ناموس پر تجاوز کرتا ہے تو پھر اس پر حقوقی قوانین جاری ہونگے کہ جن کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔

ہم نے جو ڈرائیور کی مثال پیش کی، کوئی مغرور ڈرائیور کھے کہ ”میں تو آزاد ہوں، اور قوانین کی مخالفت کرتا ہوں“ تو اگر خود اس کا نقصان ہے تو صرف اس کو نصیحت کی جاتی ہے اور رکھا جاتا ہے کہ احتیاط کرو دھیان رکھو، ورنہ آپ کی جان خطرہ میں ہے، لیکن اگر کسی دوسرے کی جان کا مسئلہ ہو تو پھر اس کو روکا جاتا ہے اور پولیس اس کا پیچھا کرتی ہے اور مختلف طریقوں (راڈار الٹرونک آنکھوں یا مختلف ویڈیو کیمز) سے اس کو تلاش کرتی ہے اور اس کو سزا دیتی ہے، اس موقع پر کوئی نہیں کھتا کہ پولیس کا پیچھا کرنا انسان کی آزادی کے مخالف ہے، پوری دنیا میں کے عقلمند حضرات اس کو مانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے خطرہ پیدا کر رہا ہے تو اس کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے تاکہ خلاف ورزی کرنے والے کو روکا جاسکے، کیونکہ یہ آزادی مشروع اور قانونی نہیں، اس آزادی کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔

کیونکہ اس سے دوسروں کو خطرہ لاحق ہے، اس بات کو تمام ہی عقلاء مانتے ہیں، اور ہم کسی ایسے عقلمند انسان کو نہیں دیکھا کہ جو یہ کھے کہ انسان اپنی زندگی میں اس قدر آزاد ہے کہ جو چاہے کمرے یہاں تک اپنی جان کے علاوہ دوسروں کی جان و مال اور عزت کو بھی نقصان پہنچائے، اس بات کو کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قوانین کا ہونا ضروری ہے، اور معاشرہ کو بھی چاہئے کہ ان قوانین کو قبول کرے، اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اگر اختلاف ہے تو دین میں، کہ کیا دین میں اخلاقی قوانین کافی ہیں یا حکومتی قوانین کا بھی ہونا ضروری ہے؟ اور کیا اس سلسلہ میں کسی اجرائی ضامن کی ضرورت ہے، یا صرف اخلاقی نصیحتوں پر اکتفاء کی جاسکتی ہے؟

جو لوگ کہتے ہیں کہ حکومت ضروری نہیں ہے اور انسان خود ہی اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ تربیت پاسکتا ہے، اور اسے حکومت و قانون کی کوئی ضرورت نہیں،! ہم ان کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے اور انسانی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی معاشرہ صرف اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، لہذا قانون و حکومت کا ہونا بہت ضروری ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قوانین کی ضرورت ہے، اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ جو قانون آزادی کو محدود کرتا ہے اور رکھتا ہے: ”داہنی طرف چلو نہ کہ بائیں طرف، یا اہستہ چلو“ تو اس قانون کو انسان کی آزادی کو محدود کرنے کا کھان تک حق ہے؟

اس چیز کو سب مانتے ہیں کہ اگر دوسروں کی جان و مال خطرے میں ہو، تو قانون آزادی کو محدود کر دیتا ہے مثلاً اجازت نہیں دیتا کہ کسی پر اسلحہ نکال لو یا کسی کو جان سے مار ڈالو، ممکن نہیں ہے کہ قانون کسی کو حق دے کہ کسی کو بغیر دلیل کے قتل کر ڈالو! اب جبکہ یہ مان لیا گیا کہ قانون اس آزادی کو محدود کرتا ہے جو دوسروں کے لئے نقصان دہ ہے، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون گزار فقط انسان کی زمانی آزادی کو محدود کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی مادی منافع کو ضرر پہنچائے یا قانون گذاری کے وقت انسان کے معنوی اور روحی منافع کو بھی نظر میں رکھا جائے؟ اصل اختلاف اسی جگہ ہے۔

ہم فرہنگ و ثقافت کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں: ایک الہی ثقافت کہ جس کا سب سے روشن نمونہ اسلامی ثقافت ہے کہ جس کو ہم مانتے ہیں اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ الہی ثقافت دین اسلام سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے آسمانی ادیان میں بھی یہ الہی ثقافت پائی جاتی تھی، اگرچہ ان میں تحریفات اور انحرافات پیدا ہو گئے، اس ثقافت کے مقابلے میں کفر و الحاد یا غیر الہی ثقافت رائج ہوئی کہ آج جس کا نمونہ مغربی ممالک ہیں، البتہ توجہ رہے کہ مغرب سے ہماری مراد صرف جغرافیائی علاقہ نہیں ہے بلکہ اس ثقافت کو مغربی ثقافت کا نام اس وجہ سے دیتے ہیں کہ جو امریکہ اور یورپ میں رائج ہے، اور دوسرے ممالک بھی اس ثقافت کی حمایت کرتے ہیں، اور ان کی تمام تر کوشش اس کو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلانا ہے، لہذا آسان طریقہ سے سمجھانے کے لئے ثقافت کی دو قسم کرتے ہیں:

اول: الہی اور اسلامی ثقافت -

دوم: غربی (الحادی) ثقافت -

ہم یہاں پر ان دونوں ثقافتوں کے اہم فرق کو بیان کرتے ہیں:

۲۔ مغربی ثقافت کے تین اہم رکن ہیں

یہ کھا جاسکتا ہے کہ مغربی تمدن و ثقافت تشکیل دینے کے لئے تین چیزیں بہت اہم ہیں، اگرچہ ان کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی ہیں لیکن یہ تین چیزیں اس ثقافت کی جڑ ہیں:

پھلا رکن: ”رومانیزم“ ہے یعنی انسان کی زندگی میں ہر طرح کی خوشی، چین و سکون ہونا چاہئے اور بس، لفظ ”اومانیزم“ خدا پرستی اور دین پرستی کے مقالہ میں بولا جاتا ہے، اگرچہ اس سے دوسرے معنی بھی لئے جاتے ہیں کہ جن سے ہماری کوئی بحث نہیں ہے

اور اس لفظ کے مشہور معنی یہ ہیں کہ انسان صرف اپنی اور اپنی لذتوں اور اپنی خوشی و راحت کی فکر میں ہو، اور اگر کوئی خدایا فرشتہ کا وجود ہے بھی تو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یہ اس نظریہ کے مقابلہ میں نظریہ ایجاد ہوا کہ جو درمیانی صدیوں میں یورپ میں اور اس سے پہلے مشرقی زمین میں تھا کہ انسان کی اصل توجہ خدا اور معنویات پر ہوتی تھیں۔

یہ نظریہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جائے ہم اس زمانے سے تھک چکے ہیں ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس زمانے کی کلیساؤں کی بحث کے بدلے اصل انسانیت کی طرف پلٹ جائیں اور انسان و طبیعت کے ماورای خصوصاً خدا کے بارے میں بحث نہ کریں؛ البتہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کا انکار کریں لیکن ان سے ہمارا کوئی مطلب بھی نہیں ہے اور ہمارا معیار انسان ہونا ہے۔

اس اصل کو الہی ثقافت کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے، یہ الہی ثقافت کہتی ہے کہ ”سب کچھ اللہ“ ہے اور ہماری تمام تفکرات خدائی ہونا چاہئے اور ہماری تمام توجہ خدا کی طرف جا کر رکے، اور اپنی سعادت و کمال کو خدا کے قرب میں تلاش کریں، کیونکہ تمام تر سعادتوں، زیبائیوں، اصالتوں اور کمالات کا وہی سرچشمہ ہے، پس اللہ محوری ہے، اور اگر ”ایزم“ لگانا ہی چاہتے ہیں تو یہ نظریہ ”اللہ ایزم“ ہے یعنی خدا کی طرف توجہ ہونا چاہئے، انسان کی طرف نہیں، یہ تھا الہی اور مغربی ثقافت کا پہلا فرق، (البتہ ہم یہ تاکید کرتے ہیں کہ مغرب میں بھی استثناء کے قائل ہیں اور وہاں بھی بعض لوگ معنوی اور الہی نظریہ کے قائل ہیں اور ہماری مراد وہاں کی اکثریت ہے کہ جس کو مغربی تمدن کھا جاتا ہے)

دوسرا رکن: مغربی تمدن کا دوسرا اہم رکن ”سیکولرزم“ ہے، یعنی اصل انسان ہے اور انسان کو محور قرار دینے کے بعد اگر کوئی انسان کسی دین کی طرف مائل ہونا چاہے تو وہ اس طرح ہے کہ کوئی شاعر یا پینٹر بننا چاہے کہ کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں، جس طرح بعض فرقے مجسمہ سازی اور نقاشی کو پسند کرتے ہیں، بعض لوگ مسلمان یا عیسائی ہونا پسند کرتے ہیں ان کے لئے کوئی ممانعت بھی نہیں ہے، کیونکہ انسان کی مرضی کا ادب و احترام ہونا چاہئے۔

کھا جاتا ہے کہ اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے ایک طرف کسی دین کا انتخاب کرنا چاہے اس کی مثال اس شخص کی طرح کہ جو شاعری، ادبیات اور کسی دوسرے کام کو منتخب کرے اور اس کا انتخاب مورد احترام ہے؛ لیکن توجہ رہے کہ دین انسان کی زندگی کے اہم مسائل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور دین انسان کی زندگی کا رخ نہیں بدل سکتا، جس طرح شاعری یا کوئی دوسرا کام اگرچہ اہم ہے، اسی طرح دین بھی اہم ہے، فرض کیجئے کہ کچھ لوگ آرٹ میں مشغول ہیں اور انھوں نے ایک آرٹ گیلری بنائی کہ جس میں اپنے اپنے آرٹ کی نمائش لگائی، ہم بھی ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آرٹ ان کے لئے سیاست، اقتصاد، اور بین الاقوامی مسائل کا محور بن جائے؛ یعنی آرٹ ایک سائڈ کا کام ہے۔

ان کی نظر میں دین بھی اسی طرح ہے کہ اگر کوئی شخص خدا سے راز و نیاز کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ عبادتگاہ میں جائے اور شاعر کے شعر کی طرح خدا سے مناجات کرے، ہم سے کوئی مطلب نہیں ہے؛ لیکن اگر کسی ایک معاشرے میں کون سے قوانین حکومت کریں یا اقتصادی اور سیاسی نظام کس طرح کا ہو؟ دین کو ان چیزوں سے کوئی مطلب نہیں ہے، دین کی جگہ عبادتگاہ، مسجد یا بت خانہ ہے، اور انسان کے زندگی کی حقیقی مسائل علم سے متعلق ہیں اور دین کو زندگی کے مسائل میں کوئی دخالت نہیں کرنا چاہئے۔

اس نظریہ کو کلی طور پر ”سیکولر ایزم“ کہا جاتا ہے یعنی دین کو زندگی کے مسائل سے دور رکھنا، یا دنیا داری بھی کھا جاتا ہے، یا اصطلاح میں ”آسمانی فکر کرنے“ کے بجائے ”اس دنیا کی فکر کرنے“ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

کھتے ہیں کہ پیغمبر پر ملائکہ کا نازل ہونا یا عالم آخرت میں ملکوت سے مل جانا وغیرہ جیسی باتوں کو چھوڑو اور اس دنیا کے بارے میں سوچو! کھانے، لباس، ناچ گانا اور میوزک کے بارے میں باتیں کرو کہ جن کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، اور انسانی زندگی کے اہم امور بالخصوص اقتصاد، سیاست اور حقوق علم سے مربوط ہیں، اور دین کو ان میں کوئی دخالت نہیں کرنا چاہئے، یہ ہے مغربی تمدن کا دوسرا رکن۔

تیسرا رکن: ”لیبرل ایزم“ ہے، چونکہ اصل انسان ہے اور انسان مکمل طور پر آزاد ہے مگر بعض ضرورتوں کے پیش نظر، انسانی زندگی کے لئے کوئی قید و شرط نہیں ہونا چاہئے، کوشش یہ کرنا چاہئے کہ محدودیتوں کو کم کیا جائے اور ارزشوں کو محدود بنایا جائے، یہ صحیح ہے کہ ہر معاشرہ میں کچھ ارزشیں ہوتی ہیں لیکن ان کو مطلق قرار نہیں دیا جاسکتا، ہر انسان کسی بھی گروہ کے رسم و رواج کو اپنانے میں آزاد ہے، لیکن ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ان کو اجتماعی ارزش قرار دیا جائے اور ان کو سیاست و حقوق اور اقتصاد میں ان کو دخالت کرنے دیا جائے، انسان آزاد ہے جس طرح کا معاملہ کرنا چاہے کرے، اور جو چیز بنانا چاہے بنائے کسی بھی کام میں مشغول رہے، اور جہاں تک ممکن ہو اقتصاد میں آزادی ہو، اور مفید معاملات میں کسی محدودیت کا قائل نہ ہو، چاہے فائدہ ہو یا نہ ہو، اور جہاں تک ممکن ہو مزدور سے کام لیا جائے اور اس کے کام کے وقت کو معین نہیں کرنا چاہئے، تاکہ مالدار لوگوں کو مزید فائدہ پہنچے۔

مزدور کی مزدوری جتنی کم ہو بہت رہے، انصاف و محبت اور عدالت لیبرل ایزم سے ہم اہنگ نہیں ہے، لیبرل انسان صرف اپنے فائدہ کی فکر میں ہو، البتہ کبھی کبھی قانون کی رعایت بھی کی جائے تاکہ بغاوت اور دوسری مشکلات پیش نہ آئیں، لیکن اصل یہ ہے کہ انسان جس طرح بھی چاہے کرے، لباس میں بھی انسان آزاد ہے یہاں تک کہ اگر چاہے تو برہنہ باہر نکل آئے، کوئی بات نہیں، اور اس کو روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے، البتہ کبھی کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ اگر کوئی برہنہ باہر نکلنا چاہے تو لوگ اس کو گالی دیتے ہیں برا بھلا کہتے ہیں اور اس چیز کو برداشت نہیں کرتے، یہ ایک الگ بات ہے، ورنہ کوئی بھی قانون انسان کو محدود نہیں

کر سکتا کہ کیسا لباس پہنے لمبا ہو یا چھوٹا، کسا ہوا ہو یا ڈھیلا، مرد برہنہ ہو یا عورت، سب کو آزاد ہونا چاہئے، اور جہاں تک ممکن ہو مرد و عورت کے درمیان رابطہ آزاد ہونا چاہئے، صرف معاشرہ میں مشکلات پیدا ہونے کی صورت میں تھوڑا بہت کنٹرول کیا جائے! آزادی کی حدیں تک ہے، لیکن اگر اس حد تک نہ پہنچے تو عورت مرد آزاد ہے جو ان کا دل چاہے کریں، جہاں چاہیں جائیں، جس طرح کا رابطہ رکھنا چاہیں، رکھیں۔

سیاسی مسائل اور دوسرے مسائل میں بھی اسی طرح ہے، اصل یہ ہے کہ کوئی بھی قید و شرط انسان کو محدود نہ کرے مگر یہ کہ ضرورت اس چیز کا تقاضا کرے، یہ ہے لیبرالیزم کا اصل ہدف، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مغربی تمدن کے تھرے رکن ہیں، ”اومانیزم، سیکولر ایزم اور لیبرل ایزم“ اور یہ قانون گذاری میں اہم کردار رکھتے ہیں۔

۵۔ اسلامی اور مغربی تمدن کا بنیادی فرق

پہلا مسئلہ ”اومانیزم“ ہے کہ جو اصالت خدا کے مقابلہ میں ہے جو لوگ اس نظریہ کو مانتے ہیں مسلمانوں کی طرح خدا اور اس کے قانون گذاری کو نہیں مانتے، یہ لوگ صرف اپنے فائدہ، لذتوں اور اپنے آرام کے چکر میں ہیں، اگرچہ مغربی مکاتب میں کم و زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً یہ کہ لذت و منفعت میں اصل انفرادیت ہے یا اجتماعی؟ البتہ یہ تمام مکاتب ایک اصل میں متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ حتی الامکان قید و شرط میں کمی ہونا چاہئے، اس الحادی نظریہ کے مقابلہ میں الہی مکتب فکر اور الہی تمدن ہے، کہ جس کا کہنا یہ ہے کہ انسان اصل نہیں ہے، بلکہ خدا اصل ہے اور خدا ہی تمام کمالات و زیبائی و سعادت کا سرچشمہ ہے وہی حق مطلق ہے انسان پر سب سے بڑا حق اسی کا ہے اور انسان اس طرح عمل کرے تاکہ اس سے رابطہ رہے، اپنی زندگی میں خدا کو نا دیدہ نہیں کیا جاسکتا، انسان کا کمال خدا پرستی میں ہے اور انسان کا فطری طور پر اللہ سے لگاؤ رکھتا ہے اور اگر ہم اس لگاؤ کو نا دیدہ کریں تو انسان خود اپنی انسانیت کو نابود کر رہا ہے، لہذا تمام افکار و اندیشہ میں اصلی محور خدا ہے کہ اس کا نقطہ مقابل انسان کو محور بنانا ہے۔

دوسرا مسئلہ سیکولر ایزم ہے کہ جس کے مقابلہ میں اصالت دین ہے، ایک مومن انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور اہم امر دین کا انتخاب کرنا ہے اس کے لئے آب و نان کی فکر سے پہلے اپنے منتخب دین کی تحقیق ضروری ہے کہ یہ دین حق ہے یا نہیں، اس کا دین صحیح ہے یا فاسد؟ اور کیا خدا نے واحد پر اعتقاد رکھنا صحیح ہے یا غلط؟ کیا خدا کی یاد بہت رہے یا خدا سے بے توجہی؟ ایک خدا کا اعتقاد صحیح ہے یا تین یا چند خداؤں کا اعتقاد؟ لہذا جس روز اس پر تکلیف واجب ہوتی ہے اسی دن اس کو یہ طے کرنا ہوگا کہ خدا، وحی، قیامت وغیرہ کو قبول کرتا ہے یا نہیں؟ سب سے پہلے دین کا انتخاب کرے؛ کیونکہ دین زندگی کے تمام شعبوں میں دخالت رکھتا ہے، پس الہی تمدن میں دوسرا رکن دینداری ہے کہ جس کے مقابلے میں سیکولر ایزم ہے جو دین کو زندگی کی ایک سائڈ کا کام کہتا ہے جس کا ماننا یہ ہے کہ دین کو زندگی کے اہم کاموں میں دخالت نہیں کرنا چاہئے، اور دین کو اہم مسائل کے عنوان

سے پیش نہیں کیا جانا چاہئے اور زندگی تمام مسائل کو تحت تاثیر قرار نہ دے، جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو حلال و حرام سے خارج ہو، اور کسی بھی چیز کے حلال یا حرام ہونے کو دین معین کرتا ہے، یہ نظریہ سیکولرزم کا نقطہ مقابل ہے۔ تیسرا مسئلہ لیبرالیزم ہے؛ یعنی آزادی، ہوس بازی اور کسی قید و شرط کا نہ ہونا، لیبرالیزم یعنی اصل اپنی مرضی ہے، کیونکہ آزادی کے مختلف معنی کئے گئے ہیں لیکن یہاں اس کے معنی دلخواہ لیتے ہیں، اس لیبرالیزم کے مقابلہ میں حق و عدالت اور انصاف ہے، لیبرالیزم کہتی ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے جبکہ الہی ثقافت کہتی ہے کہ حق و عدالت سے کام لینا چاہئے، اور کوئی بھی ایسا کام نہ کیا جائے جو ناحق ہو، اسی طرح عدالت کی رعایت کی جائے، البتہ ان دونوں میں آپس میں رابطہ ہے کیونکہ حق کے کماحقہ معنی کئے جائیں تو عدالت کو بھی شامل ہوتا ہے:

”الْعَدَالَةُ اعْطَاءُ كُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ (عدالت ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کرتی ہے) پس عدالت میں حق پوشیدہ ہے، لیکن اس وجہ سے کہ اس میں کوئی غلط فہمی نہ ہو ان دونوں اصولوں کو ذکر کرتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ لیبرالیزم دلخواہی کو اصل ماننے کے نظریہ پر اعتقاد رکھتی ہے، اور اس کے مقابلہ میں دین عدالت و حق کا طرفدار ہے، دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ واقعاً حق و باطل دونوں ہیں ایسا نہیں ہے کہ جو بھی چاہیں مان لیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ تلاش کریں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ کیا عدالت ہے اور کیا ظلم ہے؟ اگر میں کسی پر ظلم کو اچھا مانوں تو کسی پر ظلم نہ کروں: لیبرالیزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حق و عدالت کی رعایت وہاں تک کریں کہ اس کی مخالفت سے معاشرے میں بحرانی کیفیت طاری نہ ہو، ہر کوئی اپنے فائدہ کی فکر میں رہے۔

کھا جاتا ہے کہ مروت و انصاف ایسی چیزیں ہیں جن کو انسان کمزوری کی وجہ سے ان کو اپناتا ہے، اگر آپ میں طاقت و قدرت ہے تو پھر جو چاہو انجام دو، مگر یہ کہ آپ کو احساس ہو جائے کہ اس آزادی سے معاشرہ میں بحران ہو سکتا ہے اور اس وقت بحران کی زد میں وہ خود بھی آسکتا ہے اس کا وقت محدود ہو جاتا ہے، پس الہی و اسلامی تمدن میں اصل عدالت و حق ہے۔

غربی تمدن میں ان تین ارکان کے علاوہ بھی اور دوسری چیزیں ہیں کہ یا تو عمومی نہیں ہے یا اصالت نہیں مانا جاتا، کہ جن میں سے ”اخلاقی پوزیٹوئیزم“ (Positivism) ہے یعنی اخلاقی ارزشیں انسان کے سلیقہ اور مرضی کے مطابق ہیں کہ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، مثلاً آج اگر کسی چیز کو پسند کیا اور اس کو اچھا لگا اور اس کی حمایت میں ووٹ دیا تو یہ با ارزش ہو جائے گا، لیکن اگر بعد میں اس میں کوئی برائی دکھائی دی، تو اس کو چھوڑ دیا تو یہ ارزش کے خلاف ہو جائے گا۔

ہم نے متعدد بار عرض کیا ہے کہ ہمارے معاشرے کے لوگ چونکہ ان کا ذہن صاف ہے، وہ جانتے ہیں کہ مغربی تمدن کس قدر برا ہے، مثال کے طور پر کہ جس معاشرے میں ہم جنس بازی کو بہت برا سمجھا جاتا تھا آج اسی کو قبول کیا جا رہا ہے، اس کو اچھا مانا

جا رہا ہے، اس کے بارے میں بہت رین فلسفہ تراشی اور بہت رین اشعار پیش کئے جاتے ہیں اور باقاعدہ اس بارے میں انجمن بنائی جاتی ہیں کہ ملک کے بڑے بڑے عہدہ دار افراد، منسٹر اور ایڈوکیٹ حضرات اس انجمن کے ممبر بنائے جاتے ہیں!!

سننے کی بات ہے کہ اس کام کی حمایت میں جو مظاہرے ہوتے ہیں ان کی تعداد عام مظاہروں سے کھیں زیادہ ہوتی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ لوگوں کا سلیقہ بدل چکا ہے، اب تک ان میں یہ رواج تھا کہ مخالف جنس کے ساتھ زندگی ہوتی تھی، لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم جنس کے ساتھ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں!! مرد سے مرد اور عورت سے عورت کی شادی کو باقاعدہ طریقوں سے حکومتی اداروں میں درج کرایا جاتا ہے!!

اس نظریہ کو ”اخلاقی پوزیٹونیزم“ کا نام دیا جاتا ہے کہ واقعاً جس میں اخلاقی اہمیتیں کسی بھی طرح عقلانی نہیں ہیں اور صرف لوگوں کی مرضی پر ہے، معیار لوگوں کے نظریات ہیں آج جس چیز کو بھی اچھا کھا وہی اچھا ہے اور اگر اسی کام کل برا کھنے لگیں تو برا ہے، لوگوں کی مرضی کے ماوراء کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ارزشوں کا ملاک و معیار بنایا جائے؛ یہ ایک نظریہ ہے نیز اسی طرح کے بہت سے نظریات ہیں جن کو بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں، پس جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مغربی تمدن کے تین اہم رکن ہیں:

۱۔ اومانیزم، ۲۔ سیکولرزم، ۳۔ لیبرالیزم، اور بھی تین اہم رکن قانون گذاری میں بہت زیادہ موثر ہوتی ہیں

۶۔ آزادی کے حدود کو معین کرنے میں اسلام اور مغربی تمدن میں فرق

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ دنیا بھر کے تمام عقلمند افراد، مطلق آزادی کا انکار کرتے ہیں، اور ہم کسی عاقل کو نہیں پہچانتے کہ جو یہ کہے کہ انسان اس قدر آزاد ہے کہ جس وقت جو چاہے انجام دے، لہذا جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ محدود ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی حد کیا ہے؟ مشہور یہ ہے کہ آزادی کی حد کو قانون بیان کرتا ہے، یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ قانون کس درجہ آزادی کو محدود کر سکتا ہے؟

ہم نے گذشتہ مطالب میں بیان کیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ کچھ اس طرح کی آزادیاں ہیں کہ جن کو کوئی بھی قانون محدود نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ قانون اور دین کے مافوق ہیں، اور ہم نے گذشتہ جلسوں میں یہ وضاحت کی ہے کہ قانون کی شان آزادی کو محدود کرنا ہے اور قانون گزار کو آزادی کو کافی حد تک محدود کرنے کا حق ہوتا ہے، اور قانون کے اصل معنی ہی یہی ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون آزادی کو کس حد تک محدود کر سکتا ہے، اس کا جواب الہی و مغربی تمدن کے لحاظ سے الگ الگ ہے: مغربی تمدن کے لحاظ سے، اگر انسان کا مادی خطرہ درپیش ہو تو اس وقت آزادی محدود ہو جاتی ہے اگر انسان کی زندگی میں اس کی جان و مال کو خطرہ لاحق ہو تو قانون آگے بڑھ کر اس کے مانع ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر، اگر قانون یہ ہے کہ صفائی کا خیال رکھنا ضروری ہے یا یہ کہ پینے کے پانی کو زھر یلا نہیں کرنا چاہئے، (کیونکہ اس سے لوگوں کی جان کا خطرہ ہے)، اس طرح کی آزادی کو محدود کرنا قابل قبول ہے، ایسی آزادی کو محدود ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کی صحت محفوظ رہے، اور اس قانون کے قبول کرنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، لیکن اگر کسی کام سے لوگوں کی عزت، ہمیشگی سعادت اور اس کی معنویات کو خطرہ ہو اور انسان کی روح گندی ہو جائے تو قانون کو اس سے ممانعت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اس موقع پر الہی اور مغربی ثقافت میں اختلاف پایا جاتا ہے:

الہی نظریہ کے تحت انسان ہمیشگی کمال کی طرف بڑھ رہا ہے اور قانون کو اس کے لئے راستہ کو ہموار کرنا چاہئے، اور اس راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو بھی ختم کرنا چاہئے، (قانون سے ہماری مراد وہ قانون ہے جو حقوقی و حکومتی قانون ہیں کہ جن کے جاری کرنے کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے اور فردی مسائل (اخلاقی مسائل) سے ہماری بحث نہیں ہے) اگر یہاں یہ سوال ہو کہ کیا قانون کو انسان کے معنوی فائدوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے؟ کیا ان چیزوں سے روکے کہ جو انسانی آخرت کی کامیابی کے خطرہ کو دور کرنا ضروری ہے؟

الہی تمدن کہتا ہے کہ ان چیزوں سے روکنا ضروری ہے، لیکن کفر والحاد کی ثقافت کا جواب منفی ہے (یعنی ان کی نظر میں ضروری نہیں ہے) شروع سے اب تک بحث اسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے تھی اگر ہم مسلمان و مومن ہیں اور خدا، رسول، حضرت علیؑ اور امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کو مانتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان معنوی وابدی ارزشوں کو قبول کریں۔

ہمارے قانون گزار حضرات الہی و معنوی مصلحتوں کا لحاظ رکھیں اور جو چیز انسانی معنویات کے لئے خطرناک ہیں ان سے روکا جائے ورنہ مغربی تمدن کے پیرو ہو جائیں گے، ایسا نہیں ہے کہ قانون فقط صحت و سلامتی اور مادی آسائش کو فراہم کرے اور جو چیزیں معاشرے میں ناآرامی کا سبب بنے ان سے روکے، نیز ان کاموں سے روکے کہ جن سے معاشرے کی اقتصادی امنیت خطرہ میں پڑتی ہے، بلکہ قانون کے لئے ضروری ہے کہ معنویات کو بھی مد نظر رکھے، ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں: یا اسلامی قانون کو قبول کریں یا مغربی قانون کو، البتہ ان دو چیزوں میں بہت سی ملاوٹ موجود ہے کہ جس کو ہم نے گزشتہ بحث میں ذکر کیا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں: ”يُؤْخَذُ مِنْ هَذَا ضِعْفٌ وَمِنْ هَذَا ضِعْفٌ فَيُمَزَجَانِ“^(۱)

تھوڑا بھلا سے لیا اور تھوڑا وہاں سے اور آپس میں ملا دیا۔

کچھ چیزیں اسلام سے لیں اور کچھ چیزیں مغربی تمدن سے اور ایک غیر ہم آہنگ مجموعہ بنالیا، اسلام اس طریقہ کو قطعاً پسند نہیں کرتا، قرآن کریم اس چیز کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا﴾ (٢)

”بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں سے انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں اور رکھتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس (کفر و ایمان) کے درمیان ایک دوسری راہ نکالیں، یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں“

آج بعض لوگ بھی چاہتے ہیں کہ کچھ چیزیں اسلام سے لیں اور کچھ چیزیں مغربی تمدن سے لیں اور ان کو ملا کر جدید اسلام کے نام سے دنیا والوں کے سامنے پیش کریں! حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا اسلام پر یقین نہیں ہے، اور اگر اسلام پر یقین ہوتا تو ان کو معلوم ہوتا کہ اسلام اس مجموعہ کا نام ہے کہ جس کی ضروریات کو قبول کرنا چاہئے، اگر کوئی یہ کھے کہ میں نے اسلام تو قبول کر لیا ہے لیکن اس کی بعض چیزوں کو نہیں مانتا، تو اس کی یہ بات قابل قبول نہیں ہے، لہذا قانون گزاری اور آزادی کو محدود کرنے میں ہمارے پاس ان دو راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے، اور ان میں سے ایک کا انتخاب ضروری ہے: یا تو آزادی کو محدود کرنے کا معیار مادی و دنیوی خطرات مانیں یا مادی اور معنوی خطرات کو معیار قرار دیں، اور اگر پہلے راستہ کو اپنایا تو گویا ہم نے مغربی الحادی تمدن کو قبول کر لیا، اگر دوسرے راستہ کو اپنایا تو اسلامی تمدن کو قبول کیا، اور جس حد تک بھی پہلے والے راستہ کے نزدیک ہوئے، مغربی تمدن کے قریب ہوئے، اور جس قدر بھی دوسرے تمدن کے نزدیک ہوئے اسلام سے نزدیک ہوئے، بہر حال ان دونوں میں کوئی رابطہ نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک مادی فائدوں کی بات ہوتی ہے تو وہاں مغربی تمدن اور اسلامی تمدن دونوں کہتے ہیں کہ ان کا خیال رکھا جائے مثلاً دونوں کہتے ہیں کہ صفائی کا خیال رکھا جائے، لیکن جہاں معنوی مسائل کی بات آتی ہے تو وہاں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

جس وقت صرف مادی فائدے پیش نظر ہوں تو آزادی محدود کر دیا جاتا ہے، اگر اس کے ساتھ معنویات کو شامل کر دیا جائے تو اس کے مقابلہ میں دو چیزیں ہو جاتی ہیں کہ جو ایک دوسرے کے متداخل ہوتے ہیں، کہ جس کے نتیجہ میں محدودیت کا دائرہ وسیع تر اور آزادی کا دائرہ محدود تر ہو جاتا ہے، اگر ہم یہ کھیں کہ اسلام کی آزادی مغربی آزادی کی طرح نہیں ہے تو اس کے معنی یہی ہیں یعنی دلیل یہ ہے کہ جب ہم معنوی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہیں تو پھر مغرب کی طرح بے لگام نہیں ہو سکتے، بلکہ انسانی روح سے متعلق امور کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے، جن کی وجہ سے ہماری آخرت سنورتی ہے، لیکن مغربی تمدن کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اجتماعی قوانین سے متعلق نہیں ہیں، حکومتی قوانین معاشرہ کے مادی مسائل میں جاری ہوتے ہیں، اور ان کے علاوہ اخلاق سے مربوط ہیں کہ جن کا سروکار حکومت سے نہیں ہے۔

جس وقت یہ کھا جاتا ہے کہ اسلامی مقدسات خطرہ میں ہے حکومت کے بعض ذمہ دار افراد کہتے ہیں کہ مجھ سے کیا ربط! میرے کام تو لوگوں کی زندگی کے مادی مسائل سے مربوط ہیں، دین کے مسائل علماء سے متعلق ہیں، اس کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے، حکومت کا ان سے کوئی مطلب نہیں ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت ہوتی ہے تو پہلے دین پھر دنیا کی بات کرتی ہے۔

اس بنا پر، ان دونوں تمدن کے پیش نظر بہت غور و خوض سے کام لیں اور ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ جس وقت ہمارے قدم اسلامی ارزشوں کے مقابلہ میں لڑکھڑائیں اور اپنے اندر کاہلی کا احساس کریں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کفر کے ماحول سے نزدیک ہوتے جا رہے ہیں، اور اسلام کی حقیقت کو بھولتے جا رہے ہیں، ہمارا یہ انقلاب صرف مادی فوائد کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہوا ہے، بلکہ ہم نے یہ انقلاب اسلام کی ترقی کے لئے کیا ہے، کیونکہ اس انقلاب میں اس قدر لوگ شہید ہوئے، اپنے عزیزو کی قربانی پیش کی، صرف اس وجہ سے کہ اسلام باقی رہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ مادی آسائش یا اقتصادی و سیاسی تعلقات میں اضافہ ہو، ان شہیدوں نے اپنی جان کو قربان کیا تاکہ اسلام پھیلے، اسلامی حکومت کے لئے سب سے پہلے اسلامی مسائل پر توجہ دینا ضروری ہے، اور اگر کوئی بعض چیزوں کے غلط معنی و تفسیر کرے اور مختلف مفاد کی خاطر حقائق کی تحریف کریں ہمیں ان سے کوئی مطلب نہیں، ہم تو مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ دین کی حد کھان تک ہے؟ اسلامی ارزشیں کتنی اہم ہیں اور ان کی محافظت کے لئے کس قدر جانفشانی کی ضرورت ہے؟ ہمارے برادران واقف ہیں، اسی لئے ایک عالم دین کی یہ ذمہ داری ہے کہ جس وقت معاشرہ میں کسی روحانی و معنوی بیماری کے پھیلنے کا خطرہ ہو تو لوگوں کو متوجہ کریں اور خطرے کا اعلان کرے۔

حوالہ

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۰

۲۔ سورہ نساء آیت ۱۵۰، ۱۵۱

سترہواں جلسہ ربوبیت تشریعی، حاکمیت اور قانون گزاری میں رابطہ

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

اسلام کے سیاسی نظریے کے تحت ہم نے گذشتہ جلسات میں عرض کیا کہ ایک حکومت کا اسلامی ہونا اس بات پر متوقف ہے کہ اس حکومت کے ارادے، اسلامی مقاصد اور اس کا معین کردہ راستہ کو اپناتے ہوئے قدم بڑھائیں، لہذا وہ حکومت، اسلامی کہ جس میں قانون گزار یا اور، عدالت یا اور مجری یا اور اسلامی راہ پر چلیں، یا یہ کھا جائے کہ خدائی اور اسلامی رنگ ہونا چاہیے، اور اجمالی طور پر وضاحت کر دی گئی کہ ان طاقتوں کا الہی و اسلامی رنگ ہونا معنی کیا۔

اسی طرح یہ بھی بیان ہو چکا کہ قوانین کے لیے مرحلے ہیں، اسلامی مقاصد کو مد نظر رکھا جائے اور یہ قوانین خدا کے براہ راست احکام کہ جو پیغمبر یا ان کے معصوم جانشینوں کے ذریعے پہنچنے میں کے مخالف نہ ہوں، اور دوسرے مرحلے میں قانون کا جاری کرنے والا عام معنوں میں کہ قوہ قضائہ کو شامل ہے کے ذریعے منصوب ہو، یا تو خدا براہ راست اس کو معین کرے، جیسے پیغمبر اکرم یا خدا کی طرف سے کسی کے ذریعے منصوب ہو، جیسے پیغمبر کے ذریعے ائمہ معصومین علیہم السلام کو منصوب کرنا، یا عمومی طور پر منصوب ہو، جیسے ولی فقیہ کہ جس کے بارے میں در حد امکان بحث ہو چکی ہے۔

۲۔ اصول موضوعہ کو معین کرنے کی ضرورت

اس چیز کو ثابت کرنے کیلئے کہ ایک اجتماعی اور صحیح و سالم حکومت مذکورہ شکل و صورت رکھتی ہو، اور ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا کہ اگر ہم اس مسئلہ کو ان لوگوں کیلئے بیان کریں کہ جو ہمارے فقہی و اعتقادی بنیادوں پر عقیدہ رکھتے ہیں، تو ان کے لئے شرعی دلیلوں خصوصاً قرآنی آیات کے ذریعے ثابت کر سکتے ہیں، لیکن وہ حضرات جو دین کی حقانیت، یا دوسرے بنیادوں کو کہ جو اس نظریہ کی بنیادیں قبول نہیں کرتے، لہذا اگر ان افراد کے لئے اس نظریہ کو ثابت کرنا ہے تو پہلے اصول موضوعہ کے بارے میں بتانا پڑے گا کہ اس بحث کے اصول موضوعہ کیا ہیں؟ اور پہلے ان کو اصول موضوعہ کو ثابت کرنا ہوگا، اصول موضوعہ ان مسائل کو کہتے ہیں کہ جو بدیہی اور ظاہری چیزوں سے شروع ہوتے ہیں اور اس نظریہ پر ختم ہوتے ہیں۔

جو لوگ استدلال حساب یا ہندسہ کے ذریعے کچھ چیزوں کو ثابت کرنے کے طریقوں سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہندسی بحثیں اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ پہلے کسی قضیہ کو اصل موضوع کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر

دوسرے قضیہ کو ثابت کیا جاتا ہے اور اس طرح قضیہ سوم کو اثبات کرتے ہیں اور اس طرح چوتھے اور پانچویں کو اثبات کرتے ہیں اور اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اگر بیسویں قضیوں کو ثابت کرنا چاہیں تو اس کیلئے انیسویں قضیہ کو پہلے سے ثابت ہونا ضروری ہے اور اس طرح انیسویں کو ثابت کرنے کے لئے اس سے پہلے والا قضیہ ثابت ہونا چاہیے۔

اگر کسی کے لئے کسی ایک قضیہ کو ثابت کرنا ہو تو یحان پر یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اس سے پہلے قضیوں کو کہاں تک درک کیا ہے، تاکہ ان کو بحث کا اصل موضوع قرار دیں وگرنہ اگر ہر ایک قضیہ کو اثبات کرنے کیلئے پہلے والے قضیوں کے اثبات کو تکرار کرنا پڑے گا، مثال کے طور پر جب ایک سیدھی لائن کی تعریف دو نقطوں کے درمیان چھوٹے فاصلہ یا دونوں ایک دوسرے کے مقابل لائن آپ ان کو کتنا بھی بڑھائیں وہ ایک دوسرے کو قطع نہیں کر سکتی ہیں ان کو بیان کریں، اسی طرح ہر ایک قضیہ کو بیان کرنے کیلئے کوئی نئے مسائل کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ گزشتہ مطلب ہی کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی ایک عقلی قضیہ کو ثابت کرنا چاہیں تو اس کے اصول موضوعہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، کہ جن کو الگ کسی دوسرے علم یا دوسری بحثوں میں ثابت کیا جا چکا ہے، مثال کے طور پر اگر یہ کہیں کہ قانون کو الہی قانون ہونا چاہیے تو خدا کا اثبات ثابت ہونا ضروری ہے، لہذا اگر کوئی کہے کہ میں خدا ہی کو نہیں مانتا تو پھر اس کے ساتھ کلامی اور فلسفی بحث کریں تاکہ اس پر ثابت ہو سکے کہ ہاں خدا بھی ہے، اور وہ خدا ایک ہے اور ہمارا رب ہے، تاکہ بحث کے دوران حکومت کے سلسلہ میں حکومت کی نسبت خدا کی طرف دی جاسکے۔

لہذا اگر اصول اولیہ سے بحث شروع کریں تو یہ بحث تکراری اور خستہ کندہ ہوگی، مجبوراً اس اصل کو بیان کریں جس کو مد مقابل بھی قبول کرتا ہے اور دور کی بحثوں کو اس کے علم پر چھوڑ دیں، البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب ہم ہندسہ کے دسویں قضیہ سے بحث کو شروع کریں تو اس سے پہلے قضیوں کو اثبات نہ کیا جاسکے، کیونکہ ان کو تو پہلے ثابت کر چکے ہیں، لہذا جن اصولوں کو پہلے ثابت کر چکے ہیں ان سے بعد میں نتیجہ حاصل کرتے ہیں، اس نکتہ کو بیان کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ اپنے مبانی (بنیادی نظریات) کے اعتبار سے گفتگو کرتے ہیں جبکہ دوسرے ان کو قبول نہیں کرتے، لہذا ان حضرات کے جواب میں یہ عرض کرتے ہیں کہ ہمارا مخاطب بھی ہمارے ساتھ بہت سی چیزوں کو مانتا ہے تاکہ ان کی بنیاد پر دوسری چیزوں کو ثابت کیا جاسکے اور اگر ان اصول و مقدمات کو نہیں مانتا تو پھر دوسرے علم کی طرف رجوع کریں اور وہاں ان مقدمات کو ثابت کریں۔

یہاں اس چیز کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے مغربی ثقافت کو ”اور مائیرم و لیرالیزم“ کی بنیاد پر اس کو کفر و الحاد کی ثقافت بتایا ہے جبکہ مغربی ممالک میں بہت سے افراد خدا کو ماننے والے ہیں، ہم نے مکرر عرض کیا ہے کہ مغربی ثقافت سے مراد صرف جغرافی علاقہ نہیں ہے اور ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ سبھی لوگ جو مغربی ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہاں پر بہت سے لوگ خدا کو مانتے ہیں اور اخلاقی قوانین کی رعایت کرتے

ہیں اور ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن مغربی ثقافت میں جو چیز عمل ہے وہ انہیں اصول پر مبنی نہیں کرتے، بعض خود ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کس منطق کے تحت گفتگو کر رہے ہیں، جو حضرات اہل بحث و استدلال ہیں اس طرز تفکر کی بنیاد کی معرفت رکھتے ہیں؟ اسی طرح ہم نے اس سے قبل التقاط (دوسروں کے نظریات سے متاثر ہونا) کے بارے میں بیان کیا کہ بعض لوگ مختلف ادیان سے کچھ چیزوں اخذ کر کے ایک جگہ جمع کرتے ہیں، ان چیزوں کی استدلالی اور بنیادی کو پہلو کو ثابت کئے بغیر، کیونکہ کبھی کبھی یہ چیزیں آپس میں سازگار اور ہم آہنگ نہیں ہوتیں، در نتیجہ ہم یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے تمام عقائد کو ملاحظہ کیا جائے تو اس طرح کے اشکالات ہمارے یہاں نہیں پائیں گے۔

بہر حال اس چیز کو اثبات کرنے کیلئے کہ ہمارا یہ سیاسی نظام و حکومت جو اسلامی نقطہ نظر سے ہے اور سب سے زیادہ عقلانی اور سب سے زیادہ حکیمانہ ہے، لہذا ہم اس کا استدلال شروع کرتے ہیں، ہم یہاں پر خدا کے اصل وجود اور انہیں صفات کو مسلم مانتے ہوئے اسی بنیاد پر اس مسئلہ کو بھی اثبات کرتے ہیں، گرچہ کچھ لوگ خدا کو قبول نہیں کرتے یا اس کے بعض صفات کو نہیں مانتے تو ان کو چاہئے کہ علم کلام کا مطالعہ کریں کیونکہ اس وقت ہماری بحث علم کلام میں نہیں ہے بلکہ سیاسی فلسفہ سے متعلق ہے لہذا یہاں پر علم کلام کی بحث نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ خدا کی حاکمیت اور تشریعی الوہیت

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ اسلامی حکومت کے سیاسی نظام کی اصل بنیاد خداوند عالم کی حاکمیت ہے، در حقیقت اس نظریہ کا سرچشمہ خدا کی تشریعی ربوبیت کا قائل ہونا ہے، اس سلسلہ میں اس مطلب کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام کا بلکہ تمام آسمانی ادیان کا معیار توحید ہے، کلمہ "لا الہ الا اللہ" ہے، جو ہمارے نبی اکرم کا اصلی نعرہ ہے، اور یہی تمام ادیان کا نعرہ تھا، اگرچہ اس میں تھوڑی بہت تحریفات ہوتی ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "لا الہ الا اللہ" کا کیا مطلب ہے؟ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اس جہان کا خالق و پیدا کرنے والا ایک ہے، لیکن کیا توحید کے یہی معنی ہیں؟ بعض "لا خالق الا اللہ" (خدا کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہے) کیا اسلام کی نظر میں توحید کے معنی صرف خلقت میں یگانیت و وحدانیت کا اعتقاد رکھنا ہے؟ چند سال پہلے اسلام کے نظام عقیدتی و نظام ارزشی میں توحید کے عنوان سے بحث میں ہم نے بیان کیا تھا کہ توحید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خالقیت میں یگانیت و وحدانیت کا قائل ہو جائے، اسلام کے لحاظ سے توحید کے معنی اس میں محدود نہیں ہیں، مکہ کے مشرکین بھی خالقیت میں توحید کا عقیدہ رکھتے تھے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَيْسَ سَاءَ لَهُمْ مَن خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ﴾^(۱)

”اور (اے رسول) تم اگر ان سے پوچھو کہ سارے آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہہ دیں گے کہ اللہ نے“
اس طرح شیطان بھی خدا کے وجود کا اعتقاد رکھتا تھا اور خالقیت میں توحید کو قبول کرتا تھا لیکن خدا نے پھر بھی اس کو کافروں میں شامل کر دیا

جیسا کہ قرآن مجید میں ابلیس کی خدا سے گفتگو سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ توحید در خالقیت اور خدا کی تکوینی ربوبیت کا معتقد تھا نیز معاد و عاقبت کا بھی اعتقاد رکھتا تھا:

﴿قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يَبْعُثُونَ. قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْتَضِرِينَ. إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ. قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَا زَيِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا غَوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾^(۱)

”شیطان نے کھا کہ اے میرے پروردگار خیر تو مجھے اس دن تک کی مہلت دے جبکہ (لوگ دوبارہ زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے خدا نے فرمایا: وقت مقرر کے دن تک کی تجھے مہلت دی گئی، شیطان نے کھا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھے راستہ سے الگ کیا ہے، میں بھی ان کے لئے دنیا میں (ساز و سامان کو) عمدہ کر دکھاؤں گا اور سب کو ضرور بھگاؤں گا۔“

نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان بھی توحید در خالقیت اور خدا کی تکوینی ربوبیت کا قائل تھا اور قیامت پر بھی اعتقاد رکھتا تھا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے کفر کی وجہ کیا تھی؟ شیطان کے کفر کی وجہ کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسلامی نقطہ نظر سے توحید کا نصاب پہچانا پڑے گا، یعنی اسلامی لحاظ سے انسان کب موحد یعنی اہل توحید بنتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ خلقت میں خدا کی وحدانیت خدا کی تکوینی و تشریعی الوہیت میں وحدانیت اور وحدت معبود کے اعتقاد سے انسان موجود بنتا ہے یعنی انسان خدا کو تنہا خالق مانے اور اسی کو کردگار، صاحب اختیار جہان، اور اصل قانون گزار مانے، اور الوہیت و عبودیت میں توحید کے اعتقاد کے ساتھ ساتھ اس کو عبادت کا مستحق مانے، توحید کے نصاب کی پہچان سے معلوم ہوا کہ شیطان کے کفر کی وجہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا انکار تھا خداوند عالم کی تکوینی ربوبیت کا انکار نہیں تھا۔

اس طرح خداوند عالم اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے بحث کرتے وقت ان عقائد کی طرف دعوت دیں کہ جن میں خود آپ اور وہ لوگ مشترک ہیں، اور وہ اعتقاد خدا کی وحدانیت اور اس کی عبودیت کا عقیدہ ہے اس کے بعد خداوند عالم ایک جملہ ارشاد فرماتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کو ان کے غیر خدا کی تشریعی ربوبیت کے عقیدہ سے روکے، کہ جس کی وجہ سے وہ اس دائرہ میں پہنچ چکی ہیں:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾^(۲)

”(اے رسول) تم (ان لوگوں) سے کھو کہ اے اہل کتاب تم ایسی (ٹھکانے کی) بات پر تو آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہو کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور ہم سے کوئی خدا کے علاوہ کسی کو اپنا پروردگار نہ بنائے۔“

اس آیت کی تفسیر میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان کا مضمون یہ ہے کہ اہل کتاب اپنے جیسے افراد کو اپنا خالق نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے اجبار و رہبان (روحانی علماء) کو اپنا تشریعی رب مانتے تھے اور ان کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں اجبار و رہبان کی بدون قید و بند اطاعت کو رب ماننے کے مترادف کھا ہے: ”وَلَا تَتَّخِذْ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ“ یعنی اپنے بزرگوں کی بدون قید و شرط اطاعت نہ کرو کہ یہ کام ایک طرح کا شرک ہے لیکن یہ شرک تکوینی خالقیت و ربوبیت کا شرک نہیں ہے اور نہ ہی الہیت و عبودیت کا شرک ہے، کیونکہ وہ لوگ اجبار و رہبان کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا شرک تشریعی ربوبیت میں تھا، یعنی خدا کے ساتھ ساتھ ان کو بھی قانون گزار مانتے تھے، کہتے تھے کہ خدا کے علاوہ دوسرے افراد اور خود پر بھی قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ صرف خداوند عالم کا قانون معتبر ہو، اور جو بھی کھے اس کی اطاعت کرنا ضروری ہو؟

جس طرح شیطان بھی خدا کی تشریعی ربوبیت کا منکر ہوا، اور اس نے کھا: ”اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ“ (میں اس سے بہت رہوں) مجھے جناب آدم کو سجدہ نہیں کرنا چاہیے جبکہ خدا کا حکم ہے کہ جناب آدم کو سجدہ کر، شیطان نے کھا میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا، کیونکہ میں اس سے بہت رہوں، یعنی شیطان خداوند عالم کے اس حکم کو تسلیم نہ کرتا تھا، دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ شیطان حق حاکمیت کو خدا سے مخصوص نہیں سمجھتا تھا، جس کی وجہ سے کافر ہو گیا، ورنہ تو وہ خدا اور اس کی ربوبیت اور قیامت کا منکر نہ تھا، شیطان کے کفر کی وجہ خدا کی مطلق حاکمیت کا انکار تھا، اسلام جس کفر کی نسبت اہل کتاب کی طرف دیتا ہے اور اس سے روکتا ہے اور توحید کی طرف دعوت دیتا ہے وہ تشریعی کفر و شرک ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اتَّخِذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا مِرُّوا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ (۴)

”ان لوگوں نے تو اپنے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو اور اپنے زاہدوں کو اور مریم کے بیٹے مسیح کو اپنا پروردگار بنا ڈالا حالانکہ انہیں سوائے اس کے اور حکم ہی نہیں دیا گیا کہ خدائے یکتا کی عبادت کریں۔“

وہ لوگ کبھی بھی اجبار و راہبوں کو سجدے نہیں کرتے تھے، لیکن بغیر کسی قید و شرط کی اطاعت کو ان کو رب ماننے کے برابر سمجھا گیا ہے، درحقیقت وہ لوگ قانون گزاری کو خداوند عالم میں مخصوص نہیں جانتے تھے۔

خالص توحید وہ ہے کہ جو ان شرکوں سے خالی ہو، نہ شیطان جیسا شرک ہو اور نہ اہل کتاب و الما شرک، اسلام میں توحید کا حد نصاب خدا کی توحید خالقیت، اس کی معبودیت اور اب ولایت تکوینی کے اعتبار کے ساتھ ساتھ تشریعی ربوبیت میں توحید کا اعتقاد بھی ضروری ہے، پس توحید کے یہ چار رکن ہیں کہ اگر ان میں کوئی ایک بھی نامکمل رہ گیا، تو پھر بھی توحید، حقیقی توحید نہیں ہوگی، اور اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ خدا کی خالقیت کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا بھی خالق ہے، یا کوئی دوسرا بھی رب تکوینی ہے جو مستقل طور پر عالم کا ادارہ کرتا ہے، یا حق حاکمیت یا حق عبادت رکھتا ہے وہ اسلامی توحید سے خارج ہے۔

لہذا تشریعی ربوبیت میں توحید کا قائل ہونا اسلامی توحید کا ایک رکن ہے اور تشریعی ربوبیت میں توحید کے عقیدہ کے بغیر اسلامی توحید نہیں ہو سکتی، ممکن ہے کوئی شخص ظاہری طور پر کلمہ شہادتین پڑھے اگرچہ اس پر طہارت کا حکم بھی ہوتا ہے لیکن یہ ظاہری احکام جن کی وجہ سے اس کو مسلمان شمار کیا جائے گا، اگر فقہا کرام اپنے توضیح المسائل میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شہادتین پڑھے تو اس پر طہارت کا حکم جاری ہوگا اور اس سے نکاح کرنا صحیح ہے اور اس کا ذبح کردہ حیوان حلال ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس نے کلمہ شہادتین پڑھ لیا ہو، وہ جنتی ہے اور عذاب جہنم سے نجات یافتہ ہے، بلکہ اس کے لئے اسلام کے دوسرے ضروریات کو پورا کرنا ضروری ہے اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے، ورنہ تو کلمہ شہادتین پڑھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیا اگر کوئی معاذ کا منکر ہو تو اسے مسلمان کھا جائے گا؟ یا اگر نماز و زکوٰۃ کا منکر ہو تو اس کو مسلمان کہیں گے؟ کلمہ شہادتین صرف اس چیز کی نشانی ہے کہ اس نے ”ما انزل اللہ“ پر اعتماد کر لیا ہے اور ظاہر اے مسلمان شمار کر لیا جائے گا۔

لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا اعتقاد نہ ہو، یا قیامت کو قبول نہ کرتا ہو، یا اسلام کی ضروریات کو دل سے قبول نہ کرتا ہو، تو وہ ظاہری طور پر تو مسلمان ہے لیکن حقیقت میں وہ کافر ہے، اگرچہ اس پر اسلامی احکام اس پر جاری ہونگے، پس ظاہری اسلام اور چیز ہے او واقعی ایمان جو عذاب اخروی سے نجات کا باعث ہوتا ہے، وہ دوسری چیز ہے۔

جس وقت یہ کھا جاتا ہے کہ توحید کا ایک معیار تشریعی ربوبیت میں توحید کا اعتقاد ہے تو اس کا مقصد وہ توحید ہے جو سعادت اخروی اور عذاب جہنم کے عذاب سے نجات کا باعث ہے ورنہ ظاہری احکام کے اثبات کیلئے کلمہ شہادتین کا پڑھ لینا کافی ہے۔

۵۔ قانون گزار حضرات اور اسلام میں حاکمیت

اسلامی نظریہ اور تشریعی ربوبیت کی بنیاد پر یہ کھا جائے کہ قانون گذاری کا اصل حق خداوند عالم کو ہے اور خدا کے مقابلہ میں کسی کو قانون گذاری کا حق نہیں ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا قانون گذاری کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خدا کے قانون گزاروں کے مقابلہ میں ان لوگوں کو قانون گذاری کا حق ہے جن کو خداوند عالم نے اجازت دی ہے، اور ان کا قانون اس صورت میں قابل اجرا ہے وہ قانون خدا کے اذن سے ہو:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكِذْبَ. إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى

اللَّهِ الْكِذْبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ (۵)

”اور جھوٹ موٹ جو کچھ تمہاری زبان پر آئے (بے سمجھے بوجھے) نہ کھ بیٹھا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اس کی بدولت خدا پر جھوٹ، بہت ان باندھنے لگو اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ اور بہت ان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے“

پس اپنی طرف سے نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں چیز حلال اور فلاں چیز حرام، حلال و حرام آپ کے حساب سے نہیں ہے بس لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے، لہذا دیکھنا یہ ہے کہ خدا کا کہنا ہے:

﴿قُلْ ۚ اللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾ (۶)

”(اے رسول) تم کہہ دو کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہت ان باندھتے ہو“
جی ہاں خدا نے اپنے پیغمبر کو قانون گذاری اور امور دینی کی اجازت دی ہے۔

﴿وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ (۷)

”(اے ایمان دارو) خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو“
نیز فرمایا:

﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ﴾ (۸)

”اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی“

البتہ رسول خدا بھی اپنی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتے بلکہ آپ کا عمل بھی خدا کی وحی و الہام کے مطابق ہوتا ہے اور جب تک آیات نازل نہیں ہوتیں، الہی الہام اور غیر قرآنی وحی کے ذریعہ خداوند عالم کا تشریعی ارادہ ان تک پہنچتا ہے:

﴿مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (۹)

”اور وہ رسول) تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بھی نہیں کہتے، یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے“

اس بنا پر اگر کسی کو خدا کی طرف سے اجازت ہو تو وہ قانون کو واضح کر سکتا ہے اور اس کا بنایا ہوا قانون لازم الاجراء ہے شیعہ حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح پیغمبر اکرم کو قانون بنانے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح ائمہ معصومین کو بھی خدا کی طرف سے قانون بنانے کی اجازت ہے البتہ اس مطلب کی دلیل علم کلام میں واضح طریقہ سے بیان ہوئی ہے، ان میں سے ایک حدیث ثقلین ہے کہ جس میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے:

”إِنِّي تَارِكٌ فِي الثَّقَلَيْنِ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُم بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي، كِتَابَ اللَّهِ وَ عِزَّتِي“

(میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے ہر گز میرے بعد گمراہ نہ ہونگے ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت (اہل بیت)۔)

ہم یہاں پر شیعیت کے عقائد کو اثبات نہیں کرنا چاہتے، لیکن پھر بھی اشارہ کرتے ہیں کہ جو لوگ شیعوں کے اس قبول شدہ عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم کے علاوہ ائمہ معصومین کو اس طرح کی اجازت ملی ہوئی ہے، اس نظریہ کے مقابل میں بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ صرف رسول اکرم معصوم اور واجب الاحترام ہیں لیکن اس اختلاف نظر سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مثلاً اگر فرض کریں کہ ہم لوگ رسول اکرم کے زمانہ میں ہوتے اور آپ کسی شہر کیلئے کوئی حاکم بنا کر بھیجتے، اور فرماتے کہ اس حاکم کی اطاعت کریں، تو کیا یہ اطاعت واجب تھی یا نہیں؟ کیا یہ اطاعت، اطاعت پیغمبر خدا اور حاکمیت خدا کے مخالف ہوتی؟ ہر نہیں؟ کیونکہ وہ شخص اس پیغمبر کا نمائندہ ہے کہ جس کو خدا نے معین فرمایا ہے۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ائمہ معصومین بھی ایسا ہی اختیار رکھتے ہیں، اور ائمہ نے اس عصر حاضر کیلئے نوعی (عمومی) طور پر (نہ کہ شخصی طور پر) ان افراد کو منصوب فرمایا ہے جو ائمہ کی طرح سب صالح سے زیادہ ہیں ان کو حکومت کی اجازت ملی ہوئی ہے، اور یہ نظریہ چاہے مقبولہ عمر ابن حنظلہ یا مرفوعہ ابو خدیجہ یا دیگر روایات کے ذریعہ ثابت کیا جائے، یا عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جائے جیسا کہ فقہا کرام نے مختلف طریقوں سے اس نظریہ کو ثابت کیا ہے۔

پس جس طرح پیغمبر اکرم اپنے زمانہ میں کسی کو کسی شہر یا اسلامی علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجتے تھے، اور ان کی اطاعت وہاں کے رہنے والوں پر واجب ہوتی تھی، یا جس طرح حضرت علی نے اپنی خلافت کے دوران بہت سے لوگوں کو اسلامی ممالک منجملہ بحرین، ابواز، مصر وغیرہ کیلئے والی اور حاکم بنا کر بھیجا، اور ان حضرات کی اطاعت واجب تھی، اس غیبت کے زمانہ میں جو حضرات فقاہت و سیاست میں مالک اشتر کی طرح ہیں اور اسلامی معاشرہ کے چلانے کی صلاحیت اور توانائی رکھتے ہیں، ولایت فقیہ کے دلائل کے تحت ان کو اجازت ہے اور ان کی اطاعت بھی ہم لوگوں پر واجب ہے، اور وہ خدا کی تشریحی ربوبیت کے مخالف بھی نہیں ہے بلکہ ان کی حاکمیت بھی خدا کی شان میں سے ایک شان ہے۔

جس طرح خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے اور پیغمبر اس حاکم کو فرمان دیتے ہیں یا امام معصوم اپنے خاص جانشین اور والی کو اجازت دیتے ہیں ان کی اطاعت ہم لوگوں پر واجب ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہ والی و حاکم کی اطاعت پیغمبر اور خدا کی اطاعت ہے، اور اس والی و حاکم کی مخالفت پیغمبر اکرم کی مخالفت اور پیغمبر اکرم کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔

اس طرح ولی فقیہ کی اطاعت، امام معصوم کی اطاعت اور امام معصوم کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوگی، اور اس کی مخالفت معصوم کی مخالفت خدا کی مخالفت ہوگی، یہ مطلب مقبولہ عمر ابن حنظلہ کی روایت سے واضح و روشن ہے جس میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ينظرني من كان منكم ممن قد روى حديثنا ونظر في حلالنا وحرامنا وعرف احكامنا فليرضوا به حكما فاني قد جعلته عليكم حاكما. فاذا حكم بحكمنا فلم يقبله فانما استخف بحكم الله وعلينا رد والراد علينا الراد على الله وهو حد الشرك بالله“ (۱۰)

”اگر کوئی ہماری احادیث کو نقل کرنے والے کو دیکھے اور ہماری حلال و حرام کردہ چیزوں بیان کرنے والے کو دیکھے اور ہمارے احکام کو جانتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس کے حکم کو قبول کرے کیونکہ ہم نے اس کو تم پر حاکم قرار دیا ہے، لہذا اگر ہمارے حکم کے مطابق عمل کرنے اور کوئی اس کو قبول نہ کرے تو گویا اس نے خدا کے حکم کو سبک (ہلکا) سمجھا، اور ہم کو رد کیا اور جس نے ہم کو رد کیا گویا اس نے خدا کو رد کیا، اور یہی شرک بالہ ہے“

حضرت امام صادق علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ ”وہو علی حد الشرک“ کی کیا وجہ ہے کہ شرک کو توحید کے مقابلہ میں قرار دیا ہے اور توحید کے ارکان میں سے ایک رکن تشریعی ربوبیت میں توحید ہے اب اگر ہم نے خدا کی حاکمیت اور اس کے ساتھ ساتھ پیغمبر، انھ، اور ان لوگوں کی حاکمیت کو قبول کیا ہے کہ جن کو خدا و ائمہ نے منصوب کیا ہے، تو ہم نے تشریعی ربوبیت میں توحید کو قبول کیا ہے اور اگر اس کو نہیں مانتا تو پھر تشریعی ربوبیت میں شرک کیا، پس ”الراد علیہم“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے ان فقہا کرام کو رد کیا جن کو لوگوں پر حکومت کرنے کا حق ہے اس نے گویا ائمہ کو رد کیا ہے یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ میں ولایت فقیہ کو نہیں مانتا گویا وہ یہ کہتا ہے کہ میں امام معصوم کو نہیں مانتا، اور اگر کوئی امام کو قبول نہیں کرتا اس نے خداوند عالم پر ایک قسم کا شرک کیا ہے کیونکہ اس نے خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا انکار کیا ہے البتہ یہ شرک معنوی اور باطنی ہے، اور انسان کی نجاست کا سبب نہیں بنتا۔

لہذا ثابت یہ ہو گیا کہ اگر کوئی قبول کرتا ہو کہ درحقیقت حکومت کا حقدار سے مخصوص ہے اور اس کے بعد رسول اللہ سے مخصوص ہے اور خدا کی حاکمیت کے زیر سایہ رسول اللہ اور ائمہ۔ اور ان کے جانشین حضرات کی حاکمیت تحقق اور مشروعیت پیدا کرتی ہے، لیکن اگر ہم حاکمیت کی مشروعیت کو کسی دوسرے راستہ سے مانیں تو درحقیقت خدا کی حاکمیت کے بارے میں شرک کے قائل ہوتے ہیں، اس بنا پر، اسلامی حکومت میں الٰہی قوانین اور اس حاکم کے بنائے قانون کے تحت ہو کہ جو خدا کی طرف سے اذن رکھتا ہو اس کی عقلی دلیل خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت ہے، اگر توحید کو صحیح معنوں میں سمجھا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے اور اگر انسان اس نتیجہ کا انکار کرے تو گویا اس کا عقیدہ کمزور ہے اور اس کی توحید خالص نہیں ہے اور اس میں شرک کی آمیزش ہے۔ ممکن ہے کوئی سوال کرے کہ معاشرہ میں الٰہی قوانین کے ہونا کیا فلسفہ ہے؟ اگر کوئی خدا اور اس کے قوانین کو قبول نہ کرے اور خود اپنے لئے قوانین بنائے تو کیا معاشرہ کی فلاح و بھبود نہیں ہو سکتی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کس طرح جو معاشرے خدا کے قوانین کو تسلیم نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان کی زندگی بہت رہے؟ یہ وہ نظریہ ہے جس کو بہت سے روشن فکر لوگ بیان کرتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ قانون کا خدا کی طرف ہونا، کیا ضروری ہے؟ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خود ہم اپنے لئے قانون بنا کر اس پر عمل کریں اور کوئی مشکل نہیں ہے۔

۶۔ قانون گذاری حق خدا سے مخصوص ہونے کے دلائل

اس اعتراض کا جواب واضح ہونے کیلئے یہ توجہ رکھنا ضروری ہے کہ انسان ایک ایسا موجود واحد ہے جو مختلف پہلو رکھتا ہے اور یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے مرتبط ہیں انسان میں صرف اقتصادی پہلو نہیں ہے کہ اگر اقتصادی قانون بنا دیا تو معاشرہ میں اس کی اقتصادی مشکل آسان ہو جائے، کیونکہ اس کا اقتصاد اس کی سیاست سے مربوط ہے اور اس کی سیاسی، اجتماعی اور مدنی احکام سے مرتبط ہیں اس کے مدنی احکام اس کے جزائی احکام سے مربوط ہیں اور یہ سب بین الماقوامی قوانین سے مرتبط ہیں، اور تمام کے تمام انسان کے روحی و معنوی اور اخلاقی پہلو سے گہرا ارتباط رکھتے ہیں، انسان دس موجود نہیں ہیں اور نہ ہی دس روح رکھتا ہے، انسان ایک الہی روح رکھتا ہے جس کے مختلف پہلو اور گوشہ ہیں لیکن تمام ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔

لہذا اگر کسی ایک پہلو میں کوئی نقص و کمی پیدا ہو جائے تو پھر اس کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے، وہ خدا جس نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کیلئے اجتماعی زندگی مقرر فرمائی ہے، اجتماعی زندگی کی خاطر انسانی فطرت میں ایسے اسباب قرار دیئے جن کی وجہ سے انسان طبعی طور پر اجتماعی زندگی کی طرف رجحان پیدا کرتا ہے، لہذا خداوند عالم نے انسان کی خلقت ایک مقصد کے تحت کی ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ انسانی کمالات تک پہنچے، اور اسی کے تمام پہلو، معنوی پہلو کے تحت کام کریں، اور وہ ترقی کی منزلوں کو طے کرتا ہوا انسانی کمالات تک پہنچے:

﴿مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۱۱)

”ہم نے نہیں پیدا کیا جن وانس کو مگر یہ کہ ہماری عبادت کرے“

جو کچھ بھی ہم نے عرض کیا یہ سب کچھ عبادت کے زیر سایہ ہوں وہ عبادت جو توحید اور ربوبیت سے جدا نہ ہونے والا ارتباط رکھتی ہے، ورنہ انسانی کمال پیدا نہیں ہو سکتا، البتہ اس کے علاوہ بھی معاشرہ میں ظاہری طور پر نظم و ضبط پیدا ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی یقینی نہیں ہے، مثلاً جیسا کہ آج کل مختلف ممالک جن کا نمونہ امریکہ ہے اور امریکہ کے کلچر تمام ممالک کیلئے نمونہ قرار پائے ہیں، جب کہ ان کالجوں میں پولیس اسلحہ کے ساتھ رہتی ہے لیکن پھر بھی وہاں قتل و غارت ہوتا رہتا ہے، ملاحظہ کریں کہ یہ وہی نظام ہے جس کو انسان نے بنایا ہے اور اس طرح کے دوسرے کارنامے ہیں، جن کے بیان کرنے سے انسان کو شرم آتی ہے۔

یہاں تک کہ اگر فرض کیا جائے کہ خدا کے قوانین پر عمل انسان کے معنوی پہلو کون۔ نظر انداز کرتے ہوئے معاشرہ میں ظاہری طور پر نظم و ضبط قائم ہو جائے، تو پھر بھی اس کی زندگی کا اصل ہدف پورا نہیں ہوا ہے، کیا انسان کی زندگی موریانہ (ایک قسم کے

حشرات ہیں جو شہد کی مکھی کی طرح ایک جگہ مل کر زندگی کرتے ہیں (زندگی کی طرح ہے؟ یا انسان کی زندگی شہد کی مکھیوں کی طرح ہیں کہ جن کا ظاہر نظم کافی ہے، انسان کی زندگی یہ تمام نظام، امنیتیں، ترقیاں، علام اور ٹکنا لوٹری صرف اس وجہ سے ہیں تاکہ انسان کمال حاصل کر سکے اور خدا سے نزدیک ہو سکے، کون ہے جو ان روابط کو اچھے طریقہ سے سمجھتا ہے؟ کون حضرات ہیں جو بتائیں کہ کس کھانے سے یا کس کام سے انسان خدا کے نزدیک ہوتا ہے؟ کون یہ معین کرے کہ خنزیر کا گوشت کھانے، شراب پینے سے ہماری سعادت و کامیابی پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟ آج ڈاکٹروں نے ترقی کر کے یہ بتایا ہے کہ الکحل (شراب) زیادہ پینے کی وجہ سے انسان کا ذہن خراب ہو سکتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتے کہ شراب کے پینے سے آخرت کو بھی نقصان پہونچتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس سلسلہ میں تجربہ نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ کو تجربہ کیا بھی نہیں جاسکتا۔

انسانی زندگی کے قوانین اس طرح ترتیب دیے جائیں کہ زندگی کے تمام پہلو پیش نظر رہیں، اور صرف جسمانی بھداشت و نظافت، اقتصادی اور سیاسی وضعیت پر اکتفاء نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو دوسرے پہلوؤں سے جدا سمجھا جائے، بلکہ ان تمام پہلوؤں کو ایک مرتب اور ہم آہنگ نظام میں ڈھالا جائے، ظاہر ہے کہ ان تمام پہلوؤں کی مکمل آگاہی اور ان کے ایک دوسرے سے ارتباط اور ان کے ذریعہ آخری کمال تک پہونچانے کا علم خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے، لہذا قوانین کو بھی خدا ہی بنائے، اس کے علاوہ کونسا ایسا قانون گزار ہے کہ جو قانون بناتے وقت اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر سکے، اور ظاہر ہے کہ جو گروہ بھی قدرت و حکومت پر قابض ہوگا وہ اپنے فائدوں کے بارے میں قوانین کو بنائے گا، مثال کے طور پر انہیں اسلامی ممالک میں جب کوئی نئی حکومت بنتی ہے تو ایسے قوانین اور نحس نامے تیار کرتی ہے کہ جو اس گروہ کے فائدے میں ہو، اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ چاہے سمت راست پارٹی ہو یا بائیں بازو کی پارٹی، یہ انسان کی خاصیت اور طبیعت ہے اور بہر حال تمام انسان معصوم بھی نہیں ہیں۔

ان مسائل سے صرف وہ ذات مبرا ہو سکتی ہے کہ جس کو ان مسائل سے کوئی فائدہ نہ ہو، اور ایسی ذات خداوند عالم کی ذات ہے، اور اگر کوئی دوسرا قانون بنائے گا تو ممکن ہے کہ وہ قوانین اس کے لئے یا ضرر ہونگے یا نفع بخش، لیکن خدا کے بنائے قوانین سے خدا کو نہ کوئی نفع ہے اور نہ کوئی نقصان، وہ تو صرف انسانیت کے نفع و نقصان کو دیکھتا ہے، لہذا چونکہ خدا کا علم بے نہایت ہے اور قوانین کے بنانے سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ جبکہ انسان پر حق حکومت ربوبیت بھی رکھتا، اور اگر انسان حقیقی کمال تک پہونچنا ہے تو خدا کے حق ربوبیت کو ادا کرے، البتہ یہ ایک الگ بحث ہے اور مزید وضاحت کی ضرورت ہے جس کی تحقیق اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔

انسان ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں اور عرفی حقوق کی معرفت رکھتے ہیں، مثلاً کسان مزدور پر حق رکھتا ہے اور مزدور کسان پر حق رکھتا ہے، یا ایک (DM) لوگوں پر حق رکھتا ہے، اور لوگ بھی ڈی ایم پر حق رکھتے ہیں، لیکن کیا خدا لوگوں پر حق نہیں رکھتا؟ اور

اس حق کو ادا کرنے کا راستہ بھی معلوم ہے، اسلامی نظریہ کے مطابق، ان تمام حقوق میں سب سے پہلے خدا کا حق ہے، لہذا سب سے پہلے خدا کے حق کو ادا کیا جائے، تاکہ خدا کے حق کے زیر سایہ لوگوں کے حقوق بخوبی انجام دئے جاسکیں۔

تو کیا ممکن ہے کہ بنائے ہوئے قوانین میں انسان کے حقوق کا لحاظ کیا جائے لیکن خدا کے حقوق کو نظر انداز کر دیا جائے؟ اور اگر خدا کے حقوق کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو کیا خدا کے حقوق پر ظلم و جفا نہیں ہوا ہے؟ اور کیا اس ناشکری کے بعد انسان کمال کی منزل تک پہنچ سکتا ہے؟ خدا کی ناشکری سے بڑھ کر کون سی ناشکری ہو سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (۱۲)

”بے شک شرک بڑا سخت گناہ ہے (جس کی بخشش نہیں)“

سب سے بڑا ظلم خدا پر ظلم کرنا ہے، لہذا اگر خداوند عالم کے حقوق نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ظلم عظیم ہے، اس وقت کس طرح دوسروں کے ساتھ عدالت برقرار کر سکتے ہیں؟ انسان کس طرح عدل کر سکتا ہے درحالیکہ خود اپنے خالق پر ظلم کرتا ہے؟ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ غیر خدا کیلئے حق قانون گذاری کا عقیدہ ایک شرک ہے، لہذا چونکہ خداوند عالم ہمارے نفع و نقصان سے مکمل آگاہی رکھتا ہے اور خدا کیلئے قانون گذاری کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور خداوند عالم ہر پر تشریعی ربوبیت کا حق رکھتا ہے، سب سے پہلے مرحلہ میں خدا کے قوانین کی رعایت کی جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کے قوانین پر عمل کیا جائے کہ جن کو خدا کی طرف سے اجازت ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ جس کی خدا نے اجازت دی ہے، تاکہ انسان اس آیت کا مستحق قرار نہ پائے:

﴿قُلْ إِنْ رَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ إِنَّ اللَّهَ ذَنْ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾ (۱۳)

”(اے رسول) تم کہہ دو کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ خدا نے تم پر روزی نازل کی تو اب اس میں سے بعض کو حرام، بعض کو حلال بنانے لگے، (اے رسول) تم کہہ دو کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہت ان باندھتے ہو۔“

اس طرح دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لَتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكِذْبَ. إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى

اللَّهِ الْكِذْبَ لَا يَفْلِحُونَ﴾ (۱۴)

”اور جھوٹ موٹ جو کچھ تمہاری زبان پر آئے (بے سمجھے بوجھے) نہ کہ بیٹھا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اس کی بدولت خدا پر جھوٹ، بہت ان باندھنے لگو اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ اور بہت ان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔“

اس بنا پر، خدا کے تشریعی حق ربوبیت کی ادائیگی کیلئے پہلے خدا کے قانون پر عمل کریں، اور اس کے بعد تحقیق و بررسی کرے کہ اس نے کسی کو قانون گذاری کی اجازت دی ہے، یا کسی کو قانون کو جاری کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اگر قانون کو اس کی

اجازت سے جاری نہ کیا جائے تو پھر بھی خدا کے بندوں پر تصرف کرنا ان کے مولا و آقا کی اجازت کے بغیر ہوگا، اسلامی نظریہ کے مطابق خدا کی مرضی کے خلاف دوسروں پر تصرف کرنا تو دور کی بات ہے خود پر تصرف کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس وجہ سے انسان کو خود کشی کا حق نہیں ہے۔

ممکن ہے مغربی ممالک میں لیبرالی نظریہ کے تحت چونکہ انسان خود اپنا مالک ہے، لہذا اس کو خود کشی کا بھی حق حاصل ہے، لیکن اسلام میں اس طرح نہیں ہے، کیونکہ انسان خود اپنا مالک نہیں ہے بلکہ خدا اس کا مالک ہے، لہذا اس کو خود کشی کا بھی حق نہیں ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے اس کو اس کام کی اجازت نہیں ہے، خداوند عالم نے اگر انسان کو زندگی عطا کی ہے تو اس کا اختیار بھی خود اسی کو ہے، کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر کس طرح کسی غیر کو اس کی جان لینے کی اجازت ہوگی؟ جب انسان اپنا ہاتھ کاٹ ڈالنے یا اپنی آنکھ پھوڑ ڈالنے کا حق نہیں ہے اس لئے کہ ن کا مالک خدا ہے اور انسان کو ان کام کی اجازت نہیں ہے، تو پھر کسی دوسرے کو کھان سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے یا کسی مجرم کو قید کر دے؟ کسی کو بھی اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ دوسرے لوگ بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کی اجازت کے بغیر ان میں تصرف نہیں کیا جاسکتا، لہذا قانون گذاری اور قانون کو جاری کرنے میں خدا کی اجازت ضروری ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں اسلام کا سیاسی نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کی تشریعی ربوبیت، توحید کا رکن ہے، اور اگر کسی نے اس کی رعایت نہ کی تو پھر وہ شیطان کے کفر کی طرح کفر کا مرتکب ہوا ہے۔

حوالے

(۱) سورہ لقمان آیت ۲۵

(۲) سورہ حجر آیت ۳۶ تا ۳۹

(۳) سورہ آیت آل عمران آیت ۶۴

(۴) سورہ توبہ آیت ۳۱

(۵) سورہ نحل آیت ۱۱۶

(۶) سورہ یونس آیت ۵۹

(۷) سورہ نساء ۵۹

(۸) سورہ نساء آیت ۸۰

(۹) سوره نجم آیت ۳، ۴

(۱۰) کافی ج ۱ ص ۶۷.

(۱۱) سوره ذاریات آیت ۵۶

(۱۲) سوره لقمان آیت ۱۳

(۱۳) سوره یونس آیت ۵۹

(۱۴) سوره نحل آیت ۱۱۶

اٹھارہواں جلسہ

قانون گذاری کے شرائط اور اسلام میں اس کی اہمیت

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ جلسوں میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث میں دو سوالوں کا جواب دینا بہت ضروری ہے:

پہلا سوال: یہ ہے کہ معاشرے کے لئے قانون کا ہونا کیوں ضروری ہے؟

دوسرا سوال: یہ ہے کہ کون سا قانون مفید اور مطلوب ہے اور اس کے وضع کرنے کا اور پھر اس کو معاشرہ میں جاری کرنے کا مقصد کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں گذشتوں جلسوں میں ہم نے عرض کیا کہ دنیا کے تقریباً تمام ہی عقلاء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ معاشرے میں اخلاقی قوانین کے علاوہ حکومتی قوانین بھی ہونا چاہئے، لیکن دوسرے سوال کا جواب کہ قانون کا ہدف کیا ہے؟ اس سلسلے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے، ایک نظریہ یہ ہے کہ قانون معاشرہ کے نظم و ضبط سنوارنے کے لئے ہوتا ہے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قانون معاشرہ میں عدل و انصاف کے لئے ہوتا ہے، تیسرا نظریہ اس وقت لیبرالیزم نے بیان کیا ہے کہ قانون انسان کی انفرادی آزادی کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے یعنی انسان اپنی زندگی میں ہر طرح سے آزاد ہونا چاہئے کہ جو چاہے وہ انجام دے سکے، لیکن اس طرح مقام عمل میں مزاحمت اور ٹکراؤ ہوگا کہ بعض افراد کی وجہ سے دوسروں کی آزادی خطرہ میں پڑ جاتی ہے، لہذا قانون اس وجہ سے وضع کیا گیا ہے کہ سب کی آزادی برقرار رہ سکے، اور مزاحمت سے روکا جاسکے۔

جیسا کہ گذشتہ بحث میں ہم نے عرض کیا کہ اسلام کے سیاسی نظریات میں انسانوں کی انیت و نظم و ضبط اور عدالت وغیرہ کی حفاظت متوسط قسم کے اہداف ہیں، لیکن اسلام کی قانون گذاری کا اصل ہدف انسانوں کے مادی اور معنوی فوائد کی حفاظت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معنوی فائدے مادی فائدوں سے کھیں زیادہ اہم ہیں، لہذا قانون اس طرح ہونا چاہئے کہ جس سے انسان کی کمال تک پہنچنے کے لئے راہ ہموار ہو سکے یعنی جو تقرب خداوند متعال کا باعث بنے، لہذا جو چیزیں خدا کی طرف جانے میں مانع ہوں، وہ معاشرہ سے ختم ہو جانا چاہئے، مختصر الفاظ میں یہ کھا جائے کہ قانون وہ ہے جس میں تمام انسانوں کے مادی اور معنوی مصالح و منافع کی حفاظت ہو۔

یہاں پہنچنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون گزار کون ہونا چاہئے؟ اس سلسلے میں بھی مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، خلاصہ یہ کہ سیاسی اور حقوق الناس کے دعویدار حضرات کے درمیان دو شرطوں کو معتبر جانا گیا ہے:

پہلی شرط: قانون گزار وہ ہو جو قانون کے ہدف کو اچھی طرح جانتا ہو۔

دوسری شرط: قانون گزار معاشرہ کے منافع کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان نہ کرے، اور وہ قانون کے اہداف و مقاصد کو اچھی طرح جانتا ہو۔

ان دو چیزوں کو تقریباً تمام ہی لوگ قبول کرتے ہیں، اگرچہ ان کے قانون بنانے کے اہداف مختلف ہیں، بہر حال قانون بنانے سے کسی کا کوئی ہدف ہو وہ یہ ضرور مانتا ہے کہ قانون گزار کو قانون کے اہداف سے اچھے طریقہ سے واقفیت ہونا چاہئے، اور ان اہداف تک پہنچنے کے راستوں سے واقف ہو، تاکہ اس کے بنائے ہوئے قوانین کے ذریعہ ان اہداف تک پہنچا جاسکے، قانون گزار کا علم ایسا ہو کہ جس کے ذریعہ قوانین کے اہداف تک پہنچنے کا راستہ کا پتہ لگا سکے، اور قوانین کو اسی کے مطابق بنائے، اور اخلاقی صلاحیت ایسی ہو کہ معاشرہ کے مفاد کو اپنے مفاد پر قربان نہ کرے۔

۲۔ قانون گزاری کے شرائط خداوند عالم میں منحصر ہیں

اسلامی نظریہ کے مطابق مذکورہ شرطوں کے علاوہ، قانون گزار کی انسانی مادی و معنوی مصلحتوں سے واقفیت ضروری ہے اور کسی خاص فرد یا کسی خاص گروہ کے فائدہ کی خاطر معاشرہ کے فائدوں کو قربان نہ کرے۔

اسلام اس نکتہ کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ قانون گزاری کا اصل حق اسی کو ہے جو انسانوں کو امر و نہی کر سکتا ہو، اگر کوئی معاشرہ کی مصلحتوں کا علم رکھتا ہو اور وہ معاشرہ کی مصلحتوں کو اپنی ذاتی مصلحتوں پر مقدم کرے پھر بھی قانون گزاری کا حق اصلاً اس کو نہیں ہے؛ کیونکہ ہر قانون خواہ ناخواہ امر و نہی رکھتا ہے، جیسا کہ ہم نے بحث ”حق و تکلیف“ کے بارے میں گذشتہ جلسوں کے دوران عرض کیا کہ ہر قانون صریحاً یا اشارۃً امر و نہی رکھتا ہے، مثلاً تائیک دفعہ کھا جاتا ہے کہ دوسروں کے مال کا احترام کرو اور اس میں تجاوز نہ کرو، یہ امر صریح اور واضح ہے لیکن کبھی قانون میں ظاہری طور پر امر و نہی نہیں ہوتا، مثلاً کھا جائے کہ آپ کے لئے اس طرح کا حق ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے اس حق کی رعایت کریں، ان تمام چیزوں کا قانون ضامن ہوتا ہے، یعنی یہ ساری باتیں قانون کے اندر ہونا چاہئے گویا اس طرح کا امر پر بھی قانون مشتمل ہوتا ہے۔

لہذا قانون کو یہ حق ہے کہ دوسروں کو امر و نہی کرے اور یہ اصل حق خدا سے مخصوص ہے، چاہے شرط اول کے لحاظ سے دیکھا جائے جس میں یہ کھا گیا تھا کہ قانون گزار کو انسانوں کے مصلح سے آگاہ ہونا چاہئے، یا شرط دوم کے لحاظ سے دیکھا جائے جس میں یہ کھا گیا تھا کہ قانون گزار وہ ہے جو اجتماعی مصلح پر فردی مصلح کو مقدم نہ کرے، ان دونوں شرطوں کے اعتبار سے خدا متحقق ہے کیونکہ وہ انسانوں کے مصلح کا سب سے زیادہ عالم ہے، چنانچہ مذکورہ شرطیں سب سے زیادہ کامل خدا میں موجود ہیں؛ کیونکہ انسان کے اعمال کا کوئی بھی فائدہ خدا کو نہیں پہنچتا، مثلاً اگر تمام انسان مومن و متقی بن جائیں تو خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے

اور اسی طرح اگر تمام لوگ کافر ہو جائیں تو بھی خدا کا کوئی نقصان نہیں ہے، اگر تمام لوگ قوانین کی رعایت کریں تو بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے اسی طرح اگر تمام لوگ قوانین کی مخالفت کریں تو بھی خدا کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

لیکن تیسری شرط، (امرو نہی) خدا کے علاوہ کوئی بھی انسان اصلاً یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی کو امر و نہی کرے، انسان دوسرے کو اس وقت امر و نہی کر سکتا ہے جس کا دوسرے پر کوئی حق ہو اور لوگوں کا ایک دوسرے پر اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے، خدا کی نظر تمام کے تمام انسان برابر ہیں، خدا ان سبھی کا مالک ہے اور انسان اور اس کا تمام وجود خدا سے متعلق ہے، لہذا صرف خدا کو انسانوں پر امر و نہی کا حق ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ عرض کیا جائے کہ انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی ربوبیت کو پہچانیں اور اس کی ربوبیت کے حق کو ادا کرے اور خداوند عالم کی ربوبیت انسانوں کے لئے دو اعتبار سے ظاہر ہے:

۱۔ تکوینی، یعنی کائنات کے چلانے کا حق صرف ذات باری تعالیٰ سے مخصوص ہے وہی کائنات کا مدبر ہے، لہذا انسان اس چیز کا عقیدہ رکھے کہ خداوند عالم نے اس کائنات میں کچھ تکوینی قوانین نافذ کئے ہیں جن کے تعاون سے یہ کائنات رواں دواں ہے، چاند سورج اسی کے حکم سے گردش میں ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے اشارہ پر چلتا ہے، لہذا اس کائنات کا صاحب اختیار، رب تکوینی اور اس کائنات کا چلانے والا خدا وحدہ لا شریک ہے، اسی طرح یہ عقیدہ بھی رکھے کہ اس کائنات کا رب تشریعی بھی خداوند عالم ہے، گزشتہ جلسہ میں اس سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے کہ ربوبیت تشریعی بھی خدا ہی کا حق ہے اور ربوبیت تشریعی میں توحید اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان فقط خدا سے احکامات کو لے اور اس سے قانون کو اخذ کرے، اور قانون کو جاری کرنے والے افراد خدا کی اجازت سے معاشرہ میں جاری کرے۔

۳۔ قانون بنانے والے متعدد ہو سکتے ہیں (ایک اعتراض)

یہاں پر کچھ شبہات بیان کئے جاتے ہیں: (گزشتہ گفتگو میں ان اعتراضات و شبہات کے بارے میں ایک اشارہ ہو چکا، لیکن کبھی کبھی اخباروں یا تقریروں یا کانفرنس وغیرہ میں کچھ چیزیں بیان کی جاتی ہیں کہ جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یا تو ان لوگوں نے اس سلسلہ میں توجہ نہیں کی یا یہ کہ یہ بحث ان کو ہضم نہیں ہوئی، لہذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کر دی جائے) ان شبہات میں سے ایک یہ ہے: کہ آپ کہتے ہیں کہ قانون کو خدا وضع کرے، جیسا کہ ربوبیت تشریعی اس بات کا تقاضا کرتی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں ایسے قوانین کی ضرورت ہے کہ جن کو خدا نے نہیں بنایا بلکہ خود لوگوں نے ان قوانین کو بنایا ہے، اور اگر ان کو نہ بنایا جاتا تو معاشرہ میں بہت بڑی مشکل ہوتی، مثلاً وہ قوانین جو ہمارے اسلامی معاشرہ میں اسلامی پارلیمنٹ

کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں، ان قوانین کی ہمارے معاشرہ کو ضرورت ہے، لیکن ان کو خدا و پیغمبر نے نہیں بنایا، جن کا سب سے واضح نمونہ ٹریفک قوانین ہیں، کہ اگر یہ قوانین نہ ہوتے تو پھر کتنے حادثے ہوتے کتنے لوگوں کی جان خطرہ میں ہوتی اور کتنا مال برباد ہوتا۔ لہذا ایک طرف تو معاشرہ کو ایسے قوانین کی ضرورت ہے جبکہ خدا کی طرف سے ایسے قوانین نہیں بنائے گئے ہیں، نہ ہی قرآن مجید میں اس طرح کے قوانین موجود ہیں اور نہ ہی حدیث رسول اکرم اور ائمہ کے کلمات میں یہ قوانین ملتے ہیں، پس آپ کس طرح یہ کہتے ہیں کہ قوانین کو خدا کی طرف سے ہونا چاہئے اور خدا قوانین کو بنائے؟ اور اگر انسانی قانون گزار کے ذریعہ یہ قوانین بنائے جائیں اور ان کو معتبر سمجھا جائے تو اس بات کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون بنانے والے دو مرجع ہوئے ایک خدا اور دوسرے انسان، اور یہ آپ کے بیان کے مطابق تشریع میں شرک ہے، یہ ایک مہم اعتراض ہے کہ جو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے البتہ اس کا جواب بھی دیا جا چکا ہے لیکن جواب کو وہ لوگ صحیح ہضم نہ کر سکے۔

۲۔ گذشتہ اعتراض کا جواب

گذشتہ اعتراض کے جواب میں دو نکتوں پر توجہ کرنا ضروری ہے، پہلا نکتہ یہ ہے کہ قانون کی مختلف اصطلاحیں ہیں، کبھی کبھی کلی قواعد کو قانون کہا جاتا ہے، اور ان میں جزئی اور دوسرے دستور العمل شامل نہیں ہوتے، اور کبھی قانون کو اتنی وسعت دی جاتی ہے کہ اس دستور العمل کو بھی شامل ہوتا ہے جو ایک ادارہ کارینس اپنے کارکن کو دیتا ہے، البتہ یہ اطلاق بھی نادرست نہیں ہے بہر حال دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ قانون کی دو اصطلاح ہیں ایک خاص اور ایک عام، اور دونوں صحیح ہیں، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں بہت سے ثابت قوانین ہیں، جو کسی بھی وقت تبدیل نہیں ہو سکتے، اور ہر زمانہ میں تمام لوگوں کے لئے ثابت ہیں اور اسلام کے کچھ قوانین متغیر ہیں، جو زمان و مکان سے لحاظ سے ہیں اور ان قوانین کو فقہاء و مجتہدین جن کو دین کی صحیح شناخت و معرفت ہوتی ہے کلی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے بناتے ہیں۔

ہم جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ ایسے قوانین ہیں جو خدا کی طرف سے ثابت قوانین ہیں اور متغیر قوانین کے لئے خاص شرائط ہیں، ورنہ ممکن نہیں ہے کہ تمام ثابت متغیر قوانین کسی ایک قانون گزار کے ذریعہ بنائے جائیں، اور لوگوں کو تک پہنچائے جائیں، متغیر قوانین اپنے زمان و مکان کے اعتبار سے لاتعداد ہیں، اور ان کی کوئی حد نہیں، اور انسان کی ذہانت آغاز دنیا سے لے کر آخر تک کے متغیر قوانین کے تصور سے عاجز ہے، لہذا متغیر قوانین اپنے زمانہ کے اعتبار سے جو اس زمانہ اور مکان کا تقاضہ ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر چونکہ رسول اسلام کے زمانہ میں کوئی بھی موٹر گاڑی نہیں تھی تو اس موقع پر اگر یہ کہا جاتا کہ گاڑیوں کو داہنی طرف چلنا چاہئے یا بائیں طرف، تو کیا اس وقت کے لوگ اس قانون کو سمجھ سکتے تھے، اور اس قانون کے معنی کو درک کر سکتے تھے؟ لہذا قانون کو اس کے زمانہ کے لحاظ سے ہونا چاہئے، البتہ ان قوانین کے کچھ خاص شرائط ہیں کہ جن کو خدا

بیان کرتا ہے، لہذا جو لوگ ان متغیر قوانین کو مرتب کریں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان شرائط کی رعایت کریں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قوانین وہ حضرات بنا سکتے ہیں کہ جو ثابت قوانین اور متغیر قوانین کے شرائط کو بہت رطوبت پر جانتے ہوں۔

پس ہماری مراد اس قول سے کہ قوانین کو خدا کی طرف ہونا چاہئے، یہ ہے کہ ثابت قوانین ہمیشگی ہیں اور متغیر قوانین کے لئے بھی شرائط خدا کی طرف سے معین شدہ ہوں، جن کو متغیر قوانین کا میزان قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۚ لَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾^(۱)

”اور ترازو (انصاف) کو قائم کیا تاکہ تم لوگ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرو“

الہی اور توحیدی نظریہ جس بات کی تاکید ہے اور تقاضا کرتا ہے وہ تیسرا نکتہ ہے جس کو ہم نے قانون بنانے کے سلسلہ میں گفتگو کے دوران بیان کیا، اور وہ یہ ہے: چونکہ قانون میں امر و نہی ہوتا ہے، اور جس کو قانون بنانے کا حق ہے اس کو امر و نہی کرنے کا بھی حق ہونا چاہئے، اور وہ خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہے، خود انسان ایک دوسرے پر امر و نہی کا حق نہیں رکھتے لہذا قانون کو بھی نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اس کو جاری کر سکتے، لہذا اگر زمان و مکان کے لحاظ سے متغیر قوانین کو بنانا پڑے تو اس کی اجازت بھی خدا کی طرف سے ہو، کیونکہ صرف وہی ہے کہ جسے امر و نہی کا حق ہے، اور وہی دوسروں کو یہ حق عطا کر سکتا ہے تاکہ ان کے بنائے ہوئے قوانین معتبر ہو سکیں۔

۵۔ قانون گذاری میں خدا کی اجازت بے اثر ہے۔ (دوسرا اعتراض)

ایک دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ قانون گذاری میں خدا کی اجازت کا معتبر ماننا صرف ایک دعویٰ ہے، جس کا کوئی اثر نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ اس شرط سے قانون گذاری میں کوئی تغیر و مشکل ایجاد ہو، اور یہ صرف ایک الفاظ کا کھیل ہے، مثلاً اسلامی پارلیمنٹ میں ممبران جمع ہو کر کسی اجتماعی متغیر امر کے لئے قانون بنانے کا مشورہ کریں، اور اس کے بعد کوئی خاص قانون بنا کر پیش کریں، اس موقع پر کیا فرق ہے کہ خدا نے اجازت دی ہے یا نہیں؟ یہ صرف ایک لفظ ہے جس کو استعمال کیا گیا ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہے، لہذا قانون کا معیار یہ ہے کہ اچھائیوں اور برائیوں کو جاننے والے حضرات اس کی تحقیق و بررسی کر کے کوئی قانون بنادیں، اب یہاں کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ قانون اس کی طرف سے قانون گذاری کا حق ہے یا قانون دان افراد کے ذریعہ یہ قانون بنادیا جائے، (توجہ رہے کہ یہ اعتراض بھی اپنی جگہ اہم ہے)۔

۶۔ گذشتہ اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہم اس طرح کی اجازت کو معتبر جانتے ہیں، اور اصطلاح میں اس کو ایک امر اعتباری کھا جاتا ہے، اور کسی کا کسی دوسرے کو کسی کام کی اجازت دینے سے کام کی حقیقت نہیں بدلتی، لیکن کیا انسان کی اجتماعی زندگی ان اعتبارات کے علاوہ ہے؟ مثلاً اگر کسی شخص نے اپنی گاڑی کو کسی جگہ کھڑا کر دیا ہے اور آپ کو اس گاڑی کی ضرورت پڑ جاتی ہے، آپ اس پر بیٹھیں اور اپنے کام کمر کے واپس آجائیں تو کیا آپ اس کی اجازت کے بغیر اس گاڑی کو لے جاسکتے ہیں؟ اور ہو سکتا ہے کہ گاڑی کا مالک آپ کو اجازت بھی دیدے، لیکن جب تک اس کی اجازت نہیں ہے کیا آپ کو حق ہے کہ اس کی گاڑی کو لے جائیں؟

اگر آپ کو اجازت دیدے تو آپ اس کو لے جاسکتے ہیں، لیکن اگر اس کی اجازت نہیں ہے اور آپ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیں تو کیا یہ آپ کا کام خلاف قانون نہیں ہے؟ اور گاڑی کا مالک آپ پر مقدمہ میں دائر کر سکتا ہے کیونکہ اس نے آپ کو اجازت نہیں دی تھی۔

دوسری مثال تصور کیجئے کہ کوئی مرد و عورت آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں، کافی مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں مثلاً کافی مدت سے کسی ایک ادارے میں کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے اخلاق سے بھی واقف ہیں، ایک دوسرے کے گھر والوں کو بھی جانتے ہیں کہ مومن متدین ہیں، اور اب شادی کی تمام تیاریاں پوری ہو گئی ہیں؛ لیکن جب تک نکاح نہ ہو جائے یا ہر مذہب کے رسم و رواج پورے نہ ہو جائیں، اس وقت تک ان مرد و عورت میں جنسی رابطہ غیر مشروع ہے، ٹھیک ہے کہ نکاح الفاظ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، دونوں کی مرضی سے یہ نکاح ہوتا ہے، لیکن یہ ایسے الفاظ ہیں جن سے ہزاروں حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں، اور ہزاروں حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، انسان کی اجتماعی زندگی انہیں اعتباروں چلتی ہے، یعنی اجتماعی زندگی انہیں اجازت، دستخط، یا رد کرنے پر متوقف ہوتی ہے۔

تیسری مثال: فرض کریں کہ کسی کو شہر کا ڈی ایم (D.M) معین کیا جائے لیکن ابھی تک اس کا حکم نامہ نہیں آیا ہے اور اس کو اس عنوان سے نہیں پہچنایا گیا ہے، تو کیا اس کا حق ہے کہ وہ (D.M) کے دفتر میں جا کر بیٹھ جائے اور دستورات صادر کرے، ظاہر ہے کہ اس کو یہ حق نہیں ہے، اور ذمہ دار لوگ اس کو وہاں سے باہر نکال کھڑا کریں گے، اور کہیں گے کہ یہ ڈی ایم کی کرسی ہے! لیکن اگر وہ کھے کہ مجھے ایک مہینہ کے بعد اس شہر کا ڈی ایم بنایا جائے گا، تو اس کو جواب ملے گا کہ جس وقت تم کو یہ عہدہ سونپ دیا جائے گا تو آپ ہمارے ڈی ایم ہونگے، لیکن اگر وہ کھے کہ صرف رئیس اعلیٰ کا ایک دستخط اور اجازت ہی باقی ہے، کوئی بات نہیں، جواب ملے گا کہ وہی ایک دستخط تو آپ کے اعتبار کے لئے ضروری ہے، تو معلوم ہوا کہ تمام اجتماعی امور صرف ایک دستخط اور اجازت پر متوقف ہوتے ہیں، قانون گذاری بھی اسی طرح ہے، حق قانون گذاری خدا کا حق ہے، صرف اسی کی ایک اجازت سے دوسروں کے بنائے ہوئے قانون معتبر ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ یہ قوانین معتبر نہیں ہو سکتے:

﴿قُلْ ۚ اللَّهُ اِذْنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾ (۲)

”(اے رسول) تم کھ دو کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہت ان باندھتے ہو“

اگر خدا نے تم کو اجازت نہ دی ہو تو پھر تمہیں کیا حق پہونچتا ہے کہ تم کسی چیز کو حلال کھو یا حرام؟ قانون بنانا یعنی یہ کام جائز ہے یا وہ کام جائز نہیں، یہ کام حلال ہے اور وہ کام حرام ہے، جب تک تم کو خدا کی طرف سے اجازت نہ ہو تو کیا تم کو اس طرح کے احکام صادر کرنے کا حکم ہے؟ جمہوری اسلامی ایران کی پارلیمنٹ اور شاہ کے زمانہ کی پارلیمنٹ میں صرف اسی ایک بات کا فرق ہے کہ یہ پارلیمنٹ اس کے حکم سے کام کرتی ہے کہ جو خدا کی طرف سے ماذون (اجازت یافتہ) ہے، یعنی ولی فقیہ اس پارلیمنٹ کو متغیر قانون بنانے کی اجازت دیتا ہے اور انہیں کی اجازت کی وجہ سے یہ پارلیمنٹ معتبر ہوتی ہے۔

جب اس وقت ولی فقیہ امام زمانہ (عج) کی طرف سے یہ حق رکھتا ہے تو پھر دوسروں کو یہ حق نہیں ہے، جس طرح امام زمانہ (عج) کو خدا کی طرف سے یہ حق ہے تو پھر کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے، بہر حال جس شخص کو براہ راست یا غیر مستقیم طور پر خداوند کی طرف سے اجازت ہے وہ دوسروں کے امور میں تصرف اور دوسروں کو امر و نہی کر سکتا ہے، لیکن جس کو خدا کی طرف سے اذن نہیں ہے وہ امر و نہی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ اس کی امر و نہی کا کوئی اثر نہیں ہے۔

(ہم اپنی نظری اور تھیوری بحث میں نہیں چاہتے کہ کسی کی گفتگو کی بنا پر بحث کریں، لیکن امام خمینی کو دوسروں کی فہرست میں نہیں رکھا جاسکتا، ان کی گفتگو قرآن و حدیث سے اخذ شدہ ہوتی تھی، لہذا ان کی گفتگو سے دلیل پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے) امام خمینی اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں: ”یہاں تک کہ اگر کوئی صدر بھی ولی فقیہ کی طرف سے منصوب نہ ہو تو وہ طاغوت ہے اور اس کی اطاعت جائز نہیں ہے“ (۳)

صدر کو خود افراد اپنے ووٹ کے ذریعہ انتخاب کرتے ہیں لیکن اگر ولی فقیہ کی طرف سے اجازت نہ ہو تو امام خمینی کے فرمان کے مطابق طاغوت ہے، اور اس کا امر و نہی معتبر نہیں ہے، اور اس کی اطاعت بھی جائز نہیں ہے، حضرت امام خمینی نے تمام صدر و رئیس جمہور کو منصوب کرتے وقت فرمایا کہ میں تم کو منصوب کرتا ہوں، (بعض موقع پر آپ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ میں چونکہ تم پر الہی ولایت رکھتا ہوں اس وجہ سے صدارت پر منصوب کرتا ہوں) درحالیکہ لوگوں نے ان کو ووٹ دیا ہے اور ان کا ووٹ دینا بھی صحیح اور مورد تائید ہے۔

البتہ تمام لوگ بھی اجتماعی کاموں میں شرکت کریں اور ان کا شرعی وظیفہ ہے کہ ووٹنگ میں شرکت کریں، اسی وجہ سے جس وقت انتخابات شروع ہوتے تھے امام خمینی فرماتے تھے: انتخابات میں شرکت کرنا ایک شرعی وظیفہ ہے اور تمام لوگوں کو شرکت کرنا ضروری ہے؛ لیکن ہر قانون گزار و صاحب منصب کا اعتبار خدا کی طرف پلٹنا چاہئے، کیونکہ وہی صاحب اختیار ہے، خدا ہی نے پیغمبر اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو حکومت و قانون گذاری کی اجازت دی ہے، اور پیغمبر و ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف

سے عمومی طور پر ولی فقیہ منصوب ہوتا ہے جس طرح ان حضرات کے زمانے میں والی شہر و حاکم شہر معین ہوتے تھے، اور امام معصوم کی اجازت سے مشروعیت پیدا کرتا ہے اور جب ان کو اجازت مل گئی تو وہ معتبر ہو گئے۔

پس یہ اعتراض کہ اجازت ہونا یا نہ ہونا یا دستخط کرنا یا نہ کرنا قانون کے اجراء اور وضع کرنے میں کوئی فرق نہیں کرتا، تو جواب یہ ہے کہ فرق وہی فرق ہے کہ جو تمام اجتماعی امور میں فرق ہوتا ہے، جس ڈی ایم کا ابھی حکم نامہ نہ آیا ہو اس کا دوسروں سے کیا فرق ہے؟ یا تعلیمی بورڈ کا آفیسر جس کا ابھی حکم نامہ نہیں آیا دوسروں سے کیا فرق رکھتا ہے؟ اگرچہ طے یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں کے بعد ان کا حکم نامہ آجائے گا، لیکن جب تک ان کا حکم نامہ نہ صادر ہو اس وقت تک ان کی کوئی اہمیت نہیں، جس وقت یہ حکم نامہ ان تک پہنچ جائے گا اس وقت سے وہ اس عہدے پر فائز ہو جائیں گے، صرف ایک دستخط سے یہ حضرات دوسروں کے مال میں تصرف کر سکتے ہیں، جس طرح اگر کوئی شخص اپنی لاکھوں کی دولت آپ کے سپرد کر دے یا آپ کو بخش دے اور آپ کو اجازت دے دے کہ جس کام میں بھی چاہیں خرچ کریں یا کوئی اپنا مال عمومی طور پر وقف کرے یا کسی خاص آدمی کو بخش دے، بہر حال صرف ایک لفظ کہنے سے کہ ”میں نے اپنا مال تمہیں بخش دیا“ کام تمام ہو جاتا ہے اور اس مال میں دخل و تصرف حلال ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس کی اجازت نہ ہو اور اس نے نہ بخشا ہو، تو اس کے مال میں تصرف کرنا حرام ہے اور اگر کوئی اس کے مال میں اس طرح تصرف کرے تو وہ مجرم ہے۔

نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ تمام اجتماعی مسائل اسی طرح کے اعتبارات پر ہوتے ہیں اور جب تک یہ اذن و اجازت نہ ہوں اجتماعی امور میں وہ کام معتبر نہیں سمجھا جاتا، تو پھر کس طرح یہ کھا جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے حکومت کرنے والے اور ان کو امر و نہی کرنے والے کو اجازت کی ضرورت نہیں ہے؟

کیا خدا کی اجازت کے بغیر اس کے بندوں پر حکومت کی جاسکتی ہے؟ لوگ ہمارے بندے تو ہیں ان پر حکومت کرنے کا حق ہو، لوگ خدا کے بندے ہیں حاکم و راعی خدا کی نظر میں برابر ہیں اور جب تک خدا اجازت نہ دے تو پھر رہبر، امت، رئیس اور عوام الناس سب برابر ہیں اور جب خدا اجازت دے دے تب لوگوں پر اس کے امر و نہی معتبر ہوتے ہیں۔

۱۔ کیا انسان اپنی زندگی پر حق حاکمیت رکھتا ہے؟

یہاں پر ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی پر خود حق حاکمیت رکھتا ہے، اگرچہ ہم نے اس موضوع کے سلسلہ میں گفتگو کی ہے لیکن چونکہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اخباروں اور دوسرے رسالوں اور بعض مودب افراد کی تقریروں میں بیان ہوتا ہے یہاں تک ”ٹی.وی“ کے بعض کانفرنسوں میں بیان ہوتا ہے کہ لوگوں کی آزادی قابل احترام ہے، جیسا کہ قانون اساسی میں بھی موجود ہے

کہ لوگ اپنی زندگی پر خود حق حاکمیت رکھتے ہیں، یعنی از جانب پروردگار انسان خود مختار ہے؛ لہذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کر دی جائے:

لفظ ”حاکمیت“ کا استعمال حقوق الناس میں دو جگہ استعمال کیا جاتا ہے (البتہ چونکہ الفاظ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، چنانچہ جن کو اچھی طرح واقفیت نہیں ہوتی وہ ان الفاظ کو جا بجا استعمال کرتے ہیں)

اول: پہلی وہ جگہ ہے جہاں اقوام عالم کے حقوق کا ذکر کیا جاتا ہے اور کھا جاتا ہے کہ ہر قوم و ملت اپنی سر نوشت پر حاکم ہے، یہ ایک اصطلاح ہے کہ جو بین الاقوامی حقوق میں بیان ہوتی ہے، یہ اصطلاح مختلف ممالک کے آپسی روابط اور ایک دوسرے کے سامنے ان کا موقف اور پھر استعماری طاقتوں سے مقابلہ آراہی کرنا جیسے مباحث اور موارد میں استعمال ہوتی ہے۔ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی میں خصوصاً مغربی ممالک میں استعمار گری کا دور دورہ شروع ہوا، چنانچہ جس کے پاس جتنی طاقت ہوتی تھی اسی مقدار میں دوسرے ملکوں پر قبضہ کر لیتا تھا، یا اپنی طرف سے کسی ملک پر حاکم معین کر دیتا تھا کہ جو وہاں پر حکومت کرتا تھا، یعنی ایک ملت کی سر نوشت (مقرر) پر دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی یا پھر دوسرا ملک ان ک قیم اور ذمہ دار ہوتا تھا، اصل ”قیومیت“ ان موضوعات میں سے ہے جو بین الاقوامی حقوق میں بیان کیا جاتا ہے، پس جب لوگ عالمی ظلم سے واقف ہو گئے اور اپنے حقوق کے طالب ہو گئے تو ملت کی حاکمیت کا مسئلہ پیدا ہوا، اور اہستہ اہستہ مسئلہ حاکمیت ملت نے بین الاقوامی حقوق میں اپنی جگہ بنالی، اور کھا جانے لگا کہ ہر قوم اپنی سر نوشت پر حاکم ہے؛ یعنی دوسروں کو استعمار اور قیومیت کا حق نہیں ہے، ”حاکمیت ملی“ یعنی ہر قوم و ملت مستقل ہے اور اپنی سر نوشت پر خود حاکم ہے اور کسی ملت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسری ملتوں کا اپنے کو حاکم سمجھے، کسی بھی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی دوسرے ملک میں اپنی حاکمیت چلائے، پس یہ ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جو بین الاقوامی روابط میں بیان ہوتی ہے۔

حاکمیت کی دوسری اصطلاح خود معاشرہ سے متعلق ہے، اور یہ اصل اساسی و بنیادی حقوق سے مربوط ہے، یعنی ایک وہ معاشرہ کہ جس میں مختلف گروہ مختلف اقوام شامل ہیں، (قطع نظر اس چیز سے کہ اس معاشرہ کا دوسرے ملکوں سے کیسا رابطہ ہے) ان میں سے کسی قوم یا گروہ کو یہ حق نہیں ہے کہ خود کو دوسروں پر حق حاکمیت رکھتا ہو، برخلاف اس نظریہ کے کہ جو دنیا کے بعض ملکوں میں پایا جاتا ہے، کہ جن طبقاتی نظام قائم ہے اور ایک قسم قوم ذات پات کے لوگ حاکم ہوتے تھے جیسے ہندوستان میں ٹھاکر، پنڈت کے حاکم ہونے کا رواج تھا یا مسلمانوں میں سید اور پٹھان حاکم ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ اصل یہ بیان کرتی ہے کہ ہر شخص اپنی سر نوشت پر حاکم ہے، دوسرا اس پر حاکمیت نہیں رکھتا، پس کسی بھی معاشرہ کا کوئی فرد یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں گروہ یا فلاں قبیلہ کا حاکم ہوں، (یہ تھی ایک اصل)

ہم نے جو کچھ ذکر کیا، اس بات پر توجہ کرنے کے لئے تھا کہ ان دونوں اصول کا ماحصل یہ تھا کہ انسانوں کے درمیان رابطہ کی فضاء کو ہموار کیا جائے چاہے پہلی اصل ہو یا دوسری اصل، کیونکہ پہلی اصل جو عمومی بین الاقوامی حقوق سے متعلق ہے، جس کا کام ملکوں اور حکومتوں کے درمیان رابطہ کو بیان کرنا تھا اور واضح طور پر اس بات کو کھتی ہے کہ ہر ملت اپنی سرنوشت پر حاکم ہے، اور کسی دوسرے ملک کو ان پر حاکمیت کا حق نہیں ہے، لہذا اس اصل کے اندر اس چیز کو دیکھا گیا ہے کہ ایک معاشرہ دوسرے معاشرہ کے افراد سے کیا روابط رکھنے کے لئے نظر رکھتا ہے، دوسری اصل میں خود اپنے ملک کے افراد کے حقوق کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے یعنی دوسری اصل ملکی افراد کے حقوق کے بارے میں بحث کرتی ہے، اس میں یہ بیان ہوتا ہے ہر انسان اپنی سرنوشت پر حاکم ہے، یعنی دوسرے کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے پر حکومت کرے۔

بہر حال یہ تمام اصول انسان کے ایک دوسرے سے رابطہ سے متعلق ہیں نہ کہ انسان کے خدا سے رابطہ سے، جن لوگوں نے ان اصول کو بیان کیا ہے (چاہے کسی دین کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں) اس سے مراد کبھی بھی انسان کے خدا سے رابطہ کو مراد نہیں لیا ہے تاکہ یہ کھا جائے کہ خدا بھی انسانوں پر حق حاکمیت نہیں رکھتا، وہ یہ بیان نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ انسانی روابط یا حکومتی روابط کو بیان کرنا چاہتے تھے، کہ کیا کسی استعماری حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ کسی دوسری حکومت پر قبضہ کرے یا نہیں؟ یا ملکی پیمانے پر کسی ایک گروہ یا قبیلہ کو یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے پر حکومت کریں یعنی کسی قبیلہ کی سرنوشت دوسرے قبیلہ سے متعلق ہے یا نہیں؟

انسان اپنی سرنوشت پر حاکم ہے اس کے معنی یہ ہیں، کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی آقائی کو کسی دوسرے پر مسلط کرے، نہ یہ کہ یہ حق خدا کو بھی نہیں ہے، اب اگر فرض کریں کہ وہ تمام لوگ کہ جنہوں نے ان قوانین کو بنایا اور ان اصولوں کو بیان کیا، کیا وہ بے دین تھے اور خدا کو نہیں مانتے تھے، لیکن جب اسلامی جمہوری ایران کا قانون اساسی بن رہا تھا کہ انسان اپنی سرنوشت پر حاکم ہے تو کیا یہاں بھی خدا کو نا دیدہ قرار دیا گیا؟ یعنی کیا خدا کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو حکم دے؟

یا یہ کہ یہ اصل وہی ہے کہ جو اس وقت کی دنیا میں رواج یافتہ ہے، کہ جس کی بنا پر کسی انسان کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے، اور دوسروں کی سرنوشت پر حاکم نہیں ہیں؟ وہ لوگ یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ یہ کہیں کہ خدا حق حاکمیت نہیں رکھتا، اس بات کی شاہد وہ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کو قانون اساسی بیان کرتا ہے اور اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ معاشرہ میں الہی قوانین کا جاری ہونا ضروری ہے، ان اصول کے باوجود کس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ یہ حاکمیت جو انسانوں کے لئے طے ہے اس سے خدا کی حاکمیت کی نفی کرے،! کیا کوئی عقلمند جمہوری اسلامی کے قانون اساسی سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے؟

۸۔ انسان کی حاکمیت خدا سے نہیں ٹکراتی

تاکہ ہماری بحث اچھے طریقے سے واضح ہو جائے دوسرے علوم کی مثالیں پیش کرتے ہیں، تاکہ ان باتوں کو اچھی طرح واضح کیا جاسکے، اور شیطانی شبہات اور سوء استفادہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے: ”اعتماد بنفس“ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو ہماری ملت بلکہ دنیا کے تمام لوگ اس سے اچھے طرح واقف ہیں (کیونکہ یہ عالمی تمدن کا ایک جز بن چکا ہے) اور یہ مسئلہ ”علم نفسیات“ علم سے مربوط ہے کھایا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر اعتماد رکھنا چاہئے، یہ جملہ مکرر سنا جاتا ہے اور کتابوں میں بھی اس کو بہت پڑھا جاتا ہے، اور ریڈیو، ٹی، وی، میں اس مسئلہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے خصوصاً تربیتی اور فیملی گفتگو میں، اور کھا جاتا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اپنے نفس پر اعتماد پیدا کریں، اور جوانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں کہ اعتماد بنفس پیدا کریں، اسی طرح اخلاقی مسائل میں اس بات پر بہت توجہ دی جاتی ہے کہ لوگوں کو اپنے نفس پر اعتماد رکھنا چاہئے، اور دوسروں بوجہ نہ بنیں، جبکہ اسلام اس کے مقابلہ میں ایک دوسری چیز بیان کرتا ہے جو ”توکل علی اللہ“ ہے یعنی خدا پر بھروسہ اور اعتماد کرنا اپنے تمام امور میں یعنی انسان کو خدا کے مقابلہ میں اپنے کو کچھ نہیں سمجھنا چاہئے، اور تمام چیزوں کو اسی سے طلب کرے اور صرف اسی کو سب کچھ مانے۔

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (۲)

” (یاد رکھو کہ) اگر خدا کی طرف سے تمہیں کوئی برائی چھو بھی گئی تو پھر اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہوگا، اور اگر تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل و کرم کا پلٹنے والا بھی کوئی نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے فائدہ پہنچائے اور وہ تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے“

نفع و نقصان اس کی طرف سے ہے اور خدا کے مقابلہ میں انسان کا ارادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، انسان خدا کی عظمت کے مقابلہ میں ایک معمولی چیز ہے، اسلامی اور قرآنی تعلیمات میں اس چیز کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی اس طرح تربیت ہو کہ اپنے کو خدا کے مقابلہ میں بہت چھوٹا اور ناچیز تصور کرے، اور اسلام میں تربیت اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان اللہ کی ربوبیت اور اپنی عبودیت کا قائل رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک طرف سے انسان اپنے نفس پر اعتماد بھی رکھے، اور دوسری طرف خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ناچیز بھی سمجھے؟ کیا خود کو خدا کے مقابلہ میں ناچیز سمجھنا، اعتماد بنفس کے ساتھ ہم اہنگ ہے؟ یہ نظریہ اس اعتراض کی طرح ہے کہ جو حاکمیت کے بارے میں بیان ہو چکا ہے، کہ جو سیاسی مسائل سے مربوط ہے، اور یہ شبہ و اعتراض علم نفسیات اور اخلاقی تربیت میں بیان ہوتا ہے۔ ہم نے ان دو چیزوں کا موازنہ کیا ہے، چونکہ یہ دو چیزیں آپس میں مشترک ہیں ان

کو سمجھنے کے لئے ذہن تیار ہونا چاہئے، عرض کرتے ہیں کہ یہ علم نفسیات کا مسئلہ جو دوسروں پر اعتماد کے مقابلہ میں اپنے نفس پر اعتماد پر تاکید کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اپنے ماں باپ اور دوستوں پر تکیہ نہ کرے، اور دوسروں پر بوجہ نہ بنے، نہ یہ کہ اپنے کو خدا کا بھی محتاج نہ مانے۔

انسان کا ایک دوسرے سے رابطہ کے متعلق گفتگو اور اسی طرح ”اعتماد بنفس“ کا مسئلہ جس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے کردار کو اتنا مضبوط بنا لو کہ کسی دوسرے پر تکیہ نہ کرو یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اسلام میں بھی اس کی تاکید ہوئی ہے، حضرت رسول اکرم او رائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں اس بات پر تاکید ہوئی ہے، لیکن افسوس کہ ان مسائل پر کم توجہ کی گئی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل مغربی ممالک کی نئی طرز تفکر ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے ائمہ اطہار ان چیزوں کو پہلے بتا چکے ہیں۔ آنحضرت کے زمانہ میں آپ کے اصحاب اس طرح کی تربیت سے آراستہ تھے، چنانچہ اگر کوئی گھوڑے پر بیٹھا جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ سے تازیانہ گر گیا ہے تو وہ اس دوست سے نہیں کہتے تھے جو اس کے ساتھ چل رہا ہے کہ اس کے تازیانہ کو اٹھا کر دیدو، بلکہ خود گھوڑے سے اتر کر اس کو اٹھا لیتے تھے، اور پھر گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے، یہ اسلامی تربیت ہے کہ جو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، ہم خود اپنا بوجہ سنبھالیں، اور خود کو دوسروں کا محتاج نہ بنائیں، اور دوسروں پر نظریں نہ دوڑائیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنے کو بے نیاز سمجھیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾^(۵)

”لوگو! تم سب کے سب خدا کے (ہر وقت) محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی (سب سے) بے پروا سزاوار حمد (و ثنا) ہے“ کیا یہ فقر و ناداری والا انسان اپنے کو خدا سے بے نیاز سمجھے؟ خدا کے مقابلہ میں بے نیازی کا اظہار کرنا شرک ہے، لہذا اعتماد بنفس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا پر بھی اعتماد نہ رکھا جائے، اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا پر بھی اعتماد نہ کیا جائے، تو یہ قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے، سیکڑوں آیات و روایات اس سلسلہ میں موجود ہیں کہ انسان اپنے کو خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ہیچ سمجھے، اور تمام چیزوں کو خدا سے طلب کرے، اور اس بات کا اعتماد بنفس سے کوئی مطلب نہیں ہے، کیونکہ اعتماد بنفس کا مسئلہ انسانوں کے درمیان رابطہ کو بیان کرتا ہے چونکہ کوئی بھی کسی پر کچھ امتیاز نہیں رکھتا۔

لہذا اس بات کا جواب کہ اعتماد بنفس اور خدا پر توکل و بھروسہ ایک ساتھ کیسے جمع ہو سکتے ہیں، یہ ہے کہ اعتماد بنفس کا تعلق انسانوں کے رابطہ سے ہے، کہ ایک دوسرے پر تکیہ نہ کریں اور کوئی بھی دوسروں سے آگے قدم بڑھا کر نہ رکھیں نہ یہ کہ خدا پر بھی اعتماد نہ رکھے۔ اسی طرح سیاسی مسائل میں، انسان کی فردی حاکمیت کا مسئلہ ہے اور حاکمیت ملی میں بھی اسی طرح ہے، حاکمیت ملی یعنی ہر ملت خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور دوسروں کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان پر حکمرانی کریں۔ حاکمیت انسان پر خود یعنی کوئی بھی انسان خود بخود اپنے کو دوسروں کا حاکم تصور نہ کرے، نہ یہ کہ خداوند عالم بھی کسی پر حاکمیت نہیں رکھتا، دوسرے الفاظ

میں یوں کھا جائے کہ فردی اور ملی حاکمیت خدا کی حاکمیت کے طول (بعد) میں ہے یعنی اصل حاکمیت خدا سے مخصوص ہے، اور اس کے طول میں خدا نے جن کو حاکمیت کی اجازت دی ہے، یعنی خدا نے حکومت کرنے کا جو دائرہ جن کے لئے بیان کیا ہے وہ لوگ صرف اسی دائرہ اور حد کے اندر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں لہذا اگر خدا کی طرف سے اجازت نہ ہو تو پھر کسی انسان کو حق حاکمیت نہیں ہے۔

حوالہ

(۱) سورہ الرحمن آیت ۷، ۸۔

(۲) سورہ یونس آیت ۵۹

(۳) صحیفہ نور ج ۹ ص ۲۵۱

(۴) سورہ فاطر آیت ۱۵

(۵) سورہ یونس آیت ۱۰۷

حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کی خصوصیت

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ گفتگو میں ہم نے بیان کیا کہ بعض لوگ اسلامی حکومت پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت سے انسان کی انفرادی آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور چونکہ یہ آزادی انسان کا طبعی حق ہے، لہذا اسلامی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ ان آزادیوں کو محدود کرے، چنانچہ ایسی حکومت کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس اعتراض کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ قانون کی حقیقت یہ ہے کہ قانون آزادی کو محدود کرتا ہے۔ اور چونکہ انسان اپنے آزاد ارادہ سے اپنی مختلف خواہشات کی تحقیق و بررسی کر کے وہ اپنے لئے بہت رچیز کا انتخاب اور تعین کرنے کا حق رکھتا ہے، اس بات کا امکان ہے کہ کبھی یہ انتخاب، معاشرہ یا خود اس کے ضرور نقصان میں تمام ہو؛ لہذا اس کی ان آزادیوں کو کسی ایک قانون کے ذریعہ محدود ہونا چاہئے۔ لہذا یہ اعتقاد رکھنا کہ انسان کو مطلق آزادی ہونا چاہئے اور وہ اپنے تمام معاملات میں خود مختار ہو یہ سراسر نامناسب اور باطل ہے، اور نہ ہم کسی ایسے آدمی کو جانتے اور پہچانتے ہیں جو آزادی کو مطلق اور بے قید و بند مانے، بلکہ تمام دانشوروں کا ماننا یہ ہے کہ آزادی کو مشروع اور قانونی دائرے میں ہونا چاہئے، کیونکہ اگر آزادی کو بے لگام مان لیا جائے تو پھر عسرو حرج لازم آتا ہے اور اس کا نقصان انسانیت پر پڑتا ہے۔

ہمارے ملک کے قانون اساسی میں مشروع آزادی کو قبول کیا گیا ہے، اور شرعی اصطلاح کے مطابق، مشروع آزادیاں یعنی وہ آزادیاں جن کو شریعت مقدس نے جائز قرار دیا ہے، اور عرفی اصطلاح کے مطابق یعنی قانونی آزادی، اور چونکہ ہمارے ملک میں وہ قوانین معتبر ہیں جو اسلامی اصول کے مطابق ہوں، اسی طرح وہ آزادی معتبر ہے جو اسلام کی نگاہ میں مجاز اور جائز ہیں، البتہ یہ جواب ان لوگوں کی نظر میں قابل قبول ہے کہ جو اسلامی نظام اور جمہوری اسلامی کے قانون اساسی کو قبول کرتے ہوں، لیکن اگر کوئی اسلامی نظام اور قانون اساسی کو قبول نہ کرتا ہو، اور اسلام اور قانون اساسی سے صرف نظر کرتے ہوئے اس سوال کو اچھالے اور کہے کہ کیا دلیل ہے کہ آزادی کو محدود اور اسلامی ہونا چاہئے؟ اسلام کی تجویز کردہ آزادی کی حد سے کیوں آگے نہیں بڑھا جاسکتا؟

اس سوال کے جواب کے لئے کچھ مقدمات کو بیان کرنا ضروری ہے جن میں سے بعض کو اصول موضوعہ کے لحاظ سے آپ حضرات کو قبول کرنا پڑے گا، کیونکہ یہ مقدمات علم کلام، فلسفہ اور الہیات سے مربوط ہیں جن کو سبھی لوگ تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ

اگر ہم ان مقدمات کی توضیح اور تفسیر میں وارد ہوتے ہیں تو اصل گفتگو سے دور ہو جائیں گے، البتہ ان میں سے بعض مقدمات، مقدمات قریبی ہیں کہ جن پر یہاں بحث کی جاسکتی ہے۔

۲۔ حکومت سے مخصوص کاموں کے بارے میں تین نظریے

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ میں قانون کو جاری کرنے کے لئے حکومت کا ہونا ضروری ہے، یا حکومت کے دواہم اور بنیادی رکن قانون گذاری اور قانون کا جاری کرنا، لہذا ان قوانین کے لئے ایسے معیار و ضوابط ہونا چاہئے جن کی روشنی میں یہ قوانین بنائے جائیں۔ اور وہ معیار و ضوابط جن کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں سے کچھ اس چیز سے مربوط ہیں کہ حکومت کی تشکیل اور قوانین بنانے کا ہدف اور مقصد کیا ہونا چاہئے؟ اسی وجہ سے بحث فلسفہ سیاست میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت تشکیل دینے کی وجہ کیا ہے البتہ اس سلسلہ میں ہم نے گذشتہ بحث میں مختصر طور پر عرض کیا ہے، لیکن اس جگہ تفصیلی طور پر اس مطلب پر بحث کی تحقیق کرتے ہیں۔ (لیکن ابتداء میں ہم حکومت کے فلسفہ کے بارے میں فہرست وار تین نظریوں بیان کرتے ہیں تاکہ ان مطالب کی ارتباط کو بہت رطور پر پہچان لیا جائے اور پھر تفصیلی طور پر بحث میں وارد ہونگے):

۱۔ ”رئسانس“ کے زمانہ کے بعد بعض سیاسی فلاسفہ حضرات مثل ”ہابز“ کا ماننا یہ ہے کہ حکومت بنانے کا ہدف اور اس کی ذمہ داری فقط معاشرہ میں نظم و انیت کو برقرار کرنا ہے؛ دوسرے رسالہ الفاظ میں یوں کھا جائے: حکومت کی ذمہ داری داخلی و خارجی انیت کو برقرار کرنا ہے، یعنی حکومت کی اصلی ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے قوانین کو جاری کرے، جس سے معاشرہ میں بد نظمی اور عسرو صرح نہ پھیلے، اور اس سلسلے میں اندرونی و خارجی خطرات سے نپٹنے کے لئے دفاعی قوت (پولیس اور فوج) تشکیل دے، تاکہ وہ ملک اور اس کے تمام باشندوں کی حفاظت کر سکے۔

۲۔ بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے: حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرہ میں نظم و انیت کے ساتھ ساتھ عدالت کو بھی برقرار رکھا جائے۔

یہاں سے قانون، عدالت اور آزادی کے بارے میں ایک عمیق بحث (خصوصاً سیاسی اور جامعہ شناس حضرات کے درمیان) شروع ہو جاتی ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں بھی لکھی گئیں کہ آزادی، قانون اور عدالت میں کیا ہیں اور ان میں آپس میں کیا رابطہ ہے؟

اگر ہم قبول کریں کہ حکومت کی ذمہ داری معاشرہ میں انیت برقرار کرنے کے ساتھ ساتھ عدالت کا برقرار کرنا بھی ضروری ہے، تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ عدالت کے کیا معنی ہیں؟ عدالت کی حقیقت اور اس کے اصول کے بارے میں، مسلم و غیر مسلم دانشمندوں کے بارے میں مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں، اور جس بات کو سبھی قبول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ”ہر انسان کو اس

کا حق دیا جانا چاہئے“ اور عدالت کے اس معنی کو تقریباً سبھی دانشمندوں نے قبول کیا ہے؛ لیکن حق کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ عدالت کے معنی میں ”حق“ کا لحاظ کیا گیا ہے، مجبوراً ہم کو ایک دوسری بحث کرنا ہوگی اور وہ یہ کہ آزادی، حق، قانون اور عدالت میں کیا اور حق و عدالت میں کیا رابطہ ہے۔ بالآخر بحث یہاں پہونچتی ہے کہ ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اس کے منافع اور طبعی مصلح پورے ہوں اور یہ صرف عادلانہ قوانین کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتا ہے، جس میں لوگوں کی اجتماعی زندگی کے تمام حقوق (یعنی وہ چیزیں کہ جن کو انسان کی طبعی ضرورتیں اقتضاء کرتی ہوں) پورے ہوتے ہیں۔ اب چونکہ حقوق کی بات آگئی ہے لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں کون لوگ صاحب حق ہیں؟ کیا اجتماعی زندگی میں تمام لوگ صاحب حق ہیں یا اجتماعی زندگی میں صرف بعض لوگوں کو حق حاصل ہے کہ اجتماعی کاموں میں دخیل ہوں؟ واضح طور پر عرض کریں کہ وہ انسان جو معلول (اپاہج) ہیں اور معاشرہ کی کوئی بھی خدمت انجام نہیں دے سکتے اور ہاسپٹل یا آسایش گاہ^(۱) میں رہتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا، کیا وہ بھی معاشرہ میں حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر حق اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ میں کچھ خدمت انجام دیں، تو ایسے افراد کو کوئی حق نہیں ہے؛ کیونکہ یہ لوگ تو صرف معاشرہ کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ معاشرہ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا رہے ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ بعض معلول افراد ذہنی طور پر معاشرہ کی خدمت کریں، لیکن ہماری گفتگو ان اپاہج لوگوں کے سلسلہ میں ہے جو جسمی اور ذہنی طور پر محروم پیدا ہوتے ہیں اور معاشرہ کو جسمانی اور ذہنی خدمات نہیں پہونچا سکتے، کیا ایسے لوگ معاشرہ میں حق رکھتے ہیں؟ یا ایسا شخص جس نے صحت و سلامتی کے وقت معاشرہ کی خدمت کی ہے، لیکن اس وقت اپاہج ہو گیا ہے اور معاشرہ کی کوئی بھی خدمت نہیں کر سکتا کیا ایسا شخص معاشرہ میں حق رکھتا ہے یا نہیں؟

بعض جامعہ شناس حضرات کے مطابق ایسے لوگوں کے لئے معاشرہ میں کوئی حق نہیں ہے، اور حکومت پر بھی ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، قدیم روس کی مارکسٹ حکومت میں ایسے افراد کو معاشرہ میں کوئی حق نہیں تھا، اور کسی نہ کسی بھانہ سے ان کو ختم کر دیا جاتا تھا۔

(۱) وہ جگہ جہاں بوڑھوں اور بے وارث بچوں کو رکھا جاتا ہے۔

دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کا نظریہ موجود ہے۔ کیا معاشرہ میں حق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بدلے معاشرہ کی خدمت کی جائے؟ کیا وہ اپاہج کہ جو معاشرہ میں کچھ خدمت نہیں کر سکتا، صرف اس وجہ سے کہ وہ انسان ہے اور انسانوں میں پیدا ہوا ہے اور انسانوں میں زندگی گزارتا ہے، معاشرہ پر حق نہیں رکھتا؟ افسوس کہ وہ بعض افراد جو کہتے ہیں کہ حق معاشرہ کی خدمت کرنے سے حاصل ہوتا ہے، لہذا ان لوگوں کو کوئی حق نہیں ہے کہتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ رحم و محبت کی وجہ سے ان لوگوں

کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے آسائش گاہ بنواتے ہیں، ٹھیک ہے بنوائےں، ورنہ کوئی بھی ان کی موت کا ذمہ دار نہیں ہے!

۲۔ حکومت کی تشکیل کے ہدف کے بارے میں تیسرا نظریہ اسلامی ہے جس کے اندر حکومت کی ذمہ داری عدالت و انیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ معنوی اور روحانی ضرورتوں کو بھی پورا کرنا ہے۔

۳۔ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے کاموں میں ایک امتیازی فرق

اسلامی نظریہ کے مطابق، انیت اور خارجی دشمن کے مقابلہ میں اپنا دفاع، اور عدالت کو برقرار کرنا نیز معاشرہ کی خدمت کرنے والے کے حق کو ادا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری میں شمار کیا جاتا ہے، احسان، یعنی ضعیف و کمزور اور معاشرہ کے وہ لوگ کہ جو کچھ بھی خدمت انجام نہیں دے سکتے ان تمام لوگوں کی خدمت کرنا بھی حکومتوں کا وظیفہ ہے؛ جس طرح کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾^(۱)

”بے شک خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے کا حکم کرتا ہے“

مسلمانوں کی ذمہ داری صرف عدل نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بعض موارد میں احسان بھی کریں، وہ فقیر لوگ جو کچھ نہیں کر سکتے یا وہ اپاہج کہ جو معاشرہ میں کوئی خدمت نہیں کر سکتے، یہاں تک کہ وہ مادر زاد اپاہج چونکہ انسان ہیں انسانی معاشرہ میں حق رکھتے ہیں اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی روزمرہ ضرورتوں کو پورا کرے۔

مذہب اسلام اور دوسرے مذاہب میں ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اسلام انسان کی ضرورتوں کو صرف مادی اور بدنی ضرورتوں میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ معنوی اور اخروی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھتا ہے؛ اسی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری، لیبرل حکومتوں سے کہیں زیادہ ہیں: لیبرال حکومت صرف ان لوگوں جو معاشرہ میں کچھ خدمات کرتے ہیں ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں مانتی، لیکن اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کی خدمت کرنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اپاہج اور ناتواں لوگوں کی بھی مدد کرے، اور اس کے علاوہ انسانوں کی معنوی و روحانی احتیاجات کو پورا کرے، اسی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری بہت زیادہ ہو جاتی ہے، اس بنا پر اسلامی حکومت میں ایسے قوانین بنائے اور جاری کئے جائیں جن سے انسان کی انفرادی، اجتماعی، مادی اور معنوی، دنیاوی اور اخروی مصلحتوں کو پورا کیا جاسکے، نہ کہ صرف معاشرہ کے سرگرم افراد کی مادی منافعوں کی فکر میں رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ کی صحت پر کیا دلیل ہے؟ اور کیوں دوسرے نظریات صحیح نہیں ہیں؟ (توجہ رہے کہ ہماری یہ بحث صرف دینی نہیں ہے کہ ہم آیات و روایات کے ذریعہ دلیل قائم کر دیں، اگرچہ جہاں آیات و روایات کا موقع ہوتا ہے وہاں آیات و روایات سے بھی بحث کی ہے) کیا واقعاً انسانی معاشروں میں تمام مادی و معنوی منفعتوں کا پورا ہونا ضروری ہے یا صرف مادی منفعتوں کا پورا ہونا کافی ہے؟ دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ جس طرح حکومت کی تشکیل کے ہدف کے تحت یہ سوال ہوا تھا کیا حکومت اور قانون کا ہونا صرف امنیت کا برقرار ہونا اور عسرو صرح سے روکنا ہے یا حکومت کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ انسان کی معنوی مصلحتوں پر بھی توجہ ضروری ہے؟ اس مسئلہ کو حل کرنے اور گزشتہ سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ ایک قدم پیچھے ہٹیں اور یہ سوال کریں کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل کا کیا ہدف ہے؟

۲۔ انسانی معاشرہ کی حقیقت اسلام کی نگاہ میں

قبل اس کے کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل کے ہدف کو پہچانے، ضروری ہے کہ پہلے یہ بحث کی جائے کہ انسان ذاتی طور پر ایک اجتماعی موجود ہے جس طرح شہد کی مکھی اور چیونٹی جو اجتماعی زندگی کا حق انتخاب نہیں رکھتے؟ یا یہ کہ اجتماعی زندگی وہ چیز ہے جس کا انسان نے خود انتخاب کیا ہے؟ اس سلسلہ میں بھی بہت زیادہ بحث ہوئی ہیں ہم ان میں جانا نہیں چاہتے، صرف اس سلسلہ میں دو اہم نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے کوئی خاص مقصد مانا جائے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

جیسا کہ یہ نہیں کھا جاتا کہ کیوں شہد کی مکھیاں اجتماعی زندگی گذارتی ہیں، اور اس اجتماعی زندگی سے ان کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے کہ شہد کی مکھیاں ایک طبعی ہدف رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ شہد بناتی رہیں اور اپنی عمر اسی میں گذارتی رہیں، اس کے علاوہ ان کا کوئی ہدف نہیں ہے، البتہ خداوند عالم کی نظر میں ان شہد کی مکھیوں کے پیدا کرنے کے بھی بہت سے اہداف و مقاصد ہیں جن میں سے انسانوں کی خدمت ہے، الہی ہدف کے علاوہ شہد کی مکھیاں اپنی اجتماعی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رکھتیں، تو کیا انسان کی اجتماعی زندگی بھی اسی طرح خود بخود پیدا ہو گئی ہے اور ان کا کوئی ہدف نہیں ہے؟ یا یہ کہ انسان کی اجتماعی زندگی ایک خاص ہدف کے تحت ہے جس کا لازمہ ایک دوسرے سے رابطہ ہے اور یہ رابطہ خاص قوانین کا تقاضا کرتا ہے؟

اسلامی اور الہی نظریہ کے مطابق، انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک ہدف اور مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے سایہ میں رشد و ترقی کرے اور انسانی کمال تک پہنچے۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی خلقت کا ہدف کیا ہے؟ الہی نظریہ کے مطابق خصوصاً حضرت امام خمینی اور دوسرے علماء کرام نے انقلاب اور اس کے بعد میں لوگوں کے سامنے جو بیانات

پیش کئے ہیں ہم کو اسلامی معارف سے مزید آشنا کرتے ہیں، اور یہ بات ہمارے معاشرہ کے لئے روشن ہے کہ انسان کا نھائی اور آخری ہدف قرب خدا ہے اور یہ انسانی کمال کی حد ہے۔

البتہ اس مسئلہ میں ایک مقدار ابھام پایا جاتا ہے اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہے، لیکن ہم اس وقت اس کو تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے، بہر حال جو ہم نے عرض کیا کہ انسان کی خلقت ایک مقصد رکھتی ہے، لہذا انسان اپنی اس اجتماعی زندگی سے قرب پروردگار حاصل کرے یہی اس کا آخری اور نھائی مقصد ہونا چاہئے، اور یہ نظریہ اجمالی طور پر سبھی لوگ تسلیم رکھتے ہیں لہذا اگر ہم اس بات کو قبول کر لیں کہ انسان کی خلقت کا ہدف وہ کمال ہے جو خدا کی قربت میں حاصل ہو سکتا ہے، اور اجتماعی زندگی اس تک پہنچنے کے لئے ایک وسیلہ ہے تاکہ انسان کے لئے زمین ہموار ہو سکے کہ وہ اس کمال تک پہنچ سکے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اجتماعی زندگی نہ ہو تو انسان ضروری معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی ضروری عبادت انجام دے سکتا۔

نتیجتاً وہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس اجتماعی زندگی ہی وہ وسیلہ ہے جس میں انسان تعلیم و تعلم حاصل کرتا ہے اور انسان بہت زندگی کے راستہ کو پہچان سکتا ہے، اور اس کو طے کرنے کے لئے موقع فراہم ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں کمال تک زیادہ نزدیک ہو سکتا ہے، اگر ان برہانی مقدمات (جو اپنے مقام پر ثابت ہو چکے ہیں اور ان پر دلائل بھی موجود ہیں) کو قبول کریں تو نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اجتماعی زندگی کا ہدف انسانی کمال تک پہنچنا ہے نہ کہ صرف مادی چیزوں کو حاصل کر لینا، بلکہ انسان کے تمام پہلوؤں کو کمال ہونا چاہئے۔

پس اجتماعی زندگی کا ہدف تمام انسانوں کے دنیوی اور مادی منافع اور معنوی و اخروی منافع کو فراہم کرے، اور چونکہ تمام انسانوں کا یہ ہدف ہے لہذا تمام انسان اس زندگی میں حق رکھتے ہیں۔

اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا کہ انسان کی اجتماعی زندگی کا ہدف صرف مادی منفعتوں کا پورا ہونا نہیں ہے، اور قانون کا ہدف بھی صرف انیت کا برقرار ہونا نہیں ہے بلکہ انیت کے علاوہ دوسرے اہداف بھی ہیں، جن کو پورا ہونا چاہئے، لہذا انیت و آسائش اور مادی احتیاجات کا پورا ہونا اس نھائی کمال اور تقرب الہی تک پہنچنے کے لئے ایک مقدمہ ہے۔

بہر حال، اسلامی نظریہ کے اعتبار سے انسان کی خلقت کا ہدف یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام اطراف و جوانب میں تکامل و تقرب الی اللہ کے وسائل فراہم کرے اور اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو الہی اور اسلامی سانچے میں ڈھالے، چونکہ انسان کے مختلف پہلو ہیں، اس بنا پر تمام ہی پہلوؤں کی پیشرفت، انسان کی حقیقی پیشرفت و ترقی ہے، نہ کہ صرف مادی، اجتماعی اور ٹیکنیکی ترقیاں، لہذا مادی پہلوؤں کے ساتھ معنوی پہلو مل کر انسان کی حقیقت سنوارتے ہیں، پس اجتماعی زندگی کا ہدف انسان کی تمام پہلوؤں کی پیشرفت و ترقی ہے، اور وہ قانون سب سے بہت رہے کہ جس میں انسان کے تمام پہلوؤں کی ترقی کے لئے راہ ہموار ہو اور ان چیزوں کو مقدم کرے کہ جن کے ذریعہ سے نھائی ہدف یعنی قرب الہی تک پہنچا جاسکے۔

۵۔ قانون گزار کی ضروری صفات

اسلامی حکومت یہ نہیں کھ سکتی کہ ہماری ذمہ داری فقط معاشرہ کی امنیت کو پورا کرنا ہے، کیونکہ یہ تو ”ہابز“ کا نظریہ ہے کہ جو کھتا ہے کہ انسان بھیڑنے کے طرح ہیں، جو ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہیں کسی ایک طاقت کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کو کنٹرول کر سکے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنا اختیار کسی ایسے انسان یا گروہ کے ہاتھ میں دیدے جو ان کو کنٹرول کر سکے اور ان کے ظلم و ستم سے بچا سکے، پس یہ کہنا کہ حکومت کی ذمہ داری صرف لوگوں کی امنیت پورا کرنا اور عس و حرج سے روکنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، بے شک یہ نظریہ باطل ہے اور جانوروں کی اجتماعی زندگی کے لئے مناسب ہے، نہ کہ انسانی معاشرے کے افراد کے لئے جو اشرف المخلوقات اور بہت سی قابلیتوں کے مالک ہیں، بلکہ ان کا ہدف بہت بلند و بالا ہے۔

لہذا اسلامی حکومت کو وہ قوانین جاری کرنا چاہئے جن سے انسان کے تمام پہلو رشد و ترقی کر سکیں اور انسان کے تمام مصلح کو تمام پہلوؤں میں پورا کر سکیں، اور یہ سب اسلامی پرچم کے زیر سایہ عملی ہو سکتے ہیں؛ اور چونکہ ایسے قوانین کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے تمام پہلوؤں کا علم ہونا چاہئے۔ ہم ایسے افراد کو جانتے ہیں جو انسان کے بعض پہلو میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن عام لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جسے انسان کے تمام پہلوؤں کا علم ہو۔ اگر قدیم زمانہ میں ایسے فلاسفہ ہوا کرتے تھے جو اس طرح کا دعویٰ کرتے تھے۔

لیکن آج انسان کا جھل اور لاعلمی پہلے سے کھیں زیادہ واضح ہے۔ انسان کے پہلو اس حد تک مخفی ہیں کہ کوئی دانشمند یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں انسان کے تمام زاویوں پر احاطہ رکھتا ہوں اور انسان کی تمام ضرورتوں کو بتا سکتا ہوں، اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کبھی کبھی انسان کی ضرورتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، ممکن ہے کہ بعض مقامات پر معاشی ترقیاں، الہی و معنوی امور سے ٹکرائیں، البتہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ الہی احسن نظام نے انسانی تمام مصلح کو پورا کیا ہے، لیکن ممکن ہے کہ کسی معاشرہ میں کسی مقام پر انسانی مصلحتوں کے درمیان ٹکراؤ دکھائی دے۔

لہذا ضروری ہے کہ ان مصلح کی طبقہ بندی کی جائے اور بعض چیزوں کو مقدم کرنے کے قائل ہوں، تاکہ اگر دو مصلحتوں میں ٹکراؤ ہو تو ذمہ دار افراد کو معلوم ہو کہ کس کو مقدم کیا جائے؟ قانون گزار کا یہ بھی ایک وظیفہ ہے کہ ان امور کو مشخص کرے جو اولیت رکھتے ہیں یعنی قانون گزار کے اندر یہ صلاحیت ہونا چاہئے کہ وہ اولیات کو مشخص اور معین کر سکے یہاں آنے کے بعد انسان کی ناتوانی اور کمزوری مزید ظاہر ہو جاتی ہے، کیونکہ انسان کی اولیات کو پہچاننا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

بہر حال انسان کے تمام پہلوؤں پر احاطہ رکھنے کے ساتھ ساتھ، قانون گزار کے لئے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اپنے کو ذاتی اور رگروہی خواہشات سے خالی کرے، اور معاشرہ کے مصلح و منافع کو اپنے یا اپنے گروہ کے مصلح پر مقدم کرے اور یہ کام ہر ایک

کے بس کی بات نہیں ہے۔ صرف انسان متقی و پرہیزگار ہی اپنے و معاشرہ کے منافعوں کے ٹکراؤ کی صورت میں معاشرہ کے منافعوں کو مقدم کرے اور اپنے یا اپنے گروہ کی منافعوں سے چشم پوشی کر سکتا ہے اور آزادانہ طور پر معاشرہ کے منافعوں کو اپنے منافع پر ترجیح دے سکتا ہے، لیکن معاشرہ میں ایسے افراد کا ملنا مشکل ہے اور شاید تقریباً محال کی منزل میں ہو۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ قانون گزار کو تمام مصلحتوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی صلاحیت ہونا چاہئے اپنے منافع پر معاشرہ کے منافع کو مقدم کرے۔

یہی سے الہی قانون کی افضلیت بشری قانون پر مکمل طور پر واضح و روشن ہو جاتی ہے، کیونکہ خداوند عالم تمام لوگوں سے انسانی مصلحتوں کو بہت رجاتا ہے اور صرف انسان کی مصلحتوں کی رعایت کرتا ہے اور اس کو انسانی کردار کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تاکہ انسان کے اعمال سے خدا کی کوئی مصلحت اور اس کے لئے فائدہ ہو، جس کے نتیجہ میں مزاحمت پیدا ہو: خدا انسان کے کاموں سے کوئی نفع نہیں حاصل کرتا ہے تاکہ اس کا نفع دوسروں کے نفع سے ٹکرائے۔

یہ تمام چیزیں اس وقت ہیں کہ جب ہم اپنے منافع کو خدا کے حق ربوبیت کے علاوہ سمجھیں، لیکن اسلامی نظریہ کے مطابق ان تمام چیزوں سے بلند تر وہ بلند کمال ہے جس تک انسان کو پہنچنا ہے، ہم اسی بنیاد پر کہتے ہیں: بالفرض اگر انسانی زندگی کے مادی مصلح اور اجتماعی روابط یہاں تک کہ روحی و معنوی مصلح پورے ہو جائیں، پھر بھی ایسا معاشرہ نمونہ نہیں بن سکتا۔ ایسا انسان اور معاشرہ نہائی ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ نہائی کمال خدا کی قربت میں ہے، اور یہ قربت خدا کی عبادت و اطاعت اور بندگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اگر انسان صحت و سلامتی کے ساتھ ساتھ معاشرہ کا چین و سکون، اور دشمن کے مقابلہ میں دفاع اور عدالت سے ہمکنار ہو یعنی انسان تمام اجتماعی حقوق سے مالا مال ہو، لیکن اس زندگی میں خدا کی عبادت نہ کی جائے، تو ایسا انسان نہائی کمال تک نہیں پہنچا ہے اور خدا کی رضا و خوشنودی کا مستحق نہیں ہوا ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق، یہ تمام چیزیں انسان کے خدا سے رابطہ کا مقدمہ ہیں، انسان کا حقیقی کمال اسی خدا سے رابطہ میں ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کا حقیقی کمال خدا کے قرب میں ہے۔ خدا کا قرب ایک نعرہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت اور ایسا معنوی ارتباط ہے جو خدا اور انسان کے درمیان برقرار ہوتا ہے، اور انسان اپنی زندگی کے مراحل کو طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے یہاں تک اس بلند مقام تک پہنچتا ہے۔ اس بلند مقام کی پہچان ہر عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اور اس کو نہیں معلوم کہ انسان کے لئے کتنا عظیم مرتبہ ہے، تاکہ مادی و دنیوی خواہشات کے ساتھ ساتھ اس روحانی و معنوی کمال تک پہنچ جائے۔

اور یہ بات بھی یہاں سے واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند عالم کو ہماری عبادت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر انسان کو عبادت کے لئے کیوں پیدا کیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَخْلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۲)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“

جواب یہ ہے کہ انسان کا نھائی کمال عبادت کے علاوہ حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا خدا کی پہچان اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے تاکہ انسان اپنے حقیقی کمال تک پہنچ سکے۔ ان مقدمات کے پیش نظر اب ہم یہ کھہ سکتے ہیں کہ وہ قانون مناسب و مطلوب ہے جو معاشرہ کے سرگرم افراد کی مادی و معنوی احتیاجات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ، ناتوان و کمزور اپاہج لوگوں کی بھی احتیاجات پورا کرے جو کہ معاشرہ میں کچھ بھی خدمات انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ بھی حقوق رکھتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا یہ وظیفہ ہے کہ ان لوگوں کے حقوق کو بھی تائین کرے، اور فقراء و مساکین اور اپاہج لوگوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کیا جائے کیونکہ یہ بھی خدا کے بندے ہیں اور اس انسانی معاشرہ میں پیدا ہوئے ہیں اور جب تک زندہ ہیں ان کے حقوق کو دئے جائیں۔ لہذا معاشرہ میں وہ قوانین جاری ہوں ان لوگوں کے حقوق کو مد نظر رکھا جائے، اسی وجہ سے قرآن نے عدالت کے علاوہ احسان پر بھی توجہ دلائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾^(۳)

”بے شک خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے کا حکم کرتا ہے“

خداوند عالم کے احکامات صرف اخلاقی احکامات نہیں ہیں، بلکہ واجب احکام ہیں جن کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اگر صرف عدالت کی رعایت کرنا ضروری ہوتا تو پھر احسان کا اضافہ کرنا کیا ضروری تھا؛ پس جس طرح معاشرہ میں عدالت کا اجرا کرنا ضروری ہے، اسی طرح احسان کی رعایت بھی واجب ہے، یعنی صرف خدمات انجام دینے والے افراد ہی صاحب حقوق نہیں، بلکہ کچھ ایسے حقوق ہیں جن کو خداوند عالم نے ہر انسان کے لئے مقرر فرمائے ہیں، یہاں تک خداوند عالم نے ان افراد کے لئے بھی حقوق معین فرمائیں ہیں جو اس دنیا میں بدترین حالات میں زندگی گزار رہے ہیں مثلاً ہاتھ پیر آنکھ اور کان سے محروم ہیں لیکن جب تک وہ سانس لے رہے ہیں اور زندہ ہیں تو اسلامی حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ ان کے حقوق کی رعایت کریں۔ لہذا اس طرح کے قوانین پر حکومت اسلامی کو توجہ قرار دینا چاہئے، اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہماری ذمہ داری فقط اتنی ہی ہے جس کو مغربی دانشوروں جیسے ”ہابز“ یا ”روسو“ وغیرہ نے کھا ہے، کیونکہ یا تو ان لوگوں کی نظر میں انسانی بلند مراتب نہیں تھے یا انسان کو بھیڑیا صفت یا شہد کی مکھیوں کی طرح مانتے ہیں، لیکن اسلام کی نظر میں انسان کی عظمت (اگرچہ اجتماعی زندگی بھی رکھتے ہیں) حیوانوں سے کھیں زیادہ بلند ہے۔

پس قانون ایسا ہونا چاہئے جو انسان کی مادی اور معنوی ضرورتوں کو پورا کرے جو نھائی کمال تک پہنچنے کا مقدمہ ہوں، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ قانون کو انسان کی تمام مادی و معنوی مصلحتوں کی رعایت کرنا ضروری ہے تو پھر کیا انسان کو ہر طرح کی آزادی دی

جاسکتی ہے؟ انسان کو اگر اس بلند مقصد تک پہنچنا ہے تو پھر اس کے ارادہ کو محدود اور سسٹمیٹک ہونا چاہئے، انسان کو ایک خاص راستہ پر چلنا ہوگا تاکہ اس بلند مقصد تک پہنچ سکے۔ کیا انسان کسی بھی راستہ پر چل کر اس بلند ہدف تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے خدا کو نہیں پہچانا یا خدا کا انکار کیا یا اس سے اور اس کے ماننے والوں سے مقابلہ کیا اس انسانی کمال تک پہنچ سکتے ہیں؟ کیا انسان کے کمال تک پہنچنے کا راستہ عبادت نہیں ہے؟ تو پھر کس طرح وہ انسان جو خدا اور خدا پرستی سے مقابلہ کرتا آیا ہے انسانی حقیقی کمال تک پہنچ سکتا ہے؟ اگر اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ انسانی پیشرفت کے لئے تمام پہلوں خصوصاً معنوی پہلو کے لئے راستہ ہموار کرے تو پھر انسانی ارادوں کو محدود ہونا چاہئے اور اس طرح کے قوانین بنائے جائیں جو انسان کے لئے ان کمالات عالیہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ بنیں۔

۶۔ اسلامی اور لیبرلزم قوانین میں اختلاف

ہمارے گزشتہ مطالب کے پیش نظر کہ اسلامی قوانین اور انسان کے بنائے قوانین (خصوصاً لیبرلزم قوانین، جن کا ماننا یہ ہے کہ انسان کو حق معاشرہ کی خدمت کے عوض میں ملتا ہے) میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ہم اس بات کو چند نکات میں بیان کرتے ہیں۔

الف: لیبرل معاشرہ میں اپنی نظر کے مطابق، جو لوگ اپنی مشکلات کی وجہ سے معاشرہ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے ان کے لئے کسی بھی طرح کے حق کے قائل نہیں ہیں، لیکن اسلام ان کے لئے بھی حق کا قائل ہے، اور ظاہر ہے کہ ان کے حق کی رعایت کے لئے اس کے منابع ہونا ضروری ہیں کیونکہ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی ادارہ ہونا ضروری ہے، اور اس ادارہ کی تائین کے لئے لازم ہوتا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے ارادوں کو محدود کریں، یعنی معاشرہ کے مال کا کچھ حصہ ان لوگوں سے مخصوص کیا جائے، جبکہ دوسرے لوگ اس کو نہیں چاہیں گے، لہذا ان کی خواہشات کو لامحالہ محدود کیا جانا پڑے گا۔

ب: اجتماعی زندگی میں معاشرہ کے اندر ایسے حقوق کو پیش نظر رکھا جائے کہ اگر کسی موقع پر بعض افراد کے حقوق معاشرے کے حقوق سے ٹکرائیں تو معاشرے کے حقوق کو مقدم کی جائے، اور معاشرے کے حقوق اور افراد کے حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہونے کی صورت میں، معاشرے کے حقوق کو مقدم ہونا چاہئے، اور یہ کہنا کہ اگر معاشرہ کے حقوق اور فردی حقوق میں تعارض پیدا ہو جائے تو معاشرہ کے حقوق کو مقدم کیا جائے گا یا فردی حقوق کو، ہمیں اس بات کو مختلف نظریوں سے دیکھنا ہوگا کیونکہ اس بارے میں دو مختلف نظریہ پائے جاتے ہیں بعض لوگ انفرادی حقوق کو مقدم کرتے ہیں چنانچہ اس وقت مغربی دنیا میں جامعہ گرائی کے مقابلہ میں فرد گرائی زیادہ رائج ہے اگر جامعہ گرائی سوسیالیستی (Socialisti) نظریہ بھی قدرے پایا جاتا ہے جس کی طرف سے گاہے گاہے فرد گرائی (صرف اپنے فکر کرنا) والوں پر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال لیبرال (Liberal) نظریہ کے مقابلے میں اسلام معاشرہ کے حقوق کو لوگوں کے حقوق سے زیادہ مانتا ہے یعنی اگر معاشرہ اور افراد کے حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے خصوصاً اگر کو اہم ٹکراؤ ہو تو معاشرہ کے حقوق کو مقدم کیا جاتا ہے۔ لیکن لیبرال حکومتیں اس وجہ سے کہ مارکیٹ کا ریٹ نہ ٹوٹے اور مالداروں کا نقصان نہ ہو لاکھوں ٹن کھانے پینے کے سامان کو جلا دیتے ہیں یا دریا میں ڈال دیتے ہیں، لاکھوں لوگوں کا بھوک سے مرنا ان کو منظور ہے لیکن ان کا مادی نقصان نہ ہو، لیکن اسلام ہر گز اس طرح کی اجازت نہیں دیتا یعنی اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ایسے افراد کو روکا جائے اور ان کو محدود کیا جائے۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی آزادی بھی اس طرح بے لگام نہیں ہے بلکہ یہ آزادی بھی محدود ہونا چاہئے۔ پس جس طرح معاشرہ کے معذور و محروم افراد کی وجہ سے معاشرہ کا منافع محدود ہونا ضروری ہے اسی طرح معاشرہ کے کلی مصلحتوں کی خاطر افراد کے ارادوں کو محدود ہونا چاہئے تاکہ تمام معاشرے کے مصلح تائین ہو سکیں۔

ج: اسلامی معاشرہ میں کچھ ایسے بھی مسائل ہیں جو خود اپنی ذات سے متعلق ہیں لیکن چونکہ ان کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے لہذا اجتماعی مسائل حساب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے گھر میں تنہائی کے عالم میں جبکہ اس کو کوئی نہ دیکھ رہا ہو کسی گناہ کا مرتکب ہو تو بے شک اس کا یہ گناہ فردی ہے اور جو قوانین اس طرح کی چیزوں کو محدود کرتے ہیں ان کو ”اخلاقی قوانین“ کہتے ہیں (قطع نظر اس چیز سے کہ یہاں پر ”اخلاقی“ کہنا صحیح ہے یا نہیں)

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہائی میں کسی گناہ کا مرتکب ہو تو دوسروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور حکومت کو بھی مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے اس بات کو تقریباً تمام ہی سیاستدان حضرات قبول کرتے ہیں کیونکہ حکومت کا دائرہ معاشرہ تک محدود ہے نہ کہ شخص سے، لیکن یہاں اس بات پر اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح کا کارنامہ انجام دے جس کا تھوڑا بہت اثر دوسروں پر پہونچتا ہو یا کم سے کم یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو اسے دیکھ کر گناہ کرنے کا شوق ہوتا ہے تو کیا یہ کام اجتماعی شکل پیدا کرے گا یا نہیں؟

اگر کوئی شخص سڑک پر یا کوئی ایسی جگہ کہ دوسرے لوگ اس کو دیکھ رہے ہوں کوئی گناہ کرے، اور اس کو دیکھ کر گناہ کرنے پر جبرت پیدا کرتے ہیں اور اس گناہ کے کرنے کا رجحان پیدا ہو، تو اب اس کا یہ کام فردی حالت سے نکل کر اجتماعی شکل پیدا کر لیتا ہے؛ کیا ہمیں حق نہیں ہے کہ اس کام میں دخالت کریں اس وجہ سے کہ اس گناہ کا ضرر و نقصان خود اسی کو پہونچے گا؟!

اسلام تو اس چیز کی اجازت نہیں دیتا، اسی وجہ سے ظاہر بہ فسق (کھلے عام گناہ کرنا) ایک اجتماعی مسئلہ حساب ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص دوسروں کے سامنے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ گناہ حقوقی جرم (اخلاقی خلاف ورزی کے مقابلہ میں) ہے اور حکومت اس میں دخالت کر سکتی ہے۔ وہ قانون جو اس طرح کے گناہوں سے منع کرتا حکومتی قانون کھا جاتا ہے جس کے جاری کرنے کی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے۔

لہذا اگر تنہائی میں گناہ انجام پائے اور کسی کو پتہ بھی نہ لگے تو اس سے حکومت کا کوئی سروکار نہیں ہے اور کوئی عدالت ایسی نہیں کہ جو اس کو محکوم کرے، لیکن اگر گناہ اجتماعی صورت پیدا کر لے جس سے دوسروں میں بھی گناہ کا رجحان پیدا ہو تو اس وقت حقوقی اور اجتماعی پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے گناہوں سے روکے۔

د: گناہ اور معاشرے کو ضرر پہونچانا صرف مادی چیزوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ حیثیت اور آبرو کو ضرر پہونچانا بھی گناہ و جرم حساب ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرہ کو لے لیجئے کسی کی بے حرمتی اور توہین کرنا چاہے فیزیکی اور ظاہری طور پر نہ ہو (مثلاً کسی کو توہین آمیز اور مذاق بنانے والی باتیں کھنا) گناہ سمجھا جاتا ہے، اور چونکہ دوسرے سے متعلق ہوتا ہے تو حکومت کو اس سلسلہ میں سزا دینے کا حق حاصل ہے، اسلامی معاشرہ میں دینی مقدسات کی توہین کرنا مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی خلاف ورزی ہے، اور اگر کوئی دین کی توہین کرے تو اس کی سزا بھی زیادہ ہونا چاہئے، کیونکہ اسلامی معاشرہ میں دینی مقدسات سے جڑ کر کوئی چیز نہیں ہے، لہذا دینی مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے۔

چنانچہ اس کے لئے سزا بھی سب سے بڑی ہونا چاہئے، اسی بنا پر اگر کوئی مرتد ہو جائے یا اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو اس سے کوئی معاملہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر کوئی پیغمبر اکرم یا دوسری مقدسات کی توہین کرے تو اسلام کی نظر میں اس کی سزا پھانسی ہے؟ کیونکہ اس نے سب سے بڑا جرم کیا ہے کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک اس سے مقدس ترین کوئی چیز نہیں ہے اور ان مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے لہذا اس کی سزا بھی سب سے بڑی یعنی پھانسی ہے اور یہ ایک بنیادی اختلاف ہے کہ جو اسلام اور لیبرل نظریہ میں پایا جاتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے آپ کو گالی دی ہے تو آپ بھی گالی دیدیں، یہ کوئی جرم نہیں ہے؛ کیونکہ زبان چلانا آزاد ہے! مثلاً اگر کسی نے آپ کے پیغمبر کو برا کھا ہے تو آپ ان کے پیغمبر کو برا کھ دیں۔ لیکن اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے، اسلام میں اسلامی مقدسات کی توہین کرنا سب سے بڑا جرم ہے اور صرف حقوقی پہلو نہیں ہے بلکہ جزائی اور سزائی پہلو رکھتا ہے، لہذا اس کے لئے سزا بھی اتنی ہی سخت رکھی گئی ہے اس طرح کی توہین کسی ایک فرد کی توہین نہیں ہے بلکہ پورے اسلامی معاشرہ کی توہین ہے۔ حقوقی مسائل ایک کے رابطہ سے مربوط ہے: اگر کسی نے کسی کو طمانچہ مارا ہے تو اسے بھی بدلے کا حق ہے، وہ اس کی شکایت بھی کر سکتا ہے اور ممکن ہے اس کو جیل بھیج دیا جائے یا اس کو مالی جرمانہ دینا پڑے؛ لیکن اگر وہ شخص اس کو معاف کر دے تو پھر قضیہ تمام ہو جاتا ہے اور عدالت بھی اس کو کچھ نہیں کہے گی، لیکن سزائی احکام میں اس طرح نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر شکایت کرنے والا بھی اس کو معاف کر دے تو بھی مدعی العموم (جو لوگ معاشرہ کے حقوق کے دفاع کرنے والے ہیں) حق رکھتے ہیں کہ اس کی پیروی کرے، کیونکہ یہ بے احترامی پورے معاشرے کی بے احترامی ہے، لہذا مدعی العموم اس کی شکایت کر سکتے ہیں۔

اسلامی مقدسات کی توہین کسی ایک فرد کی توہین نہیں ہے کہ کوئی خاص فرد اس کی شکایت کرے اور اگر شکایت کرنے والے نے معاف کر دیا تو مسئلہ تمام ہو جائے گا، پھر عدالت بھی اس کی تعقیب نہیں کرے گی۔ لیکن اگر کوئی اخبار یا تقریر میں اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو ایسا شخص اسلام کی نظر میں محکوم ہے اور اسلامی قاضی کو اس کی تعقیب کرنا ہوگی؛ کیونکہ اس نے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے حقوق کو پامال کیا ہے اور شخصی و فردی مسئلہ نہیں ہے بلکہ کیفری و سزائی مسئلہ ہے کوئی اس جرم کو معاف نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ ایک ایسا حق ہے کہ جو تمام مسلمانوں سے متعلق ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ خدا سے مربوط ہے، یہ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں مسلمان دانشور طبقہ خصوصاً ہمارے یونیورسٹی کے طالب علم توجہ رکھیں اور خیال نہ کریں کہ اسلام کے سیاسی و حقوقی مسائل مغربی نظریہ کی طرح ہیں اور صرف اس دنیا کے مادی و دنیوی مسائل سے مربوط ہیں۔ اسلامی نظریہ کے مطابق معاشرہ کے حقوق فردی حقوق پر مقدم ہیں، اور صرف خدمت کے عوض کسی کو حق نہیں ملتا۔

بلکہ ہر وہ شخص جو اسلامی معاشرہ میں زندگی گزارتا ہے حق رکھتا ہے اور یہ حق کسی خاص گروہ سے مربوط نہیں ہے؛ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ معاشرہ بھی کچھ حقوق رکھتا ہے اور اس کے حقوق دوسرے افراد کے حقوق پر مقدم ہیں اور یہ حقوق صرف مادی نہیں ہیں بلکہ ان میں معنوی حقوق بھی شامل ہیں، اور صرف دنیاوی منافع سے مربوط نہیں ہیں بلکہ اخروی و معنوی مصلح سے بھی مربوط ہیں۔

اب تک جو کچھ ہم نے عرض کیا اس سے اسلامی قوانین کا دوسرے قوانین سے امتیاز واضح ہو جاتا ہے، اور سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں اسلامی معاشرہ میں انسانوں کے فردی ارادوں کو محدود کرنا ضروری ہے اور سیکولر، لائک اور لیبرال نظریات کی طرح نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز ارادوں کو محدود کر سکتی ہے وہ مادی اور فردی منافع ہیں۔ لیکن اسلام میں معنوی و اخروی منافع بھی ہیں، اور ان مصلحتوں میں سے ہر ایک خاص محدودیت چاہتی ہے جس کا لازمہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں فردی آزادی، لائک و لیبرال معاشروں سے کمتر پائی جاتی ہے، اور اسی چیز کا اسلامی حکومت مذہبی اعتقاد کی بنا پر تقاضا کرتی ہے اور ہم کمال وضاحت اور شجاعت کے ساتھ اس کا دفاع کرتے ہیں۔

حوالے

سورہ نحل آیت ۹۰

سورہ ذاریات آیت ۵۶

سورہ نحل آیت ۹۰

بیسواں جلسہ قانون و حکومت کی ایک نئی تصویر

۱۔ معاشرہ پر ایک طبقاتی اور احزابی نظر

گذشتہ جلسات میں ہماری بحث اسلامی حکومت اور سیاست میں قانون گذاری کے بارے میں تھی، اس وقت ہم مذہب اسلام کی روشنی میں سیاسی اور حکومتی احزاب کی معاشرہ میں کیا اہمیت ہے اس پر بحث کریں گے، اس کی وضاحت کے لئے ہم ایک مثال اور تشبیہ عرض کریں گے تاکہ اصل موضوع کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

قدیم زمانہ میں دانشور حضرات معاشرہ کو انسانی پیکر سے تشبیہ دے کر کھا کھاتے ہیں: جس طرح انسان کا بدن مختلف اعضاء و جوارح سے مل کر بنتا ہے، اسی طرح معاشرہ بھی مختلف ذات پات، طبقات اور احزاب سے مل کر بنتا ہے اور ان میں سے ہر ایک بذات خود چند اقسام پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر ایک طبقہ اور حزب چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان کے اعضاء کی طرح حکم رکھتا ہے۔ البتہ بعض اوقات اس تشبیہ میں افراط و تفریط ہوتی ہے، جس سے درست استفادہ نہیں ہو پایا ہے۔

معمولاً علمی و عملی سرگرمیوں میں افراط و تفریط ہوتی ہی رہتی ہے، چنانچہ صحیح راستہ کی معرفت حاصل کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے، ایسا ہی بعض افراد نے مذکورہ تشبیہ کے بارے میں کیا ہے: چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان کا بدن مختلف اعضاء سے مل کر بنتا ہے، اور یہ اعضاء طبعی طور پر آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک خاص ذمہ داری رکھتا ہے، اسی طرح معاشرہ کے اعضاء بھی مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک خاص کام کے لئے ہوتا ہے اور اس کو وہی کام کرنا ہوتا ہے، اور اس کو اپنے کام سے آگے قدم نہیں بڑھانا چاہئے۔

مثال کے طور پر، ہم جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اعضاء صرف ایک "سلول" Cellule (عنصر) سے بنتے ہیں، اور پھر اسی سلول سے ہمارے بدن کے تمام اعضاء بنتے ہیں، بعض سلول بہت لطیف و ظریف ہوتے ہیں کہ جن سے آنکھ یا مغز و دماغ تشکیل پاتے ہیں، اور بعض سلول مضبوط و محکم ہوتے ہیں جن سے ہڈی بنتی ہے، اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آنکھ کا سلول ہڈی کی جگہ یا ہڈی کا سلول آنکھ کے سلول کی جگہ استعمال کیا جائے، یعنی آنکھ سے کان کا کام لیا جائے اور ہڈی سے آنکھ کا کام لیا جائے، جبکہ یہ تمام سلول ایک ہی سلول سے بنے ہوئے ہیں، لیکن آپس میں اتنا اختلاف رکھتے ہیں کہ صرف اپنے معین شدہ کام ہی کو انجام دے سکتے ہیں، لہذا ان کو ایک دوسرے کی جگہ نہیں رکھا جاسکتا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ معاشرہ کے افراد بھی طبعی طور پر اسی طرح مختلف طبائع کے اوپر خلق ہوئے ہیں ان کے مختلف طبقات ہیں، ہر ایک کے خاص کام معین ہیں اور صرف اپنا ہی کام انجام دے سکتے ہیں، قدیم زمانہ میں فلاسفہ حضرات معتقد تھے کہ معاشرہ کی مختلف قویں اور طبقات اپنے لئے ایک معین حد رکھتی ہیں، اور ہر ایک کا کام میں الگ الگ ہوتا ہے (مثلاً حبشی (سیاہ فام قوم) کی ذات سخت اور محنتی کام کے لئے پیدا کی گئی ہے اور سرخ یا زرد رنگ والی قوم فکری کاموں کے لئے پیدا ہوئی ہے) یہ لوگ اسی تشبیہ سے اس چیز کا استفادہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کا ماننا یہ تھا کہ رنگ کا اختلاف، قوموں کا اختلاف اور انسان کے خون کے اختلاف ہونے کا سبب بنتا ہے جس کی وجہ سے انسان کی ہر قوم الگ الگ کاموں کے لئے مخصوص ہے، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نظریہ افراط (زیادہ روی) ہے، علم و فلسفہ اور دین اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں۔

۲۔ معاشرہ کے طبقاتی اور احزابی نظام کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلامی نظریہ کے مطابق، تمام انسان اپنے بدن اور روح کے اعتبار سے معاشرہ میں مختلف کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ البتہ انسانوں کی قابلیت و صلاحیت مختلف ہوتی ہے اور برابر نہیں ہوتی، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کالے اور گوروں کے درمیان ایک ایسا فرق ہو جو ایک دوسرے کے کاموں کو انجام نہ دے سکیں، کالے گوروں کا کام نہ کر سکیں یا گورے کالوں کا کام نہ کر سکیں، اسلامی نظریہ کے مطابق، اگرچہ انسانی بدن اور معاشرہ میں شباهت پائی جاتی ہے، جس سے گروہوں اور افراد کی وضعیت کو معین کرنے کے لئے دو نتیجہ نکالے جاسکتے ہیں، لیکن معاشرہ کی ان اعضاء بدن سے تشبیہ دینا جو طبعی طور پر ہر ایک عضو سے متفاوت اور مختلف ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ معاشرہ کے افراد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ صحیح نہیں ہے، اس زمانے کے بعض جامعہ شناس افراد بھی بالکل اسی طرح کہتے ہیں کہ معاشرہ بھی ایک طرح کا ”ارگانیزم“ (Organisme) ہے اور معاشرہ کے مختلف گروہ قوم ذات و پات انسان کے جسم کے اعضاء و جوارح کی مانند ہیں اور ان کا رابطہ اعضاء بدن کے رابطہ کی طرح ہے۔ بھی رابطہ ایک دوسرے کو آپس میں متصل کرتا ہے، ہماری نظریں یہ نظریہ بھی افراطی ہے۔ لیکن کیا معاشرہ کے افراد کا آپس رابطہ بالکل انسانی بدن کے اعضاء کے رابطہ کی طرح ہے؟، نہیں اس طرح کا کوئی حقیقی رابطہ اعضاء بدن کے سلول اور معاشرہ کے افراد کے درمیان نہیں ہے؟

معاشرہ کے افراد اس طرح کا ارتباط رکھتے ہیں اس چیز کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے؛ ایسا رابطہ مثلاً آنکھ کے سلول کا ایسا باہمی رابطہ جو ایک عضو کو تشکیل دیتے ہیں یہ ایک مخصوص رابطہ ہے لیکن بھی دیگر اعضاء و جوارح کی مدد سے ایک انسان کے جسم کو تشکیل دیتے ہیں۔۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسان کے بدن اور معاشرہ میں ایسی شباهت پائی جاتی ہے جس سے انسان کی اجتماعی موقعیت کی پہچان ہو سکتی ہے، مرحوم سعدی نے اپنے مشہور معروف اشعار میں اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بنی آدم اعضاء یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک گوہر اند

چو عضوی بہ درد آورد روزگار

دگر عضوہا را نماند قرار ”تمام انسان ایک بدن کی اعضاء کی طرح ہیں کیونکہ ان کی خلقت ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے“

”مثلاً اگر بدن کے کسی ایک حصہ کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء بھی بے قرار ہو جاتے ہیں“

بے شک یہ تشبیہ معاشرہ کے افراد کے درمیان ایک محبت و ہمکاری کو ثابت کرتی ہے، انسان میں محبت و عطوفت کا احساس ہوتا ہے تاکہ وہ کوشش کرے کہ ایک دوسرے سے اس کا رابطہ ہمدردی والا ہو، اس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے سے محروم نہ رہیں، یہ ایک معقول تشبیہ ہے کہ جس سے بہت سے استفادہ کئے جاسکتے ہیں، اور یہ تشبیہ حضرت رسول خدا او را امام جعفر صادق علیہ السلام کی احادیث سے کسب کی گئی ہے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”الْمُؤْمِنُونَ فِي تَبَارِهِمْ وَتَزَاحُمِهِمْ وَتَعَاظِفِهِمْ كَمِثْلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى تَدَاعَى لَهُ سَائِرُهُ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَى“^(۱)

”مومنین ایک دوسرے کے ساتھ محبت و پیار اور ہمدردی سے اس بدن کی طرح پیش آئیں کہ جب ان میں سے کسی عضو کو تکلیف پہونچے تو دوسرے اعضاء بھی بے خوابی اور بخار وغیرہ میں اس کی ہمراہی کرتے ہیں“

البتہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام علیہ السلام نے اسلامی معاشرہ کو ایک پیکر کی طرح تعارف کرایا، اور سعدی نے اس کو وسعت دی، اور انسانی معاشرہ کو ایک پیکر کی طرح نقشہ کشی کی ہے۔

البتہ توجہ رہے کہ اس تشبیہ کا کام یہ ہے کہ وہ جہت جو دو موجود میں مشترک اور ایک میں زیادہ اور مشہور اور دوسرے میں کچھ کم ہوتی ہے، اس کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیتی ہے، اور چونکہ یہ خاص جہت دوسرے موجود میں کافی مقدار میں شناختہ شدہ نہیں ہے، لہذا تشبیہ کی وجہ سے اس میں بھی پہچان لی جائے، اسی بنا پر ”مشبہ بہ“ کے تمام خصوصیات اور صفات ”مشبہ“ میں نہیں لئے جاسکتے، مثلاً اگر کسی بھادر انسان کو شیر کھا جائے، تو اس سے اس کی بھادری کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اگر شیر کی گردن پر مخصوص بال ہوتے ہیں تو یہ بھی بال رکھتا ہو، یا یہ کہ اگر شیر ہاتھ پیر سے چلتا ہے تو یہ بھی اسی طرح چلتا ہو!

معاشرہ اور انسانی بدن میں گزشتہ تشبیہ کے علاوہ اور بھی تشبیہیں دی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چونکہ انسان کے بدن میں مختلف اقسام کے سسٹم ہیں، جو ایک دوسرے سے ہم فکری اور ہم کاری رکھتے ہیں، جو انسانی سسٹم کی حیات اور اس کے رشد میں موثر ہوتے ہیں، اسی طرح معاشرہ بھی مختلف شعبے اور مختلف مرکز رکھتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ میں زندگی کرنا آسان ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر انسان کے بدن میں ایک سسٹم ہوتا ہے جس کا کام خون کو تمام جگہوں پر پہنچانا ہے اور اس کا مرکز دل میں ہوتا ہے۔ دل اس خون کو جو معدہ، جگر اور گوارشی مشین کی ہم اہنگی سے بنتا ہے چھوٹی بڑی رگوں کے ذریعہ تمام سلولوں تک پہنچاتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کی حیات رواں دواں رہتی ہے۔

خون کو تمام سلول میں پہنچانے والی مشین خود کئی چیزوں سے مل کر بنتی ہے مثلاً دل کا کام خون کو پمپ کرنا ہوتا ہے اور دوسری رگیں خون کو سارے بدن میں میں پہنچاتی ہیں، اسی طرح دوسری مشین خون پھیلانے والی مشین سے وابستہ ہیں جیسے خون کے لئے اکیسجن بنانا کیونکہ خون میں اکیسجن ہونا چاہئے تاکہ بدن کے سلول زندہ رہیں، اور اس وجہ سے پھیپھڑے اور سانس لینے والی مشین بدن کے لئے اکیسجن بناتی ہیں، اور یہ اکیسجن خون کے ساتھ تمام بدن میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح غذا خون کے ساتھ تمام بدن میں پھیلتی ہے اور یہ غذائیت گوارشی مشین سے بنتی ہے، پس یہ تین مشین گردش خون، دستگاه تنفس اور دستگاه گوارش آپس میں مل کر کام کرتی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی حیات ممکن ہوتی ہے، ان کے علاوہ بدن میں اور دوسری مشینیں بھی ہوتی ہیں جن کا کام مختلف مشینوں پر نظارت اور ان کی ہدایت کرنا ہوتا ہے، مثلاً بدن کے مختلف غدے اپنی اپنی مصروفیات میں لگے ہوتے ہیں اور اعصاب (رگیں) دماغ کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں، جن کی وجہ سے دوسرے اعضاء اپنا اپنا کام کرتے ہیں منجملہ ان کے معدہ اور دوسرے اعضاء، اعصابی مشین کے ذریعہ فعالیت کرتے ہیں۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انسان کی زندگی کے لئے بدن کے مختلف سسٹم ایک ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتے ہیں، اور ایک دوسرے سے ہم اہنگ ہو کر عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے مختلف مرکز اور شعبہ جات کو انسان کے مختلف سسٹم سے تشبیہ کریں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک مشابہ نمونہ کی عکاسی کریں:

مثلاً جس وقت ہم انسان کے معدہ اور تمام بدن تک غذائیت پہنچانے والی مشین کو دیکھتے ہیں، یعنی بدن میں غذا کو ہضم کرنے اور اس کو مختلف اعضاء تک پہنچانے والی مشین کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد معاشرہ پر نظر ڈالتے ہیں، تو معاشی معاملات میں ان جیسے کام کا مشاہدہ کرتے ہیں، معاشی شعبہ جات کا خصوصی کام کھانے پینے کی چیزوں کو پیدا کرے، اور دوسرے شعبوں کے ذریعہ ان کو لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ جس طرح خون بدن میں بنتا ہے اور دل اور رگوں کے ذریعہ دوسرے اعضاء تک پہنچتا ہے۔

اگر خونی مشین میں کچھ خرابی ہو جائے مثلاً کسی رگ کے بند ہونے سے خون کی حرکت بند ہو جائے، تو اس صورت میں انسان بیمار ہو جاتا ہے، اور جس عضو تک غذائیت نہیں پہنچتی، وہ بے کار ہو جاتا ہے، اور ممکن ہے بعض اوقات اس حصہ کو بدن سے

کاٹنا بھی پڑے، اور ممکن ہے کسی سسٹم کی خرابی کی وجہ سے انسان مر جائے۔ لہذا انسان کی تندرستی اور زندگی کیلئے ضروری ہے کہ خون آسانی کے ساتھ تمام رگوں میں حرکت کرتا رہے، اسی طرح معاشرہ میں بھی تمام ضروری سامان پہنچتا رہے، اور اگر یہ ضروری سامان کسی ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور لوگوں تک نہ پہنچایا جائے، اگر معاشی نظام (کہ جو کاشتکار اور دوسرے اداروں پر مشتمل ہوتا ہے) میں کچھ خرابی ہو جائے اور لوگوں تک کھانے پینے کا ضروری سامان نہ پہنچ پائے تو پھر یہ معاشرہ خواہ ناخواہ بیمار ہو جائے گا، لہذا یہ تشبیہ صحیح اور بجا ہے کہ جس میں معاشی شعبہ کی مثال دستگاہ گوارشی خون سے دی جاتی ہے۔

اسی طرح حکومت کی اعصابی مشین سے تشبیہ کی جاسکتی ہے کہ جس کا کام بدن کو حکم دینا ہے، اور یہ اعصاب کے دو حصوں (حسی اور حرکتی) سے تشکیل ہوتی ہے۔ لہذا حکومت کو اعصابی سسٹم کے مثل قرار دیا گیا ہے، معاشرہ بھی بدن کی طرح دماغ کی ضرورت رکھتا ہے تاکہ اس کو حکم دے سکے اور اسی طرح اس کے حکم کو معاشرہ کے اعضاء میں جاری کرنے کے لئے کچھ مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ حرکت کرتے رہیں۔ اسی بنیاد پر حکومت کے بھی دو بنیادی حصے ہوتے ہیں:

۱۔ قانون گذاری حصہ جو معاشرہ کی منفعتوں کی تشخیص اور ان کی فراہمی کے راستوں کو معین کرتا ہے۔

۲۔ ان قوانین کو جاری کرنے والا حصہ جو ان احکامات کو معاشرہ میں اجراء کرتا ہے۔

ہمارے حسی اعضاء شناخت کی راہ فراہم کرتے ہیں اور حرکتی اعضاء بدن میں احکام جاری کرنے کی راہ فراہم کرتے ہیں، جس کے مقدمات کو حسی اعضاء فراہم کرتے ہیں اور دماغ سے فکر و سوچ کا کام لیا جاتا ہے، اگرچہ انسان کی روح دماغ کے وسیلہ سے سوچتی ہے، ہمارا ذہن فکر و سوچ کا کام کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے اعضاء ان کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ نفس انسانی میں ایک قدرت علم ہے جس کا کام علم و معرفت کی تحصیل ہے اور دوسری قوت کا کام حرکت کرنا ہے، اور یہ دونوں دماغ کے تحت کام کرتے ہیں۔ یہ سسٹم بدن کے اعضاء پر نظر رکھتا ہے اور ضروری علم کو حاصل کرتا ہے اور ضروری احکامات کا حکم دیتا ہے اور دوسرے اعضاء کے ذریعہ وہ کام ہوتے ہیں، اس سسٹم کو دماغی اور اعصابی سسٹم کا نام دیا جاتا ہے، اور اس سسٹم کی وجہ سے معاشرہ میں حکومت کی اہمیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔

۳۔ معاشرہ میں طبقاتی نظام کی روشنی میں حکومت کی اہمیت

جس وقت ہم اپنے بدن کے اعضاء اور ان کی ہم آہنگ اور منظم کارکردگی کو ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ہم ان اعضاء کے بنانے اور ان کی منظم کارکردگی میں بالکل دخالت نہیں رکھتے، علمی اصطلاحی کے مطابق، طبیعت کا کام ان کو منظم طور پر چلانا ہے۔ لیکن دینی اصطلاح کے مطابق ہم کہیں گے کہ یہ خداوند عالم کی ذات کا کرشمہ ہے کہ ان میں اتنی

صلاحیت و استعداد اور قدرت عطا کی ہے، یہ اسی کا کمال ہے کہ جس سے انسانی اعضاء میں اتنی عظمت و پیچیدگی اور ظرافت پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ ہماری روح اس سے کھیں زیادہ با عظمت اور پیچیدہ تر ہے۔

جس خداوند عالم نے ہم کو بدن اور اعضاء عنایت کئے ہیں تو پھر ہم کو ان سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنے کی معرفت ہونا چاہئے اور ہم کو اپنے اعضاء سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے کہ ہماری عمر طولانی اور صحت و سلامتی اور خوشی کے ساتھ ساتھ بسر ہو؛ ایسا نہ ہو کہ ہم جس طرح چاہیں ان سے کام لینا شروع کر دیں، اگر ہم جو ہمارے ہاتھ لگا کھالیا، جو ملاپی لیا، جس کام کی ہوس کی اس میں مشغول ہو گئے، نامناسب غذا کھائی یا خدا نخواستہ نشیلی چیزوں سے پرہیز نہ کیا، تو کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہمارا بدن صحیح و سالم رہ پائے گا، اور ہماری عمر طولانی اور صحت و سلامتی کے ساتھ گزر پائے گی؟

ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بے شک صفائی کی رعایت کے بغیر ہماری عمر طولانی اور صحت و سلامتی کے ساتھ نہیں ہو پائے گی۔ یعنی ہمیں چاہئے کہ دلخواہ آزادی کو محدود کریں اور اپنی مرضی کے مطابق ہر چیز نہ کھائیں، غذا کی کیفیت اور اس کی مقدار پر بھی توجہ رکھیں، اسی طرح غذا کی قسم اور اس کے اوقات کی بھی رعایت کریں، کیونکہ اگر ان چیزوں کی رعایت نہیں کریں گے، مثلاً خراب شدہ کھانے کو کھائیں گے تو بیمار ضرور ہو جائیں گے، اور ہو سکتا ہے کہ ہماری جان بھی چلی جائے۔

صفائی اور ڈاکٹری کے قوانین واقعاً طبعی ہیں جن کی ہمارے بدن کو ضرورت پڑتی ہے اور یہ قوانین دانشمندوں کی مسلسل کوششوں کے نتائج میں بنائے جاتے ہیں اور انسان کی زندگی صحیح و سالم طریقہ سے گزرنے کیلئے دوسروں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ بدن کے لئے ان قوانین کی رعایت کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کے پیش نظر اگر کوئی ڈاکٹر کھے کہ فلاں غذا کو نہ کھاؤ، نشیلی چیزوں کا استعمال نہ کرو، کیونکہ تمہارا ذہنی توازن ختم ہو جائے گا، اور تمہارے معدہ یا جگر یا کمرے کے لئے نقصان دہ ہے تو ہمارا کیا فرض ہے؟ کیا اس کا شکریہ نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ اس نے ہماری راہنمائی کی اور ہمارے لئے سلامتی کی راہ بتائی، یا اس پر اعتراض کریں کہ آپ سے کیا مطلب ہم کچھ بھی کھائیں؟! جس نے ہماری سلامتی کا راستہ بتایا گویا اس نے بہت بڑی خدمت کی، لہذا ہمیں اس کے ہاتھوں کے بوسہ لینا چاہئے۔

جس وقت ہم بیمار ہو جاتے ہیں، بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس جانے کے لئے کئی کئی دن پہلے وقت لے تے ہیں اور بڑی منت و سماجت سے کہتے ہیں کہ ہمارا معائنہ کر لیجئے، اور اس کے بعد ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ کی دوائی کی تلاش میں شہر کے چکر لگاتے ہیں تاکہ اس کو کھائیں، اور ٹھیک ہو جائیں، ہم ان تمام زحمتموں کو صحت و سلامتی اور تندرستی کے لئے برداشت کرتے ہیں، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری عمر صحت و سلامتی کے ساتھ بسر ہو، لہذا اس مقصد کے تحت ڈاکٹری قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اس طرح ہماری آزادی محدود ہو جاتی ہے اور جو بھی مرضی ہوتی ہے اس پر عمل نہیں کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان قوانین پر عمل کرنا ہماری صحت و سلامتی کا باعث ہے، نہ کہ ہماری خوشی میں رکاوٹ، ہمیں چاہئے کہ ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے، جنہوں نے ہمیں صحت و سلامتی کا راستہ بتایا، کیا دنیا کا کوئی عقلمند انسان ڈاکٹری قوانین کو فردی زندگی میں دخالت کرنا کہتا ہے، یا اس کو معاشرہ کی بہت رین خدمت کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے؟

ہم نے اب تک جو کچھ بیان کیا وہ انسان کی ذاتی اور فردی زندگی سے متعلق تھا، معاشرہ کے سلسلہ میں بھی بالکل اسی طرح ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ میں زندگی کے معنی کو نہیں سمجھ سکا اور نہیں چاہتا کہ زندہ رہوں، اور میرے زندہ رہنے اور مرجانے میں کوئی فرق نہیں ہے! تو ظاہر ہے ایسے شخص کو کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ اور اگر وہ ان قوانین کی رعایت کرنا پسند نہ کرے تو کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے کیونکہ ہر چیز کے اسباب ہوتے ہیں اور انسان طبعی کاموں میں کوئی اثر نہیں رکھتا، اور اس کا نتیجہ یا بیماری ہوگا یا موت۔ اگر کوئی انسان اپنی زندگی میں ہدف نہ رکھتا ہو، اور جو چاہے کھائے تو اس کو اپنی زندگی کو حادثہ کی نذر کرنا ہوگا، کیونکہ خود اس کے کاموں کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہوگا اور آخر کار موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔

لیکن اگر کوئی اپنی زندگی کا ہدف رکھتا ہو اور طولانی عمر اور سلامتی چاہتا ہو اور اس سلامتی سے ترقی خصوصاً معنوی ترقی چاہتا ہو تو وہ ڈاکٹری قوانین سے بے توجہی نہیں کر سکتا، یعنی ڈاکٹروں اور ماہر افراد کے بتائے ہوئے قوانین کو لفظ بلفظ عمل کر کے اپنی آزادی کو محدود کر لے۔

اگر معاشرہ کو بھی بے ہدف افراد کی طرح فرض کر لیا جائے کہ جن کے نزدیک زندگی و موت برابر ہوتی ہے، نہ اپنا بقا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے لئے شرف چاہتے ہیں، نہ ہی عزت چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنا استقلال اور نہ ہی اپنی شخصیت اور عزت چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے لئے آخرت و معنویت چاہتے ہیں، مسلماً ایسا معاشرہ جو چاہے کرے بالکل آزاد ہے اس کے لئے کسی بھی قانون کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن ایسے شخص کے لئے زندگی و موت برابر ہے۔

انسان کو صرف اس وقت کسی قانون و مقررات کی ضرورت نہیں ہوتی جب موت و زندگی اس کی نظر میں مساوی ہو، یہاں تک کہ اگر موت کو بھی نہیں چاہتا اور زندہ یا مرنا اس کے لئے کوئی فرق نہیں رکھتا، تو اس کو کسی بھی قانون کی ضرورت نہیں ہے ورنہ اگر موت بھی چاہے تو اس کے لئے بھی خاص قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ کن کاموں سے موت آسکتی ہے، لہذا کوئی بھی با مقصد کام بغیر کسی قانون کے ممکن نہیں ہے اور مطلق آزادی کے ساتھ کسی بھی مقصد تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اگر کوئی ہدف ہے تو اس کے لئے محدودیت کا قائل ہونا پڑے گا، اور ہر کام کے مقدمات اس کے قوانین و ضوابط کے تحت ہونا چاہئے، چاہے اس کا ہدف موت ہی کیوں نہ ہو۔

اگر معاشرہ کچھ ہدف رکھتا ہے تو اس کے لئے قانون کی رعایت کرنا ضروری ہے، یعنی اپنی آزادی کو کم کر کے اپنی بعض خواہشات سے صرف نظر کرے۔ اور جو چاہے کرے تو پھر ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، ہاں اگر اس کا کوئی ہدف نہ ہو، تو پھر اسے

کسی قانون کی ضرورت نہیں ہے، ایسے معاشرہ کی مثال اسی شخص کہ جس کا کوئی ہدف نہیں ہے اور کچھ ہی دنوں میں موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے، اس بنا پر، اگر معاشرہ کو دوام اور ترقی و پیشرفت کرنا ہو اور ہمیشگی سعادت و عزت درکار ہو تو پھر اس کو دقیق قوانین کی ضرورت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرہ کے لئے کس طرح قوانین بنائے جائیں؟ کون بنائے؟ کیا یہ قوانین ایک طرح کے واقعی امور ہیں جن کو کشف ہونا چاہئے، یا صرف اعتباری امور ہیں کہ جن کو بنایا جائے؟ یہ مسئلہ فلسفہ حکومت میں بہت اہم ہے۔

ہم انسان کی فردی زندگی میں دانشمند حضرات کے کشف کئے ہوئے کچھ قوانین کا مشاہدہ کرتے ہیں، یعنی فلاں مکروب فلاں بیماری کا سبب بنتا ہے یہ اس واقعی رابطہ کی وجہ کہ جو حقیقی علت و معلول کے درمیان پایا جاتا ہے اور دانشمند حضرات اس کو اپنے تجربوں سے کشف کرتے ہیں اور اس کو ڈاکٹری قانون کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ: فلاں بیماری سے بچنے کے لئے فلاں مکروب سے پرہیز کرنا ضروری ہے، یا اگر فلاں بیماری پھیل گئی تو اس بیماری سے محفوظ رہنے کے لئے فلاں ٹیکا لگوانا ضروری ہے۔ معاشرہ کو بھی اگر صحیح و سالم زندگی گزارنا ہے تو اس کے لئے بھی قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے تو کیا یہ قوانین واقعاً طبیعت میں موجود ہیں کہ کچھ لوگ ان کو کشف کریں؟ یا نہ، یا قوانین اعتباری اور فرضی ہیں، اور لوگوں کی رضایت کی خاطر ان کو کبھی کبھی بدلا بھی جاسکتا ہے، کیونکہ یہ قوانین اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ واقعاً یہ مسئلہ بہت اہم اور بنیادی ہے اور اس کا ایک پہلو فلسفہ سے متعلق ہے اور ایک پہلو انسانی علوم سے وابستہ ہے اور اس کا ایک پہلو معرفت شناسی سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے بہت سے پیچیدہ مسائل ہیں جن کی بحث یونیورسٹیوں یا علمی مرکزوں میں ہونی چاہئے، اور ان تمام مطالب کو بیان کرنا اس وقت ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن سب کے استفادہ کے لئے ہم ان میں سے کچھ منتخب مسائل کو بیان کرتے ہیں۔

۵۔ واقعی مصلح و مفاسد قانون کے پشت پناہ

کیا واقعاً انیت اور چوری سے روکنے کے درمیان کوئی رابطہ ہے؟ یعنی اگر انیت چاہتے ہیں تو چوری نہیں ہونا چاہئے؟ یا نہ، ان کے درمیان صرف ایک قراردادی رابطہ ہے، اور انیت اور چوری دونوں ہی ممکن ہیں۔ کیا قتل اور ناامنی میں کوئی رابطہ ہے؟ یعنی اگر کوئی ہر کسی کو قتل کرنا چاہے قتل کر دے تو کیا واقعاً اس سے ناامنی پیدا ہوتی ہے یا یہ صرف قراردادی رابطہ ہے؟ کیا جنسی آزادی گھر کے اجڑنے کا سبب بنتی ہے یا نہیں؟ مثلاً اگر کسی زمانہ میں لوگوں کی پسند ہونے کی وجہ سے جنسی رابطہ کو آزاد قرار دیدیا جائے تو ایک روز کہنا بھی محدود ہے کیونکہ اکثر لوگ اس کو پسند نہیں کرتے ہیں، تو کیا ایسا قانون بنانا جس میں جنسی آزادی موجود ہو یا موجود نہ ہو، صرف ایک قراردادی مسئلہ ہے؟ یعنی کیا یہ کام کا ایک سلیقہ ہے کہ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں یا ناراض ہوتے

ہیں، اور ان کی مرضی کے مطابق قانون ہونا چاہئے؟ یا نہ، بلکہ ایک واقعی رابطہ پر موقوف ہے، اور وہ یہ کہ اگر جنسی آزادی ہو تو پھر معاشرہ میں جسمی اور روحی بیماریاں جیسے ایڈز وغیرہ پھیل جائیں گی، اور لوگوں کے گھرا بھڑ جائیں گے، عورت مرد میں روحانی بیماریاں پھیل جائیں گی، بچے بے تربیت اور دوسری تباہی پھیل جائیں گی۔

بعض لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اجتماعی قوانین، واقعی مصلح و مفاسد کے تابع ہیں، اور ایسا نہیں ہے کہ یہ قوانین لوگوں کی مرضی اور ان کے سلیقہ پر ہوں۔ جس طرح اگر شراب رائج ہو جائے تو روحی، قلبی اور تنفسی بیماریاں پھیل جائیں گی یا اگر میٹھی سگریٹ کا رواج ہو تو بہت سی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی، اجتماعی مسائل بھی اسی طرح ہیں: اگر عورت مرد میں آزادانہ روابط ہو جائیں تو پھر معاشرے میں اس کے اثرات خطرناک ثابت ہونگے جس کے نمونے مغربی ممالک (کہ جہاں نامشروع روابط کافی حد تک رائج ہیں) میں ملاحظہ کرتے آئے ہیں، لہذا قانون بناتے وقت ان کے واقعی آثار بھی مد نظر رہیں، نہ یہ کہ صرف لوگوں کی مرضی کے مطابق ہی عمل کیا جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ لوگوں کی اکثریت جنسی آزادی کو پسند کرتی ہے یا پسند نہیں کرتی۔ یا لوگوں کی اکثریت افیم و چرس کی آزادی کی خواہاں ہے یا نہیں؟ کیا قانون کو اسی طریقہ پر ہونا چاہئے یا یہ کشف کریں کہ نشیلی چیزوں سے کیا کیا نقصانات ہیں اگرچہ اکثریت اس کے موافق بھی ہو؟ آپ کی نگاہ میں کون سا راستہ صحیح ہے؟ اجتماعی قوانین لوگوں کی اکثریت کی بنا پر ہوں یا واقعی (نفع و نقصان کی) بنا پر؟ یعنی اجتماعی مصلح و مفاسد حقیقی اور واقعی امور ہیں یا صرف اعتباری یا سلیقہ ای امور ہیں؟ ”ھیوم“ کے زمانہ کے بعد سے، مغربی ممالک میں معرفت شناسی میں یہ بحث بیان ہوئی ہے کہ ”باید ہا ونباید ہا“ (کیا ہونا چاہئے کیا نہیں ہونا چاہئے) خارجی واقعیت نہیں رکھتے اور ان پر عقلانی امور اور استدلال کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ”خوب و بد“ انہیں سلیقوں کی طرح ہے جو لوگوں کے درمیان پائے جاتے ہیں، مثلاً اگر کسی کو ”گلابی رنگ“ پسند ہے تو اس سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ کیوں آپ کو یہ رنگ کیوں پسند ہے، کیونکہ کسی کو یہ رنگ پسند ہے دوسرے کو کوئی دوسرا رنگ پسند ہے، تو کیا اجتماعی مسائل بھی رنگوں کی طرح ہیں؟ یا نہیں، بلکہ اجتماعی مسائل، واقعی مصلح و مفاسد کے تابع ہیں؟ انسانی کردار کا اثر جو انسان کی فردی اور اجتماعی، مادی و معنوی زندگی پر ہوتا ہے ایک حقیقی رابطہ ہے، یعنی درحقیقت ان میں علت و معلول کا رابطہ ہے، اور اجتماعی اور فردی زندگی میں انسانی کردار سعادت یا شقاوت کا سبب ہوتا ہے، لہذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سے کام سعادت کے باعث ہیں تاکہ وہ کام جائز ہوں، اور کون سے کام شقاوت و بدبختی کے باعث ہیں تاکہ ممنوع اور حرام ہوں۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا کہ انسانی کردار کا سعادت و شقاوت سے واقعی اور حقیقی رابطہ ہے تو ضروری ہے کہ ان روابط کو پہنچانا جائے اور انہیں کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون انسان کے مصلح و مفاسد کو بہت رطو پر جانتا ہے؟ ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ان کو بہت ر جانتا ہے۔ لہذا قانون گذاری میں اسلام کا نظریہ ہے کہ انسان کی فردی اور اجتماعی زندگی کے اعمال اور

سعدت و شقاوت میں علی اور معلولی رابطہ ہے جن کو مصلحت و مفسدہ کھا جاتا ہے، لہذا ان مصلحتوں اور مفسدوں کو پہچاننا ضروری ہے اور انہیں کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں، اور اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق قوانین نہیں بنانے چاہئے۔

حوالے

(۱) مستدرک الوسائل ج ۱۲ ص ۴۲۴۔

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے گذشتہ بحث کے دوران اسلام کے سیاسی نظریہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا: ایک قوہ مقننہ (قانون گذاری) دوسرا قوہ مجریہ (قانون کو جاری کرنے والی طاقت)، اور اس سلسلہ میں ہونے والے اعتراضات کے جوابات بھی دئے، نظریہ کی بنیاد یہ تھی کہ سیاسی حکومت منجملہ اسلامی حکومت کے دو حصے ہوتے ہیں، (البتہ ممکن ہے کہ دوسرے نظریات کے تحت تین یا چار حصے بھی ہو سکتے ہیں) پہلا حصہ قانون گذاری کا ہے اور دوسرا حصہ قوانین کا جاری کرنا ہے، قانون گذاری کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ میں وہ قوانین حاکم ہوں جن کے ذریعہ معاشرہ کے مادی و معنوی مصلحتوں کو پورا کیا جاسکے، اسی بنا پر وہ شخص معاشرہ کے لئے مکمل قانون بنا سکتا ہے جو انسان کے مادی و معنوی تمام پہلوؤں اور اجتماعی زندگی کے مختلف شرائط سے باخبر ہو، اور یہ قوانین اس طرح بنائے جائیں کہ جن سے عالم آخرت میں انسانی سعادت فراہم ہو سکے، اور ظاہر ہے کہ خداوند عالم یا خداوند عالم کا منتخب بندہ ہی ایسے علم و دانش کا مالک ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت میں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے احکامات کی اطاعت کریں اور خداوند عالم کے تشریعی ارادہ کو اپنی زندگی میں حاکم قرار دیں، اور اس کے مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھائیں، لہذا قانون گذاری میں خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کی رعایت کی جائے۔ چونکہ اسلامی قوانین مخصوص حقیقت کے حامل ہیں لہذا انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے امتیاز رکھتے ہیں۔

مختصر الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ اسلامی قوانین خدا یا جس کو خدا اجازت دے کر بھیجے، اس کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اسی طرح قوانین کو جاری کرنے والوں کے لئے بھی ہے، کیونکہ قانون کا مجری گویا معاشرہ کے لوگوں میں تصرفات کرتا ہے، اور ان کو قوانین الہی پر عمل کرنے پر آمادہ کرتا ہے، کبھی کبھی حدود و تعزیرات کو جاری کرتا ہے اور کبھی جرم کے مقابلہ میں خاص پابندیاں لگاتا ہے۔

بہر حال یہ کچھ تصرفات ہیں جو خدا کے بندوں میں ہوتے ہیں، اور یہ تصرفات صرف وہ حضرات کر سکتے ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ ہیں، ان کے علاوہ یہ تصرفات جائز نہیں ہیں۔

۲۔ قانون کے جاری کرنے والوں کے لئے بھی اذن خدا ضروری

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سوال کریں کہ جب ہم نے قانون کو قبول کر لیا اور ان کے جاری ہونے والے راستوں کو اچھی طرح پہچان لیا اور یقین کر لیا کہ فلاں خاص موقع پر فلاں قانون جاری ہونا چاہئے، تو اس میں کوئی فرق نہ نہیں ہے کہ قانون کا جاری کرنے والا زید ہو یا عمرو؟ جب خدا کا صحیح قانون جاری ہو جائے تو پھر خدا کی اجازت کی کیا ضرورت؟ ہم نے قبول کر لیا کہ معاشرہ میں قوانین الہی جاری ہوں، لیکن پھر جاری کرنے والے کے بارے میں اجازت کی کیا ضرورت؟

گذشتہ اعتراض کو اگر فقہی فضاء میں بیان کیا جائے تو جواب بھی فقہی روش کے لحاظ سے دیا جائے گا، اگر کوئی اس اعتراض کو فقہی تحقیق اور آزاد طریقہ سے بیان کرے، اور ہم سے جواب لینا چاہے اور یہ چاہے کہ عمومی طور پر قابل فہم ہو تو پھر ہم اجتماعی مثالوں کے ذریعہ عام فہم زبان میں عرض کریں گے، مثلاً آپ کی گھریلو زندگی میں کچھ قوانین ہوتے ہیں جن کو آپ کی بیوی اور بچوں کو رعایت کرنا ہوتا ہے، مثلاً یہ کھیں کہ کوئی دوسرا کسی کی چیز کو ہاتھ نہ لگائے، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے کھلونے اور رکابی پینسل وغیرہ میں اس قانون کی رعایت کرتے ہیں، اور ان میں سے کوئی دوسرا بغیر اجازت کے کسی دوسرے کی چیز کو اٹھاتا ہے، تو اس پر اعتراض ہوتا ہے، یا اگر آپ کا کوئی پڑوسی آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے گھر میں داخل ہو کر آپ کے سامان کو لے جائے، اگرچہ وہ سامان آپ کے نزدیک بے کار ہی کیوں نہ ہو، تو آپ فوراً اعتراض کر دیتے ہیں کہ میری اجازت کے بغیر کس طرح میرے گھر میں داخل ہوئے، یا کیوں ہمارے سامان کو اٹھا کر لے گئے، یہاں تک کہ اگر اس نے آپ کے ساتھ کچھ احسان بھی کر رکھا ہو، پھر بھی آپ کو حق ہے کہ اس پر اعتراض کریں۔

ایک دوسری مثال کو فرض کیجئے کہ کسی ادارہ میں کچھ قوانین نافذ ہونا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک اس ادارہ کے رئیس کا حکم نامہ نہیں آیا ہے، اگر کوئی آکر کھے کہ میں ایک با اطمینان اور با امن انسان ہوں، اور قوانین کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں اور اب رئیس کی کرسی پر بیٹھتا ہوں اور ان قوانین کو یکے بعد دیگرے جاری کرتا ہوں، تو کوئی بھی اس کو اس کام کی اجازت نہیں دیگا؛ یہاں تک کہ اگر وہ شخص بعد کا ہونے والا رئیس ہی کیوں نہ ہوں، جب تک اس کا حکم نامہ نہ آجائے اس کو حق نہیں ہے کہ کرسی پر آکر بیٹھے اور لوگوں کو حکم دے۔

اور اگر کوئی ایسا کام کرے بھی تو وہ مجرم مانا جائے گا، اور ہو سکتا ہے کہ اس کو عدالت میں بھی بھیج دیا جائے اور اس کو سزا بھی ہو، جب اس نے خدمت انجام دی ہے اور اس نے وہی کام انجام دیا ہے کہ جو ابھی کچھ دنوں کے بعد ہونے والا ہے، کیوں اس اصل کو تمام عقلمند حضرات قبول کرتے ہیں؟ اس لئے جب تک اس کے اوپر والا رئیس اس کو اس کام کی اجازت نہ دے تو اس کو ایسے کاموں کی اجازت نہیں ہے خلاف قانون کی تو دور کی بات ہے۔

معاشرہ میں اجتماعی زندگی کے اندر اس قبول شدہ اصل کے پیش نظر ہم آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں، کہ وہ معاشرہ جو خدا سے متعلق ہے اور لوگوں نے خدا کو رب مانا ہے، اگر کوئی اپنے رب کی اجازت کے بغیر حکومت کرنا چاہے اس کی مثال اس شخص کی ہے کہ جو کسی ادارہ میں ریاست کرنا چاہے، یا مثلاً کوئی رئیس مملکت بننا چاہے، اور اس کے کاموں میں مشغول ہو؛ بغیر اس کے اس بلند رتبہ والا اس کو اجازت دے، یہاں تک کہ اگر اس کا کام بھی صحیح اور بجا ہو، تو اس سے باز پرس کی جاتی ہے، اور ممکن ہے کہ اس کو سزا بھی ہو، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین کا اجراء کرنے والا بھی خدا کی طرف سے ہو، جو لوگوں کا مالک حقیقی ہے، ورنہ اس سے باز پرس ضرور ہوگی، جیسا کہ ہم نے گذشتہ مثال میں عرض کیا، اور اگر یہ فرض کریں کہ اس سے باز پرس بھی نہ ہو، تو لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں ہے، یہاں تک کہ اسی قانون کے بارے میں لوگ کہیں گے کہ جب تک آپ کا حکم نامہ نہ آجائے تب تک آپ کیسے رئیس بن بیٹھے؟ اور جب تک لوگ یہ یقین نہ کر لیں کہ اس کو بلند مرتبہ رئیس نے اس رتبہ پر فائز کیا ہے اس کی اطاعت بھی نہیں کرتے۔

اسلامی نظریہ کے لحاظ سے، معاشرہ کے تمام ہی افراد خدا کی مخلوق ہیں، اور خدا ان کا مالک اور خالق ہے، لہذا مالک کی اجازت کے بغیر کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے امور میں دخالت کرے جب تک کہ ان کا مالک (خدا) اس کام کی اجازت نہ دے، یہاں تک کہ قانون الہی کو وہی معین شخص جس کو خدا کی طرف سے اجازت ہے، جاری کر سکتا ہے، اسی وجہ سے اسلامی انقلاب کے بانی حضرت امام خمینی نے اسلامی نظریہ کے مطابق اپنے کو اسلامی حاکم صدر مملکت کے لئے جو حکم نافذ کیا اس میں یہ تحریر کیا کہ میں تم کو نصب کرتا ہوں یعنی آپ نے کسی بھی موقع پر لوگوں کے ووٹ کو کافی نہ جانا، یہاں تک بعض موقعوں پر فرمایا: میں اُس ولایت کی رو سے جو تم پر رکھتا ہوں تم کو منصوب کرتا ہوں، ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

”ان لوگوں کی باتوں کو نہ سنو کہ جو اسلامی نظریات کے خلاف ہیں، اور خود کو روشن فکر تصور کرتے ہیں اور ولایت فقیہ کو قبول نہیں کرتے، اگر ولی فقیہ اس کو منصوب نہ کرے تو اس کی حکومت غیر مشروع ہے اور جب غیر مشروع ہوئی تو وہ طاغوت ہے، اور اس کی اطاعت طاغوت کی اطاعت ہوگی“ (صحیفہ نور ج ۹ ص ۲۵۱) یہ کوئی امام خمینی کا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ نظریہ قرآن و حدیث سے اخذ کیا گیا ہے، بہر حال یہ اس شخص کا نظریہ ہے جس نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔

لہذا قانون کو جاری کرنے والا، اولاً اسلامی نظریہ کے مطابق تمام قوانین کو جاری کرنا، ثانیاً وہ خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہو۔ اور یہ اذن کبھی خاص ہوتا ہے جیسا کہ حضرت رسول خدا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں ہے یا ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کو خود آنحضرت نے منصوب فرمایا ہے، یا جس طرح حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی طرف سے بعض اسلامی ریاستوں کے والی و حاکم معین ہوئے ہیں، یا جس طرح امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے زمانہ میں نواب اربعہ خاص طور پر منصوب ہوئے۔

ان تمام مقامات میں یہ افراد اس شخص کی اجازت سے منصوب ہوئے جو اپنی حکومت میں الہی قوانین کو بیان اور کو جاری کرتے تھے۔ کبھی یہ منصوب کرنا عام ہوتا ہے؛ جیسے امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں، یا ان ائمہ علیہم السلام کے زمانہ میں کہ جو بسوط الید (آزاد) نہ تھے اور حکومت ان کے ہاتھوں میں نہ تھی، ایسے موقعوں پر باصلاحیت افراد اذن عام کی بنا پر منصوب اور احکام الہی کے جاری کرنے کے لئے معین ہوتے تھے، مثلاً حضرت امام صادق علیہ السلام نے اپنے شیعہ فقہاء کو اجازت دی ہے کہ جن علاقوں میں لوگوں کی امام (ع) تک رسائی ممکن نہ ہو، وہاں علماء احکامات الہی کو جاری کریں اور حکومتی کاموں میں مشغول رہیں، زمانہ غیبت میں یہ مسئلہ بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔

کیونکہ جب امام حاضر اور بسوط الید نہیں ہے یا امام تقیہ کی عالم میں ہے، تو وہ بطور عام ان افراد کو منصوب کرتا ہے جو اس کی طرف سے حکومتی مسائل میں دخالت رکھتے ہیں، کیا یہ کام امام علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں کہ جس میں امام علیہ السلام تک رسائی ممکن نہیں اولیٰ اور مناسب نہیں ہے؟

اس وقت ہم فقہی مبانی اور شرعی دلیلوں کو ثابت کرنا نہیں چاہتے، صرف اس مسئلہ کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں حتیٰ اسلامی قانون کو جاری کرنے والے کے لئے بھی خدا کی اجازت کی ضرورت ہے، اور کس طرح خداوند عالم قانون کو جاری کرنے والوں کو اجازت دیتا ہے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ اجازت یا کسی خاص شخص کے لئے بصورت خاص ہوتی ہے، یا بصورت عام جیسا کہ جامع الشرائط فقہاء کرام کے لئے ہے۔

اس نظریہ پر چاہے وہ قانون گذاری پہلو ہو یا قانون کو جاری کرنے والا پہلو بعض اعتراض ہوتے تھے، جن میں سے سب سے مہم یہ تھا کہ یہ نظریہ انسانوں کی آزادی کے مخالف ہے، البتہ ہم نے اس اعتراض کا گذشتہ گفتگو میں مفصل جواب عرض کر دیا ہے۔ ان اعتراضات کا دوسرا حصہ قانون کو جاری کرنے کے بارے میں تھا، کہ یہ ولی فقیہ والا نظام، جمہوریت کے ساتھ ہم اہنگ نہیں ہے۔ جمہوریت ایک ایسی حکومت ہے جس کو تمام ہی عقلاء عالم نے قبول کیا ہے، یہاں تک وہ ممالک کہ جن میں سوسیالیسٹی (Socialist) حکومت تھی عملی میدان میں جمہوریت کے مقابلہ میں ٹھہرنے لگیں، اور مجبوراً ڈیموکریٹک نظام کو قبول کر لیا۔ لہذا آج کا انسان ڈیموکریٹک نظام کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رکھتا، اور یہ اسلامی حکومت جو ولایت فقیہ کی حکومت کے نام سے معروف ہے، ڈیموکریٹک سے ہم اہنگ نہیں ہے۔

۳۔ جمہوریت کے معنی اور اس کے استعمال میں ایک بحران

پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ لفظ ”جمہوریت“ (ڈیموکریٹک) "Democratique" کے بارے میں کچھ وضاحت کریں، کیونکہ ہو سکتا ہے بعض لوگ اس لفظ کے بارے میں کافی معلومات نہ رکھتے ہوں، جمہوریت کے لفظی معنی؛ لوگوں کی حکومت، مراد

یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد بھی قانون گذاری اور اجرائے قانون میں اہم کردار رکھتے ہیں اور کوئی دوسرا قانون گذاری اور اجرائے قانون میں حق دخالت نہیں رکھتا، یہ ہیں لفظ ڈیموکریسی کے معنی۔

تاریخ کے اوراق پر جمہوریت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے: جیسا کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ صدی پہلے یونان کے پائے تخت ”آٹن“ میں یہ نظریہ وجود میں آیا اور کچھ مدت کے لئے یہ نظریہ اجراء کیا گیا اس طرح کہ تمام لوگ سوائے غلاموں اور ۲۰ سال سے کم عمر والوں کے سبھی لوگ سیاسی اور اجتماعی مسائل میں براہ راست دخالت کرتے تھے۔ جس وقت کوئی ۲۰ سال کا ہو جاتا تھا تو اپنے شہر کے سیاسی کاموں میں دخالت کر سکتا تھا۔ البتہ کسی پر ضروری نہیں تھا بلکہ یہ لوگ آزاد تھے۔ اس زمانہ میں لوگ کسی بڑے میدان میں جمع ہوتے تھے اور اپنے شہر کے بارے میں نظریات پیش کرتے تھے، بحث و گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے نتیجے میں تصمیم گیری ہوتی تھی اور انہیں پر عمل ہوتا تھا، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی خاص شخص یا خاص گروہ حکومت کے لئے معین ہوتا تھا، بلکہ خود افراد براہ راست اجتماعی و سیاسی مسائل میں دخالت کرتے تھے۔

اس طرز فکر کو جمہوریت یا لوگوں کی حکومت کا نام دیا جاتا تھا، حکومت کا یہ انداز ایک مدت تک یونان کے پائے تخت آٹن میں چلتا رہا، لیکن بڑے بڑے دانشمند اور فلاسفہ حضرات نے اس نظریہ کی بھرپور مخالفت کی، اور اس کو برے نام سے یاد کیا کرتے، یعنی اس کو جہال (جمع جاہل) کی حکومت کہتے تھے، ادھر عملی طور پر بھی اس جمہوری حکومت کے برے نتائج سامنے آئے، اسی وجہ سے حکومت کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

طبعی ہے کہ بڑے بڑے ممالک اور کثیر آبادی والے شہروں میں یہ طریقہ کار مشکل تھا کیونکہ ممکن نہ تھا کہ ہمیشہ اجتماعی مسائل میں تمام لوگ براہ راست دخالت رکھیں۔ چھوٹے شہروں میں یہ انداز کچھ مدت کے لئے ممکن ہے، لیکن لاکھوں والے شہروں میں کس طرح ممکن ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں سب مل کر کوئی فیصلہ لیں؟!

بہر حال یہ انداز ختم ہو گیا، یہاں تک کہ ”رئسانس“ کے زمانہ میں ڈیموکریسی کی ایک دوسری تصویر پیش کی گئی، وہ اس طرح کہ لوگوں کے کچھ نمائندے حکومت کے کاموں کے لئے منتخب ہوں، اور وہ سبھی لوگوں کی نمائندگی میں حکومت کریں؛ کیونکہ لوگوں کی براہ راست دخالت ممکن نہ تھی۔ اس کے بعد سے اس نظریہ کے بہت زیادہ حامی پائے جانے لگے اور اہستہ اہستہ بعض ممالک میں اس طرح کی حکومت رائج ہو گئی، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں تقریباً یورپ اور دوسرے ممالک میں اس طرح کی حکومت لوگوں میں مقبول ہو گئی اور اسی طرز پر حکومتیں بننے لگیں۔

ہمارے ملک میں بھی ڈیموکریسی کا بھی طریقہ ہے، تمام لوگ حکومتی شعبوں کے مختلف ووٹنگ میں شرکت کرتے ہیں۔ مثلاً صدر مملکت اور اسلامی پارلیمنٹ کے نمائندگان کو ووٹوں کے ذریعہ انتخاب کرتے ہیں کہ جو لوگوں کی نمائندگی میں قوانین بناتے اور ان کو جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح شوریٰ اور دوسرے انتخابات جن کا ذکر قانون اساسی میں آیا ہے شرکت کرتے ہیں۔ پس ڈیموکراسک کی دوسری تصویر جس میں سیاسی و اجتماعی مسائل میں لوگ خود اپنی رائے اور اپنے ووٹوں کے ذریعہ نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں۔

۳۔ دور حاضر میں جمہوریت کا مفہوم

آج کے زمانے میں ڈیموکراسک کچھ اور ہی خاص معنی پیدا کرتی جا رہی ہے اس حکومت کو ڈیموکراسی حکومت کہتے ہیں جس میں دین کا کوئی نقش نہ ہو لہذا جس وقت یہ کھا جاتا ہے: ”فلاں حکومت جمہوری ہے اور فلاں ملک ڈیموکراسک طریقہ پر حکومت کرتا ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاشرہ میں دین کا کوئی کمرادر نہیں ہے، یعنی قانون کے بنانے والے اور قانون کو جاری کرنے والے کسی بھی موقع پر دین کی دخالت کو نہیں مانتے۔

البتہ ڈیموکرائٹ کا یہ انداز دین کی نفی نہیں کرتا، لیکن سیاسی و اجتماعی مسائل میں دین کی دخالت کو قبول نہیں کرتے، اور اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ قانون کے جاری کرنے والے قوانین کو جاری کرتے وقت دین کی کوئی بات کریں، اور کوئی بھی طریقہ کار دینی احکام کی بنا پر نہ ہو۔ درحقیقت ڈیموکریسی کا یہ طریقہ ”لائٹ“ اور ”سیکولر“ نظام کی بنیاد پر ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ سیاسی و اجتماعی مسائل سے دین کو بالکل جدا اور الگ ہونا چاہئے۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ خود قانون گذار یا قوانین کے جاری کرنے والے افراد متدین اور دیندار ہو سکتے ہیں کہ ہر ہفتہ کلیسا (گر جاگھر) میں جائیں اور وہاں نذر و نیاز کریں۔ ممکن ہے یہ لوگ دینی انجمنوں کے ممبر بھی ہوں اور حکومتی کاموں کے علاوہ ایک معمولی انسان کے طرح دینی کاموں میں بھی مشغول رہیں۔ لیکن حکومت کے کاموں میں چاہے قانون گذاری شعبہ ہو یا شعبہ اجراء قوانین دین کی کوئی بات نہ کریں۔

اگر آپ سنیں کہ مثلاً ”فرانس“ میں (جو آزادی اور جمہوریت کا گھوارہ مانا جاتا ہے) ایک باحجاب لڑکی کو کالج اور یونیورسٹی میں جانے سے روکا جاتا ہے، تو اس کی وجہ بھی ڈیموکرائٹ ہے جس میں دینی کاموں سے روکنا اس کا ایک وظیفہ ہے، اور کہتے ہیں کہ ہماری حکومت ایک لائٹ حکومت ہے، لہذا دین کی کوئی علامت ہمارے کسی بھی سرکاری شعبوں میں نہیں ہونا چاہئے، دوسری اور نقاب کا لگانا دینی طرفداری کی ایک نشانی ہے، اور سرکاری شعبوں مثلاً مدرسہ میں اس کا پہننا ممنوع ہے؛ ہاں اگر کوئی مدرسہ کلیسا سے مربوط ہو یا کوئی پبلک اسکول ہو تو اگر تمام لڑکیاں دوسری پہنتی تو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی، لیکن سرکاری کالج یا یونیورسٹی میں جہاں سرکاری سند دی جاتی ہے وہاں یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح دوسرے وزارت خانوں میں دین کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تھی جمہوریت کی ایک نئی تفسیر جس کی بنا پر دینی اثرات جمہوریت کے خلاف ہیں۔

ڈیموکرائٹ کی اصلی اور نئی تصویر کے مطابق جس میں ڈیموکراسی کے معنی لوگوں کی حکومت ہے، اگر کچھ لوگ دیندار ہوں اور چاہیں کہ ادارہ جات میں دینی آداب و رسوم پر عمل کریں، تو پھر مخالفت نہیں ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہ کام لوگوں کی مرضی کے مطابق

اور ان کے بنائے قوانین کے اعتبار سے ہے، ڈیموکراسی کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر جگہ حتیٰ مدارس اور وزارتوں اور دوسرے ادارات میں لباس پہننے میں آزاد ہو، اور اگر لوگوں کی اکثریت دیندار ہے اور اسی دین کی وجہ سے کوئی خاص قسم کا لباس پہننا چاہیں یا دینی پروگرام کرنا چاہیں، تو پھر کسی کو حق نہیں ہے کہ ان کو روکے۔ جس وقت لوگوں کی مرضی سے یہ قانون بنایا گیا کہ وزارتوں، یونیورسٹیوں اور دوسرے اداروں میں نماز جماعت کا ہونا ضروری ہے یہ ڈیموکراسی (جس معنی میں ہم مانتے ہیں) کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ خود لوگوں نے اس قانون کو بنایا ہے اور خود ہی جاری کرتے ہیں، لیکن ڈیموکراسی کی دو حاضر تصویر کے مطابق اجتماعی و سیاسی مسائل میں دینی رجحان نہیں ہونا چاہئے۔

۵۔ جمہوریت کی نئی تصویر سے استعمار کا بے جا فائدہ اٹھانا

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ڈیموکرائٹک کی نئی تصویر جسے استعماری حکومتیں پیش کرتی ہیں اور اپنے مقاصد کے تحت اس کو جاری کرتی ہے، لائک اور سیکولر حکومتوں کے برابر ہے جو ذرہ برابر بھی یہ نہیں چاہتیں کہ سیاسی و اجتماعی امور میں دین کی دخالت ہو۔ یہاں تک کہ اگر خود لوگ یہ کہیں کہ ہم اس دین کو قبول کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سرکاری دفاتر میں دینی رسم و رواج پر عمل کریں، پھر بھی لوگوں کی مرضی کو ڈیموکراسی کے مخالف سمجھا جائے گا۔

اسی وجہ سے جب ”الجزائر“ میں انتخابات ہوئے اور وہاں ایک اسلامی پارٹی کامیاب ہوئی اور ڈیموکرائٹ اصولوں اور اس ملک کے قوانین کے مطابق حکومت بنانا چاہی اور اسلامی قوانین کو جاری کرنا چاہا، مخالفوں نے احساس کیا کہ یہ پارٹی تو مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور مستقبل میں اسلامی حکومت بنانا چاہتی ہے تو بغاوت کردی اور انتخاب کو رد کر کے اس پارٹی کے لیڈروں کو پکڑ پکڑ کر جیل میں ڈال دیا، اور اس پارٹی کو ختم کر کے اس کو غیر قانون قرار دے دیا۔ اور چند سال گزرنے کے بعد بھی اس پارٹی کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہے، جب کہ اس اسلامی ملک نے لاکھوں قربانی دے کر اس آزادی اور استقلال کو حاصل کیا تھا، اور قربان ہونے والے وہی مسلمان تھے کہ جھنوں نے اسلام کی خاطر اس وقت کی استعماری حکومت سے جنگ لڑی تھی یہاں تک کہ الجزائر کے لوگوں کو آزادی نصیب ہوئی، آج وہاں کی حالت بہت زیادہ خراب ہے جیسا کہ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ ہر روز دسیوں لوگ کو خطرناک طریقے سے قتل کیا جاتا ہے۔

وہاں رونما ہونے والے ان تمام حادثوں کے پیش نظر وہاں کی وہ حکومت جو بغاوت کر کے بنائی گئی ہے اس قتل و غارت گری کے ذریعہ اپنی حکومت کو مضبوط کرتی جا رہی ہے، اور استعماری حکومتوں کے نزدیک وہاں کی یہ حکومت مقبول تر ہے، اس حکومت کے مقابلہ میں جو ووٹنگ اور لوگوں کی رائے سے بنی تھی جو دین اور اس کے احکامات کو جاری کرنا چاہتی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں دنیا میں ایک نئی اسلامی حکومت نہ بن جائے ”اس طرح کی حکومت کو جمہوری نام رکھا، لیکن اگر خود لوگ اپنی رائے

اور اپنی مرضی سے اسلام اور اسلامی حکومت کو چاہیں اس کو غیر ڈیموکریٹک کہتے ہیں کیونکہ لوگ اسلام کی طرف رجحان رکھتے ہیں“ لہذا جمہوریت کی نئی تفسیر کی بنا پر دین کو اجتماعی و سیاسی مسائل میں بالکل دخالت نہیں کرنا چاہئے، یہاں تک کہ کوئی لڑکی چادریا مقننہ پہن کر کالج نہیں جاسکتی؛ جیسا کہ ترکی میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

استعماری پٹھو، اسلامی ممالک میں بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں بھی اسی طرح کی جمہوریت ہونا چاہئے حکومتی مسائل میں دین کے لئے کوئی جگہ نہ ہو چاہے قانون گزاری والا شعبہ ہو یا قانون کے جاری کرنے والا شعبہ، وہ ممالک جو اسلامی حکومت بنانے کے لئے بہت زیادہ راغب ہیں ان میں ثقافتی حملہ اور یونیورسٹیوں میں نفوذ کے ذریعہ اسلامی رجحان کو ضعیف و کمزور کرنا چاہتے ہیں، اور جمہوریت کی اس تصویر کو رائج کرنا چاہتے ہیں، اپنے خیال ناقص میں یہ گمان کرتے ہیں کہ چند سال بعد جب یہ نسل بدل جائے گی تو انقلابی نسل ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ وہ نسل آجائے گی کہ جو انقلاب کے اصولوں سے واقف نہیں ہے، وہ نسل ڈیموکریٹک کی اس نئی تصویر و تفسیر کو بروئے کار لائے گی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت کے تین معنی اور تفسیر ہیں:

- ۱۔ لوگوں کا حکومتی مسائل میں براہ راست دخالت دینا جیسا کہ کچھ مدت کے لئے یونان میں رہی اور پھر ختم ہو گئی۔
- ۲۔ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ حکومت میں دخالت، جیسا کہ آج کل کے بعض ممالک میں رائج ہے اور خود ہمارے ملک میں بھی موجود ہے۔

۳۔ حکومت کے تمام کام (قانون گزاری ہو یا اجرائے قانون) دین سے جدا ہوں، یعنی ڈیموکریٹک کا سیکولر اور لائک ہونا شرط

ہے۔

۶۔ اسلامی نظریہ کے مطابق جمہوریت کی مناسب تصویر

ہم نے اس سوال کے جواب میں کہ اسلام حکومت کے کس انداز کو قبول کرتا ہے؟ ہم نے قانون گزاری کے بحث میں عرض کیا کہ اگر قانون گزاری میں جمہوریت کے یہی معنی ہوں کہ اگر لوگوں کی اکثریت (۵۱ فی صد) جس قانون کی حمایت کریں وہ قانون معتبر اور واجب الاتباع ہے چاہے قرآن کی صریح آیات کے خلاف کیوں نہ ہو، تو اسلام ایسی ڈیموکریٹک کو نہیں مانتا، وہ اسلام جو خود حکومت کے مختلف پہلوں پر منجملہ عدالت (کورٹ) معاشی مسائل، وغیرہ وغیرہ تمام مسائل میں قوانین رکھتا ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دے تا کہ اس کے صریح قوانین کے مخالف قوانین رواج پیدا کریں، اور اگر ہم اس طرح کے قوانین کو رسمی مانے تو گویا ہم نے اسلام کو نادیدہ قرار دیا ہے۔

ایسی جمہوریت کا اسلامی قانون گزاری سے مخالف ہونا ایک بدیہی اور ظاہری بات ہے اور کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کھے کہ جمہوریت قانون گزاری یعنی قانون کے معتبر ہونے میں اسلام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اسلام بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا، اور جب کسی مجموعہ میں اسلام کی مخالفت پائی جاتی ہو تو اس کی بارے میں دلیل بھی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور جب کسی مجموعہ میں اصل اسلام سے ایسی مخالفت موجود ہو تو پھر یہ سوال نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام کے ساتھ ہم آہنگ ہے یہ نہیں؟ کیونکہ خود مجموعہ اس کی مخالفت میں بنایا گیا ہے، پس اگر جمہوریت یعنی وہ قوانین جو اسلام سے متفق نہ ہوں ان کو معتبر ماننا تو پھر ہم یہ کھیں گے کہ اسلام اس جمہوری قانون کو معتبر جانتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیز اسلام سے سازگار نہیں ہے وہ سازگار ہو جائے، یہ ایک تناقض اور واضح البطلان نظریہ ہے استدلال کی ضرورت نہیں۔

بہر حال جس چیز کی وضاحت کی ضرورت ہے جس کا ہم نے وعدہ بھی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جمہوریت کا اجرانی سلسلہ ہے؛ یعنی قانون کو جاری کرنے والوں کے یقین میں لوگوں کا کیا کردار ہے؟، اسی طرح ان لوگوں کے انتخاب میں جو قوانین کو اسلامی نظریات کے تحت بنانا چاہتے ہیں (مثلاً اسلامی پارلیمنٹ کے ممبران) ان کے سلسلہ میں لوگوں کی کیا ذمہ داری ہے؟۔ اور جہاں پر اسلام کے ثابت اور دائمی قوانین نہیں ہیں، اور آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انسانی حالات کے پیش نظر نئے قوانین کی ضرورت ہوتی ہے، اسلام نے ان موارد میں حکومت کو اجازت دی ہے کہ اسلامی دائرہ میں ضروری قوانین کو بنائے، مثلاً گاڑی چلانے سے متعلق قوانین وہ داہنی طرف چلیں یا بائیں طرف، یا ان کی رفتار کتنی ہو، ظاہر ہے کہ قرآن و احادیث میں اس سلسلہ میں کوئی واضح حکم تو ہے نہیں، اور ایسے متغیر قوانین زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، یہ کام اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ اسلام کے کلی نظریات کے مطابق مناسب قوانین بنائے۔

مذکورہ بحث کی رو سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جمہوریت اور لوگوں کی اہمیت کا اندازہ قانون گزار اور قانون کے جاری کرنے والے جو اسلامی بنیادوں کی رعایت کرتے ہوئے موقت اور متغیر قوانین بناتے ہیں ان کی تعین میں لگتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ جمہوریت یعنی لوگوں کا جدیت کے ساتھ اسلامی حدود و قیود کی رعایت کرتے ہوئے نمائندگان کے انتخاب کی معین شدہ خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے چننے کے لئے انتخابات میں شرکت کرنا، اور اس پر شروع انقلاب اور امام خمینی کے زمانہ سے عمل ہوتا آیا ہے۔ مثلاً اسلامی پارلیمنٹ کا انتخاب، صدر مملکت کا انتخاب، خبرگان رہبری کا انتخاب اور شوریٰ کا انتخاب۔ لہذا لوگوں کے منتخب شدہ افراد میں خاص شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

یعنی مسلمان اور اسلامی احکامات کا دلسوز ہو اور قانون بناتے وقت اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے۔ اقلیت کے نمائندوں کے علاوہ تمام نمائندوں میں ان صفات کے علاوہ مسلمان اور احکامات اسلامی کا دلسوز ہونا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ شوریٰ نگہبان ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ پارلیمنٹ کے نمائندوں نے غفلت یا غلطی سے ایسے قوانین بنا ڈالے ہوں جو اسلام کے مخالف

ہوں، شورای نگہبان کا وظیفہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو دیکھے کہ آیا اسلام سے مطابقت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر اسلام کے مطابق ہیں تو ان کی تائید کرتی ہے اور اگر اسلامی نظریات کے موافق نہیں ہیں تو پارلیمنٹ کو واپس بھیج دیتے ہیں تاکہ ان پر تجدید نظر کمرے، ہمارے ملک میں اس طرح کے قوانین سسٹامٹک ہیں جن کو سب قبول کرتے ہیں اور کوئی بھی ان کی مخالفت نہیں کرتا۔

اسی طرح قانون کو جاری کرنے والے جن میں سب سے اوپر صدر مملکت ہوتا ہے یہاں بھی اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے صدر مملکت میں ایسے صفات ہوں جو قانون اساسی میں ذکر ہوئے ہیں جو کہ اسلام سے ماخوذ ہیں ذکر ہوا ہے، اور اپنی حکومت کو چلانے میں خدا کی طرف سے اذن رکھتا ہو، اس طرح کہ لوگوں کی اکثریت کی حمایت کے بعد ولی فقیہ کے ذریعہ منصوب ہو، لہذا اس صورت میں اس کی حکومت مشروع اور جائز ہوگی، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو ہمارے ملک میں انجام پاتی ہیں۔

لوگوں کے نقش اور اسلامی نظام میں ان کے دخالت کو بہت رطو پر سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش کرتے ہیں؛ فرض کریں کہ ہم لوگ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے زمانہ میں ہوتے اور اپنے شہر میں کسی شائستہ، مناسب اور صالح شخص کو ولایت کے لئے مناسب سمجھتے اور امام علیہ السلام کی خدمت میں جا کر عرض کرتے کہ فلاں شخص ہمارے شہر میں والی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، ممکن تھا امام علیہ السلام ہمارے اس مشورے پر اس شخص کو والی کے عنوان سے منصوب فرماتے۔

اب اگر لوگوں کی اکثریت امام علیہ السلام کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرے تو بطریق اولیٰ امام علیہ السلام اس مشورہ کو قبول فرماتے، اور اس شخص کو اپنی حکومت کے اس علاقہ کی ولایت کے لئے منصوب فرماتے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ لوگوں کے کردار کی اہمیت حکومت اور حکومتی کاموں میں تھیوری کے لحاظ سے ہے اسی طرح کہ افراد تحقیق و بررسی کریں کہ قانون گذاری اور ان کے اصرار کے لئے کون افراد مناسب ہیں ان کو ووٹ دیں اور لوگوں کا ووٹ دینا گویا رہبری کو مشورہ دینا ہے اور درحقیقت ولی فقیہ سے ایک عہد و پیمان ہے کہ اگر اس کو ہمارا حاکم معین کریں تو اس کی اطاعت کریں گے، اسی وجہ سے جب امام خمینی کے زمانے میں لوگوں کی اکثریت کسی کو صدر مملکت کے عنوان سے منتخب کرتی تھی، تو حضرت امام خمینی فرماتے تھے: میں ان کو جنھیں لوگوں کی تائید بھی حاصل ہے صدر کے عنوان سے منصوب کرتا ہوں، یعنی لوگوں کے ووٹ ایک مشورہ کی طرح ہے کہ ہم اس کو قبول کریں گے۔

یہ اسلامی حکومت کی تھیوری اور نظریہ ہے جو جمہوریت کے دوسرے معنی کے لحاظ سے کوئی مخالفت نہیں رکھتا، اور ۲۰ سال سے ہمارے ملک میں نافذ ہے اور کوئی بھی مشکل نہیں آئی۔ لیکن اگر جمہوریت کے معنی یہ ہوں کہ معاشرہ میں دین کی دخالت نہ ہو سرکاری اداروں میں کوئی بھی دینی پروگرام نہ ہوں تو کیا ایسی چیز اسلام سے ہم اہنگ ہے یا نہیں؟ بے شک تیسرے معنی کی

جمہوریت جو آج کا استعمار اس کی تفسیر کرتا ہے اور دوسروں پر اس کو تحمیل کرنا چاہتا ہے، سو فی صد اسلام ایسی جمہوریت کا مخالف ہے، کیونکہ یہ اسلام کے منافی ہے۔

لیکن جمہوریت دوسرے معنی یعنی اسلام کے ان شرائط کا لحاظ رکھنا جن کو اسلام نے قانون گزار اور قانون کے جاری کرنے والوں کے لئے معین کئے ہیں، گویا لوگ صالح اور باصلاحیت افراد کو قانون گذاری اور اجرائے قانون کے لئے انتخاب کریں اور اپنی شرکت سے اسلامی حکومت سے ہمدردی اور ہمکاری کو ثابت کریں اور خود کو ملک کے مسائل میں شریک جانیں۔ جمہوریت کی یہ تصویر اسلام کی نظر میں مقبول ہے اور ہمارے ملک میں اس پر عمل ہوتا ہے، اور اگر کسی مقام پر اس خلاف ورزی ہوتی ہے دیگر خلاف ورزیوں کی طرح جو گاہے گاہے وجود میں آتی رہتی ہیں تو ہم کو اس کی پیگیری کرنا چاہئے تاکہ دوبارہ اس قسم کی خلاف ورزی کی تکرار نہ ہو۔

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے گذشتہ بحث کے دوران اسلام کے سیاسی نظریہ پر ہونے بعض اعتراضات کے بارے میں گفتگو کی تھی، جن میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر قوانین خداوند عالم کی طرف سے معین ہوں اور ان کو جاری کرنے والے بھی خدا کی طرف سے معین ہوں تو یہ جمہوریت سے ہم اہنگ نہیں ہے، ہم نے اس اعتراض کے جواب میں عرض کیا تھا کہ جمہوریت کے کوئی خاص واضح و روشن معنی بیان نہیں ہوئے ہیں۔ ”آئن“ میں جمہوریت کا آغاز اس طرح ہوا کہ شہر کے تمام لوگ شہری مسائل میں براہ راست دخالت کیا کرتے تھے۔ اور اس طریقہ کے عملی نہ ہونے اور دوسرے دلائل کی وجہ سے دانشمندیوں اور فیلسوف حضرات کو اس پر اعتراض ہوا۔ یہاں تک کہ ”رئیس“ کے زمانہ سے خود پسند اور ظالم حکومتوں کے مقابلہ میں جمہوریت کی دوسری تصویر پیش کی گئی، اور مغرب زمین کے بڑے بڑے فیلسوف حضرات اس پر تنقید کرنے لگے، یہاں تک کہ اس کی ایک قابل قبول شکل نکالی گئی اور اس کے بعد دوسرے ملکوں میں جانے لگی۔ اس کی موجودہ صورت یہ ہے کہ لوگ فقط پارلیمنٹ کے ممبران کے انتخابات میں شرکت کرتے ہیں، اور قوت مجری (صدر یا وزیراعظم) یا مسئول قوت قضائہ (رئیس قضاة) کے انتخاب میں لوگوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اس نظریہ میں حکومت کی کوئی خاص شکل و صورت معین نہیں ہوتی اسی وجہ سے مختلف حکومتیں بادشاہی، پارلیمنٹی، یا ریاست جمہوری حکومتیں اپنے کو جمہوری حکومت تصور کرتی ہیں، کیونکہ اس حکومت میں کسی نہ کسی طریقہ سے لوگوں کا کردار ہوتا ہے۔

۲۔ سیکولر جمہوری اور اس کے فلسفہ کی وضاحت

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، مغربی ممالک کے سیاست داں حضرات نے جمہوریت کی ایک نئی شکل پیش کی ہے کہ جس جمہوریت میں ”لائزم“ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو لوگ بھی حکومت میں دخالت رکھتے ہوں اور دوسری طرف یہ کہ کسی بھی سرکاری دفتر میں دین کی کوئی نشانی نہ پائی جائے۔

دین نہ تو قانون گذاری میں کوئی دخالت ہو اور نہ ہی قانون کے جاری کرنے والے دین کے نام پر حکومت کریں، یہاں تک کہ جو شعبہ جات حکومت سے وابستہ ہیں ان میں بھی دین کی کوئی نشانی نہ ہو، دینی اعتقاد یا اس کی طرف داری کا کوئی وجود نہ ہو۔ اسی وجہ

سے بعض حکومتوں میں لڑکیوں کو کالج میں باپردہ جانے سے روکا جاتا ہے، کیونکہ دینی نشانی کے ساتھ کالج میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اس کی حمایت کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت کے یہ جدید معنی سو فی صد دین کے مخالف ہیں، اور ایسی حکومتوں کو جمہوریت کا نام دینے کے بجائے ”بے دینوں کی ڈکٹیٹری“ کہنا مناسب ہے، کیونکہ یہ لوگ جمہوریت کے نام پر معاشرہ میں دینی اعتقادات اور مذہبی امور کو انجام دینے کی اجازت نہیں دیتے، اور سرکاری دفاتر میں دینی امور پر عمل کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔

یہ طریقہ کار کہ جس کی کوئی فلسفی بنیاد نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی فلسفی نظریہ ہے، لیکن دشمنان دین کا مقصد یہ ہے کہ مغربی اور یورپین ممالک میں دین، خصوصاً اسلام کو پھیلنے سے روکا جائے، اور اپنی تمام تر کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ممالک یہاں تک کہ اسلامی ممالک میں جمہوریت کے نام پر اسی جمہوری انداز کو اپنائیں کہ جس کا نمونہ الجزائر اور ترکی میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ڈکٹیٹری کی سخت شکل سے نکالنے کے لئے اور اس کی جگہ جمہوریت کی نرم و ملائم شکل پیش کرنے کے لئے ایک فلسفہ تراشی شروع کی، تاکہ دینداروں کے اعتراضات کا مقابلہ نہ کرنا پڑے، اور ان کے غصہ کو کم کر سکیں، اسی وجہ سے حکومتی دفاتر میں دینی نشانیاں نہ ہونے کی توجیہ اور وضاحت کرتے ہیں اور فلسفہ کا راہ حل پیش کرتے ہیں کہ (جیسا کہ حقوق بشر کے نشریہ میں بھی موجود ہے) تمام انسان انسانیت میں برابر ہیں اور ان میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے اور ہمارے پاس درجہ اول یا درجہ دوم کے انسان نہیں ہیں، اسی بنا پر اگر کسی دین کے لئے کسی امتیاز کے قائل ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس دین کو دوسرے دیگر ادیان پر ترجیح دی اور اس کا سب سے بڑا درجہ مانا۔ پس کسی دین کا احترام کرنا یا سرکاری دفاتر میں اس کے دینی رسم و رواج کی اجازت دینا، گویا اس دین کو ایک خاص امتیاز دینا ہے جبکہ ہم تمام انسان برابر ہیں اور کسی ایک کے دوسرے پر امتیاز کے قائل نہیں ہیں!

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکومتیں کس طرح اجازت دیتی ہیں کہ جس طرح چاہیں عمل کرے جس طرح کا کپڑا پہننا چاہیں پہنیں، لیکن دیندار لڑکیوں کے باحجاب ہونے پر پابندی ہے، درحقیقت یہ بعض شہریوں کی آزادی کی نفی اور ان کے حقوق کی پامالی ہے۔

۳۔ سیکولر نظام کی فلسفی بنیاد میں مغالطہ

بہر حال، وہ اپنی کارگردگی کے لئے مذکورہ توجیہ وضاحت پیش کرتے ہیں، لیکن اس میں ایک بہت بڑا مغالطہ اور غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ تمام انسانوں کا انسانیت میں برابر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام شہری، شہری ہونے میں برابر ہوں۔ کیونکہ تمام انسانوں کا انسانیت میں برابر ہونے کی بحث کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسلام نے تاکید کی ہے، جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾^(۱)

”لوگوں ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم ہی نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر لے، اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو“

قرآن کریم واضح طور پر انسانوں کے درمیان فرق اور امتیاز کی نفی کرتا ہے اور ان کو ایک آدم کی اولاد کہتا ہے کہ جو آپس میں بھن بھائی ہیں، اور ان میں کوئی فاصلہ و امتیاز نہیں ہے۔ یہ مطلب کسی بھی آسمانی کتاب میں اس کیفیت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے۔ اور ہم بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے معتقد ہیں کہ تمام انسان برابر ہیں اور انسانیت درجہ اول اور دوم نہیں رکھتی، مشہور و معروف شاعر سعدی کا یہ شعر بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہیں

بنی آدم اعضای یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک گوهرند

لہذا جوہر انسانیت تمام انسانوں میں برابر ہے اور انسانوں میں درجہ اول اور دوم نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام انسان تمام چیزوں میں برابر ہیں یہاں تک کہ ایک ملک کے تمام شہری تمام سہولتوں میں برابر ہوں۔ اور تمام دنیا میں اس کو ایک اصل کے عنوان سے بین الاقوامی حقوق میں قبول کیا گیا ہے کہ کسی ملک کی تالیف (نیشنلٹی) خاص شرائط اور خاص سہولتیں رکھتی ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اپنے ملک سے مہاجرت کرے اور چند سال کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرے، اس ملک کو فیض پہونچائے اور وہاں کے لوگوں کیلئے کافی خدمات انجام دے؛ لیکن پھر بھی اس کو وہاں کی نیشنلٹی اس کو نہیں ملے گی۔ چونکہ مہاجر افراد کو نیشنلٹی ملنے کے لئے خاص شرائط و قوانین درکار ہوتے ہیں۔ اور جس وقت اس کو نیشنلٹی دیں بھی تو ممکن ہے اس کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دیں، اور اس کو اول درجہ کی شہریت والی سہولتیں اس کو نہ دیں۔ یہ مسئلہ تمام دنیا میں پایا جاتا ہے در حالیکہ تمام انسانوں کو انسانیت میں برابر مانا جاتا ہے، لیکن شہریوں کے حقوق اور سہولتیں نیشنلٹی کے لحاظ سے برابر نہیں ہیں، اور نیشنلٹی کا اول درجہ اور دوسرا درجہ ہے، لہذا یہ کہنا محض ایک مغالطہ ہے کہ تمام انسان چونکہ انسانیت میں شریک ہیں لہذا انسانیت کا درجہ اول و دوم نہیں، لیکن شہریت میں دو درجہ ہو سکتے ہیں اور اس کو اسلام نے بھی قبول کیا ہے۔

ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے اور توجہ رکھنا چاہئے کہ مغربی ڈکٹیٹری حکومتیں اپنے کو جمہوری حکومتیں کھلاتی ہیں، تاکہ اپنے نام مشروع مقاصد میں کامیاب ہو جائیں، ہمیں ان کی فریب کار شکل سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے، حقیقت میں جمہوریت کی جدید شکل ایک ڈکٹیٹری ہے جس کی وجہ سے مسلمان عورتیں حجاب اور دوسرے مذہبی مراسم سے محروم ہیں۔ جبکہ ”حقوق بشر نشریہ“ میں موجود ہے

کہ دین آزاد ہے اور سبھی لوگ دینی وظائف پر عمل کرنے میں آزاد ہیں، اس میں یہ کوئی قید و شرط نہیں ہے کہ سرکاری دفاتر میں کوئی مذہبی کام ہو یا نہ ہو، لیکن اپنی مرضی کے مطابق اس کی تفسیر و معنی کرتے رہیں اور جنگ کو صلح کے نام سے اور دوسروں پر ظلم کو حقوق بشر کی حمایت کے نام سے جائز جانتے ہیں، اور ہم آپ ہر روز ان کے ظلم و جور اور دھوکہ دہڑی کو دیکھتے رہتے ہیں۔

۴۔ مدیریت کے میدان میں جمہوریت کا دوسرا رخ

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ جمہوریت کے تین معنی ذکر کئے گئے ہیں کہ ان سب کا تعلق فلسفہ سیاست سے ہے، لیکن بعض مولفین جو خود کو دینی روشن فکر کہلاتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت کا فلسفہ سیاست سے کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ جمہوریت مدیریت سے مربوط ہے، اور اس کو حکومت یا حکومتی ادارہ سے کوئی ربط نہیں ہے، اور اس بحث کی جگہ سیاسی فلسفہ میں نہیں ہے۔ ہم ان لوگوں کے جواب میں مختصر طور پر اتنا عرض کرتے ہیں: کہ فلسفی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیاسی فلسفہ کے بارے میں ایسی کوئی کتاب نہیں ہے کہ جس میں جمہوریت سے بحث نہ کی گئی ہو، اب اگر جمہوریت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر سیاسی فلسفوں کی کتابوں میں اتنی زیادہ بحث کے کیا معنی؟ ان کے دعویٰ کا راز یہ ہے کہ جمہوریت کی جو نئی تصویر مغربی ممالک کے لیبرل دانشمندوں اور مولفوں نے پیش کی ہے تاکہ اس کو سیاسی مفہوم سے خارج کر دیا جاسکے، اور اس کو دوسرے اجتماعی میدانوں میں داخل کر دیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جمہوریت صرف کسی حاکم کی قدرت کو محدود کرنے یا چند مخالف گروہوں کے درمیان سازش (خلاف قانون تال میل) کرانے یا صرف حکومتی اداروں سے مربوط نہیں ہے بلکہ کسی بھی مدیریت شعبہ میں ہو سکتی ہے: فرض کیجئے اگر کسی کارخانہ کے مختلف شعبوں کے مدیروں کے درمیان اختلاف ہو جائے، تو ان میں اتفاق کرانا ضروری ہے کیونکہ اگر یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے تو اس کارخانہ کی دیوالیہ نکل جائے گا، لہذا اس کارخانہ کے منافع کو فراہم کرنے کے لئے سبھی کو ایک دوسرے سے مشورہ کریں اور ان میں اتفاق ہو یا یہ کہ اکثر لوگوں کی رائے کو مانا جائے، اس طریقہ کار کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ جمہوریت کسی سازمان کے اندر ہوئے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ہے، اور جمہوریت کے یہ معنی سیاسی فلسفہ سے خارج ہے اور مدیریت کے دائرے میں شامل ہے۔ اگرچہ حکومت بھی چونکہ معاشرہ کی کثیر تعداد کو ادارہ کرنا بھی ایک مدیریت کام ہے، لیکن بہر حال اس کے خاص حدود ہیں، یہ لوگ جمہوریت کے معنی میں وسعت دینے کے لئے کہتے ہیں کہ اگر دو گروہوں میں اختلاف ہو جائے اور مذکورہ طریقہ سے آپس میں سازش کر لیں تو اسی کا نام جمہوریت ہے۔ اس بارے میں مزید وضاحت اس طرح ہے کہ دو گروہوں کے درمیان اختلاف کی صورت میں ممکن ہے کہ ایک گروہ زیادہ مضبوط ہو اور دوسرے پر

مسلط ہو جائے اور اپنے نظریہ کو اس پر زبردستی تحمیل کر دے، تو ظاہر ہے کہ یہ طریقہ جمہوری نہیں ہے؛ لیکن اگر آپس میں اتفاق ہو جائے اور آخر کار اکثریت کے نظریہ کو تسلیم کر لیں تو گویا انھوں نے جمہوریت کو تسلیم کر لیا ہے۔

البتہ ہم کسی اصطلاح کو بنانے یا کسی علمی اصطلاح میں وسعت دینے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ درحقیقت یہ معنی سیاسی میدان سے مربوط ہیں جس کو دوسرے مسائل میں بھی وسعت دی گئی ہے۔ اور اجتماعی علوم میں ایسے بہت سے معنی موجود ہیں جن کو شروع میں کسی خاص میدان میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن ان میں وسعت دینے کے بعد ان کو دوسرے میدانوں میں بھی استعمال کیا جانا لگا، مثال کے طور پر آپ ”اسٹریٹجی“ (Strategie) (یعنی لشکر کشی) کے لفظ سے آگاہ ہیں جو تمام ہی محافل میں مشہور ہے۔ کہ دراصل اس کے معنی ”سوق الجیشی“ (لشکر کشی) کے ہیں اور اس کو فوجی سطح پر بولا جاتا ہے اور اسٹریٹجسٹ اس کو کھا جاتا ہے جو جنگ کا نقشہ اور اس کو کمانڈ کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، مثلاً کسی حملہ کا پلان بناتا ہے، اور اس حملہ کی راہنمائی کرتا ہے، یہ لفظ جنگی فوج کی ہدایت یا اس کے طریقہ حرکت یا جہاں سے حرکت ہوتی تھی یا جہاں پر پڑاؤ ڈالا جاتا تھا یا جہاں سے حملہ شروع ہوتا تھا اس علاقہ کو سوق الجیشی یا اسٹریٹجک علاقہ کھا جاتا تھا۔

اس کے بعد اس لفظ میں وسعت دی گئی اور دوسرے علوم میں بھی اس کو استعمال کیا جانے لگا، مثلاً خود ہماری سیاسی بحث میں بھی ”اسٹریٹجک سیاست“ ایک اصطلاح ہے۔ یہاں تک کہ تعلیمی شعبہ کی بعض مدیریٹوں میں اسٹریٹجک مسائل بیان ہوتے ہیں، اور ہمارے قانون اساسی میں بھی ایسے بہت سے اصول ہیں جو اسٹریٹجک پہلو رکھتے ہیں، اس اصل کے مانند جو یہ کہتی ہے کہ ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے۔ لیکن بعض ان لوگوں پر تعجب ہے کہ جو قانون اساسی کا دم بھرتے ہیں اور اسی کو سند بناتے ہیں کہ گویا قانون اساسی قرآن سے بالاتر کوئی چیز ہے لیکن کبھی ایسی مخالفت کرتے ہیں کہ گویا قانون اساسی کی ان کی نظریں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جہاں پر قانون اساسی میں لوگوں کی رائے کے احترام کے بارے میں ملتا ہے تو گویا قرآن مجید کو بھی ان کے برخلاف بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ پیغمبر اور ائمہ معصومین اور امام زمانہ علیہم السلام کو بھی لوگوں کی رائے کی مخالفت کا حق نہیں ہے؟!۔

لیکن جب قانون اساسی یہ کہتا ہے کہ ملک کے قوانین اسلامی قوانین کے مطابق ہونے چاہئے، تو وہ اس کو بھول جاتے ہیں اور اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معیار لوگوں کی رائے ہے!!

کیا اسی قانون اساسی میں نہیں ہے کہ اس ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے؟ لہذا اگر کوئی چیز اسلامی نظر سے حرام ہو تو پھر آپ قانون اساسی کو سند بنا کر کس طرح اس کو جائز کر سکتے ہیں؟ اس قانون اساسی کے پیش نظر کہ جو قوانین اسلام کی رعایت پر اتنی تاکید کرتا ہے یہ کھ کر کہ اخبارات آزاد ہیں، کس طرح اسلامی مقدسات اور اسلام کے ضروری احکامات کی توہین کی جائے؟

اخبارات خاص قوانین کے تحت آزاد ہیں نہ یہ کہ قانون سے بڑھ کر آزاد ہو جائیں۔ جب قانون اساسی اسلامی مقدسات کے احترام کو واجب کرتا ہے اور ضروریات دین کا انکار اور اسلامی قوانین کا مسخرہ کرنا، نیز خدا و پیغمبر کا مذاق بنانا جو مرتد ہونے کا سبب ہے تو پھر اخبارات کے قوانین اس کو کس طرح جائز کر سکتے ہیں۔ قانون اساسی اس وجہ سے لکھا گیا تاکہ اسلامی جمہوری کے مفہوم کو واضح و روشن کر سکے۔

۵۔ جمہوری اسلامی میں اسلام و ولایت فقیہ کا سب سے اہم مقام

انقلاب کی کامیابی کے پہلے سال یعنی ۱۳۵۸ء شمسی میں جمہوری اسلامی کا ”رفرنڈم“ ”Referendum“ (ہمہ پرسی) ہونے والا تھا جس میں حکومت کی شکل و صورت کے لئے خاص نشانات پیش کئے گئے تاکہ سبھی لوگ اس کے حساب سے ووٹ ڈالیں۔ ان میں سے بعض جمہوری، جمہوری ڈیموکرائٹک، جمہوری ڈیموکرائٹک اسلامی، جمہوری اسلامی تھے۔ لیکن امام خمینی نے فرمایا: ”جمہوری اسلامی“ نہ ایک لفظ کم نہ زیادہ، اور اس میں ۹۸ فی صد لوگوں نے ”جمہوری اسلامی“ کو ووٹ دئے، یعنی اسلامی حکومت کی قید و شرط کو نہیں ہٹایا جاسکتا اور اس کی جگہ ”ڈیموکرائٹک“ لفظ کو نہیں رکھا جاسکتا۔ اور اگر ڈیموکرائٹک کا لفظ اسلام سے بالاتر کوئی چیز تھی تو کیوں امام خمینی نے اجازت نہ دی کہ اس لفظ کو اسلامی حکومت کے ساتھ اضافہ کیا جائے؟

اور اگر جمہوریت اور ڈیموکریسی میں کوئی فرق نہیں ہے تو جب جمہوریت ہے تو ڈیموکریسی بھی ہے، لہذا ڈیموکریسی لفظ کے لانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پس جب بعض لوگ ”جمہوری ڈیموکرائٹک“ پر تاکید و اصرار کر رہے تھے، تو امام خمینی نے ان کی مخالفت کی؛ معلوم یہ ہوا کہ ڈیموکرائٹک کے مختلف معنی ہو سکتے تھے اور جمہوریت میں بعض چیزوں کا اضافہ ہو سکتا تھا کہ جن کی نفی کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر لوگوں کے ووٹوں اور ان کے نظریات پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال ہماری حکومت، جمہوری اسلامی ہے کہ جن کے ستون لوگوں کے شانوں پر ہیں اور انہیں لوگوں نے انقلاب کیا ہے اور اپنے انقلاب کی اسلامی قوانین کے تحت حفاظت کرتے ہیں۔ مرحوم شہید استاد مطہری اس سلسلہ میں ہماری بحث کو وضاحت کرتے ہوئے بیان دیتے ہیں کہ:

”جمہوریت حکومتی شکل کو بیان کرتی ہے اور اسلامیت حکومت کے محتوی کو بیان کرنے والا ہے“ حکومت کا محتوی یہ ہے کہ اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے لیکن حکومت کی شکل و صورت بادشاہت کے مد مقابل ہے۔ لہذا ہماری حکومتی بادشاہی نہ ہوگی، بلکہ اس کی شکل جمہوری اور اس کے قوانین اسلامی ہونگے۔ اصل احکام اسلامی ہوں گے اور اسلام سے پہلے یا اسلام کے بعد کوئی چیز نہ ہوگی۔

حضرت امام خمینی مکرر فرمایا کرتے تھے:

جمہوری اسلامی میں ہر حکومت یا کسی بھی حکومتی پوسٹ کی مشروعیت ولی فقیہ کی اجازت پر موقوف ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس پر ولایت فقیہ کی تھیوری قائم ہے، اور ہم نے اس مسئلہ کو فقہاء کرام اور سب سے زیادہ امام خمینی سے حاصل کیا ہے، جس پر عقلی و نقلی دلیلیں بھی قائم ہیں۔ کیونکہ ولی فقیہ امام معصوم (ع) کا جانشین ہوتا ہے اور تمام چیزوں کو الہی ارادے کے تحت ہونا چاہئے اور چونکہ ولی فقیہ امام معصوم (ع) اور خداوند عالم کی طرف سے اجازت رکھتا ہے، لہذا کسی بھی نظام کی مشروعیت ولی فقیہ کی اجازت پر موقوف ہے۔

البتہ یہ طریقہ ان لوگوں کے نظریات سے موافق نہیں ہے جو مغربی تمدن سے متاثر ہیں۔ اور ہماری اس نظریہ کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ توحید کے نظریہ سے لیا گیا ہے اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہے؛ نہ یہ کہ علماء کرام کی صنف سے اخذ شدہ ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے وضاحت کی تھی کہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت تقاضا کرتی ہے کہ قانون گذاری اور نفاذ قانون دونوں خدا کی اجازت سے ہونے چاہئے، اور اگر اس کے علاوہ ہے تو یہ ایک قسم کا شرک ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس معاشرہ میں لوگ کوئی کردار نہیں رکھتے، اس حکومت میں لوگوں کا کردار (اسلام کے معین کردہ پہلو سے) سو فی صد ہے اور اس سلسلہ میں کوئی دوسری چیز اس کے بدلہ نہیں رکھی جاسکتی، لیکن مشروعیت اور مقبولیت میں ایک فرق کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ”رئسانس“ کے بعد سے مغربی نظریہ کے لحاظ سے حقوقی و فلسفی اور اجتماعی گفتگو میں خدا یا دین کی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے، البتہ مغربی نظریہ سے ہماری مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں کہ جو مغربی ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں، بلکہ ہماری مراد وہ نظریہ ہے، جو مغرب میں موجودہ نظام کے نزدیک قبول شدہ ہے۔ مثلاً جس وقت حقوق بشر کے نثریہ میں انسانوں کے حقوق کی بات آتی ہے تو اس میں تو خدا سے انسانی رابطہ کا بیان ہے ہی نہیں۔ اور اگر کسی مذہب کی بات ہوتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہر انسان مذہب کو اختیار کرنے میں آزاد ہے، وہاں یہ کوئی گفتگو نہیں ہوتی کہ کون سی چیز حق ہے یا کون سی چیز باطل ہے، خدا ہے یا نہیں، ایسی چیزیں بالکل بیان نہیں ہوئی ہیں۔

اور جس وقت اجتماعی حقوق منجملہ حقوق اساسی، حقوق شہری یا کیفری حقوق کی بات ہوتی ہے تو اگر کسی جگہ یہ حقوق خدا سے مربوط ہوتے ہیں تو ان کی کوئی گفتگو نہیں ہے، وہاں بالکل یہ بات بیان نہیں ہے کہ خدا بھی لوگوں پر حق رکھتا ہے یا نہیں؟ یا خدا کی طرف سے انسانوں پر کوئی تکلیف ہے یا نہیں؟ انھوں نے حقوقی گفتگو میں خدا کے حقوق کی بالکل کوئی بات نہیں کی، لیکن اگر ہم چاہیں اپنے اعتقادات کی بنا پر اسلامی تعلیمات اور حقوق الہی پر بنی اپنے ملک کے حقوق کو معین کریں تو ان کو ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم مسلمان اور موحد ہونے کے لحاظ سے معتقد ہیں کہ تمام حقوقی مسائل، اجتماعی، شہری اور سیاسی حقوق میں تمام

جگھوں پر خدا کا لحاظ رکھیں اور تمام حقوق سے بالاتر خدا کے حق کو مانیں، اور اس کے حق کے بدلے میں ہم پر کچھ تکالیف عائد ہوتی ہیں جن کو ہمیں انجام دینا چاہئے۔

دوسری طرف یہ کہ صرف انسانوں کے حقوق کی ہی بات نہیں ہونا چاہئے بلکہ حق و تکلیف ساتھ ساتھ بیان ہونے چاہئے اور سب سے اہم خدا کے معین کردہ تکلیف ہے۔ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا حق یہ ہے کہ تمام انسان سیاسی و اجتماعی مسائل میں خدا کے احکام کو قبول کریں۔ اور ہم چونکہ مسلمان ہونے کے ناطے یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے اعتقادات کی بنا پر اپنے ملک میں قوانین بنائیں اور ان پر عمل کریں۔ اور ہمارے قانون اساسی میں یہ کام ہوا ہے اسی وجہ سے ہمارے نزدیک یہ اہم اور اول درجہ رکھتا ہے اور قانون اساسی کا احترام، اسلام کے احترام کے مانند ہے۔

۶۔ اسلام کی مورد قبول جمہوریت

جمہوریت کے ایک معنی اسلام کے موافق ہے اور ایک معنی (یعنی تیسرے معنی) اسلام کے سو فی صد مخالف ہے۔ جمہوریت کے دوسرے معنی خاص شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے لیکن بغیر کسی قید و شرط کے قبول نہیں ہے۔ اور چونکہ اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے لہذا قانون گذاری میں کسی بھی مرکز کو یہ حق نہیں ہے کہ اسلام کے ضروری احکام کی مخالفت کرے اور یہ ایک ایسی اصل ہے جو دینی لحاظ سے مقبول ہے، لہذا اس اصل کو قبول کرتے ہوئے ہم جمہوریت کو قبول کرتے ہیں؛ لیکن اگر اس اصل کو نہ مانا جائے اور جمہوریت کا یہ مطلب ہو کہ الہی حدود اور احکامات اسلامی کی مخالفت کو بھی جائز کر لیا جائے تو پھر ہم اس جمہوریت کو سو فی صد رد کرتے ہیں۔ اور جمہوریت کے اختلاف کو حل کرنے کے طریقہ کی حد تک لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ جہاں تک اختلافات کو حل کرنے کے لئے اسلامی احکامات کافی ہیں تو یہ مقدم ہیں لیکن اگر کوئی ایسی جگہ ہو کہ اسلام نے اس کے راہ حل کے لئے کوئی معین راستہ پیش نہ کیا ہو اور کوئی باصلاحیت مرجع نہ ہو تو پھر اکثریت کی رائے کو مانا جائے گا، یعنی اگر کسی مقام پر کوئی دلیل شرعی یا تحقیقی نظریہ موجود نہ ہو یا اس اختلاف کو حل کیا جاسکے۔

مثلاً کچھ لوگ قانون کے تحت کسی مہم کام کے لئے کوئی شورائی بنائیں اور تمام لوگ اسلام کا اعتقاد رکھتے ہوں اور اسلامی قوانین کی رعایت کریں لیکن کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے اور اکثر لوگوں کی کچھ نظر ہو اور اقلیت کی کچھ نظر، اور ان دو نظریات کو ترجیح دینے کے لئے بھی کوئی راستہ نہ ہو تو یہاں پر اکثریت کی نظر مقدم ہے اور اکثریت کی نظر کی مخالفت کرنا ترجیح مرجوح ہوگی (جو قبیح ہے)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر کسی مقام پر کوئی مرجع نہ ہو اور اکثریت کی نظر سے ہمیں ظن (گمان) حاصل ہو جائے تو یہ ظن ہمارے نزدیک معتبر اور مرجح ہے، اور اگر اکثریت کی وجہ سے ظن حاصل نہ ہو تو اس کو ترجیح دینا بغیر کسی مرجح کے ہوگا جو عقلاً مذموم اور نادرست

ہے۔ یہ طریقہ بس اسی حد تک معتبر ہے، لیکن اس طریقہ سے ناجائز فائدہ اٹھانا صحیح نہیں ہے کہ لوگوں کی اکثریت کو اقلیت کے مقابلہ میں کیا جائے، مثلاً فرض کیجئے ایک فوجی نقشہ بنانے کے لئے وہ افسر معین ہوئے اور دوسری طرف ایک ہزار عام آدمی ہوں کہ جن کو فوجی مسائل سے بالکل بھی کوئی آشنائی نہ ہو، اگر عام لوگوں کی رائے پر توجہ کی جائے اور ان کو مانا جائے اور ان ماہر افسروں کی رائے پر عمل نہ کیا جائے تو یہ کام عقل سے دور ہے۔ لہذا جمہوریت اختلافات کو حل کرنے کے لئے خاص شرائط کے ساتھ معتبر ہے؛ لیکن ہر اکثریت کو ہر اقلیت پر ترجیح دی جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

حوالے

انسانیت میں اصل وحدت کی تحقیق اور شہریوں کی اتباع

۱۔ اسلامی نقطہ نظر کسی کا صاحب حق ہونا

فلسفہ سیاست کی بحثوں میں فلسفہ حقوق بہت قریب ہے اور دونوں میں مشترک یا مشابہ مسائل بیان کئے جاتے ہیں مثال کے طور پر سیاست کی بحث میں حقوقی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے اسی بنیاد پر ہم نے فلسفہ حقوق (یعنی انسانوں کا انسانیت کے اعتبار سے اہم ہونا) کی بحث میں اس سے پہلے والے جلسہ میں اشارہ کیا تھا اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ اگرچہ تمام انسان انسانیت میں مشترک ہیں اور اسلام کی نظر میں انسانوں کے مابین پہلے طبقہ اور دوسرے طبقہ کے انسان نہیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اجتماعی مسائل میں تمام انسان حقوق اور تکالیف کے اعتبار سے مساوی ہیں، اس بارے میں جو افراد مکمل طور پر ان مسائل سے آگاہ نہیں ہیں یا ان کے ذریعہ سوء استفادہ کرتے ہیں تاکہ اسلام اور انقلاب کے مخالف نظریات رکھتے ہوئے بھی اپنے کو مسلمان اور انقلابیوں کی فہرست میں کھڑا کر سکیں اور اس کی وجہ سے انقلاب سے فائدہ اٹھا سکیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ انقلاب کے خلاف مطالب تلاش کر سکیں انھوں نے اس بارے میں مغالطہ کیا ہے کیونکہ معاشرہ میں پہلے طبقہ اور دوسرے طبقہ کے انسان نہیں ہیں لہذا تمام افراد کے حقوق برابر ہونا چاہیئے جیسے گروہ بنانے کے لئے اقدام کرنا اور ملک ملت میں کسی بلند عہدے کا پانا۔ ان کے نظریہ کے مطابق ہر شخص چاہے وہ کسی بھی عقیدہ کا تابع ہی کیوں نہ ہو وہ صدر مملکت یا وزیر اعظم ہو سکتا ہے اور کوئی بھی پارٹی بنا سکتا ہے۔

چونکہ ان کا استدلال یہ ہے کہ جب انسانوں کے مابین پہلا طبقہ اور دوسرا طبقہ نہیں ہے اور تمام انسان برابر ہیں اور ہم جو انقلاب اسلامی اور قانون اساسی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں تو ہم کو یہ حق ہے کہ تمام حقوق میں برابر حصہ ملے اس مغالطہ کے بارے میں یہ عرض کر دیا گیا ہے کہ صحیح ہے کہ انسانوں میں پہلا طبقہ اور دوسرا طبقہ نہیں ہے، یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن تمام حقوق و وظائف اصل انسانیت میں سب کے درمیان مشترک نہیں ہیں بلکہ بعض حقوق و وظائف میں اصل انسان کے علاوہ دوسری خاصیت ہوتی ہیں، بہر حال کچھ افراد نے اس مطلب کو درست نہیں سمجھا یا اپنی کسی غرض کی وجہ سے اس مطلب کی غلط تفسیر کی، اور کہا کہ فلاں صاحب کہتے ہیں کہ ہم شہریوں کے مابین پہلا طبقہ اور دوسرا طبقہ موجود ہے اور شہریوں کے پہلے طبقہ سے مراد روحانیت ہے اور بقیہ دوسرے شہری دوسرے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

حقیر اس شبہ کے لئے اس وقت کے جلسہ کو مخصوص کرتا ہے، قارئین کرام اس موضوع کے واضح ہونے کے لئے جو بحث حقوق عالم کے فلسفیوں کے مابین بیان ہوتی ہے اور اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں اس کی طرف توجہ دیجئے وہ بحث یہ ہے کہ اصولی طور پر ریشہ حق کیا ہے؟ یعنی کس طرح کوئی صاحب حق بنتا ہے، یہ جو کھا جاتا ہے کہ فلاں شخص حق رکھتا ہے یا نہیں رکھتا یہ حق کھاں سے پیدا ہوتا ہے؟ ہم کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ کوئی شخص فلاں کام کو انجام دینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں رکھتا؟ فلسفہ حقوق کے مختلف، جیسے مکاتب حقوق تاریخی، پوزیٹوئزم حقوق طبعی اور دوسرے حقوقی مکاتب ہر ایک نے اس کے مختلف جوابات دئے ہیں۔

اسلام کا اس بارے میں خاص نظریہ ہے یعنی اسلام کی نگاہ میں تمام حقوق دراصل خداوند عالم کی طرف بازگشت ہوتی ہے۔ چونکہ ہستی اسی کے کرم سے ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ اور تکوینی میں ہمارا وجود اور کچھ ہمارے پاس ہے وہ خدا کے لئے ہے (اِنَّا لَسَدُّ) اور تمام چیزیں (مِنْ اِلٰهِ) ہیں اسی طرح تشریعی امور بھی خدا کی طرف سے مستند ہونے چاہئیں۔ حقوق کے پیدا ہونے کے بارے میں یہ ہمارا کلی نظریہ تھا جس کو ہم نے مختصر طور پر بیان کیا ہے کہ خداوند عالم تمام انسانوں کو مساوی حقوق عطا کرتا ہے؟ یا بعض بندوں کو خاص حق عطا کرتا ہے کہ دوسروں کو وہ حق نہیں دیتا؟ مختصر طور پر ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے انبیاء کو جو حقوق عطا کیئے ہیں وہ دوسروں کو عطا نہیں کیئے ہیں اس نے ماں باپ کو کچھ حقوق عطا کیئے ہیں اور اولاد کو دوسرے حقوق دیئے ہیں۔

لیکن کیا (معاذ اللہ) خداوند عالم کا قانون بغیر حساب و کتاب کے ہے یعنی خداوند عالم بغیر کسی معیار و ملاک کے کسی کو کوئی حق دیتا ہے اور دوسرے کو وہ حق عطا نہیں کرتا ہے یا اس کی نظر میں کوئی خاص ملاک و معیار پایا جاتا ہے؟ اور اگر کوئی ملاک و معیار ہے تو کونسا ملاک ہے؟ تو جن حقوق کو خداوند عالم اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے وہ ان خاص وظائف کی وجہ سے ہے جن کو وہ انجام دیتے ہیں۔ ہم کو خداوند عالم نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ ہم اپنے ارادہ و اختیار سے کمال حقیقی اور سعادت ابدی کی طرف حرکت کریں، لہذا ہم پر ایک کلی فریضہ عائد کیا گیا ہے جسکو اسلامی ثقافت میں خدا کی عبادت سے کھا جاتا ہے اور خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَمْ عَهْدَ اِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ اَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَاِنْ اَعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ (۱)

”اے آدم کی اولاد کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ دیکھو صرف میری عبادت کرنا بھی (نجات کی) سیدھی راہ ہے“

اور دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْهُمْ اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ (۲)

”اور ہم نے انہیں میں سے (ایک صالح کو) رسول بنا کر ان لوگوں میں بھیجا (اور انھوں نے اپنی قوم سے کہا) کہ خدا کی عبادت کرو۔“

نتیجہ کے طور پر تمام انبیاء کی دین کی طرف دعوت پرستش خدا سے شروع ہوتی ہے اور تمام انسانوں کے لئے یہ کلی وظیفہ اقتضاء حقوق رکھتا ہے یعنی جب انسان اللہ سے قریب ہونا چاہتا ہے تو ملازم چیزیں اس کے اختیار میں ہونی چاہئے اسی طرح معاشرہ میں کچھ راستے اور قوانین ایسے ہونا چاہئیں جو ان کی راہنمائی کر سکے۔ جب انسان خداوند عالم کی طرف بڑھنا چاہتا ہے تو اس میں حیات ہونا چاہئے تو معلوم ہوا کہ حق حیات پہلا حق ہے۔ دوسرا حق راستہ چلنے کے لئے آزادی ہونا چاہئے اس کے لئے کہ یہ راستہ اجباری نہیں ہے بس انسان کو کسی راستہ کو انتخاب کرنے کے لئے آزاد ہونا چاہئے، تیسرا حق اس مادی دنیا کی نعمتوں کو استعمال کرنا ہے اس لئے اگر انسان اس دنیا کی نعمتوں سے استفادہ نہیں کرے گا تو زندگی نہیں گذار سکے گا اور اپنی حیات کو باقی نہیں رکھ پائے گا، وہ اپنی حیات کو باقی رکھنے اور کمال حقیقی وابدی اور خدائے ہستی تک مکمل سیر کے لئے اس دنیا کی کھانے اور پینے کی چیزوں سے استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہے، خداوند عالم نے جن خواہشات کو انسان میں رکھا ہے ان میں سے جنسی شہوت بھی ہے اور انسان کو اس سے استفادہ کرنے کا حق ہے، اس لئے اس کو اپنے لئے ہمسر کی تلاش کرنا ہوگی، چونکہ انسان خود مشاہدہ کر رہا ہے کہ حقوق اور وظیفہ آپس میں مربوط ہیں۔

گذشتہ بحثوں میں ہم نے حق اور وظیفہ کے سلسلہ میں یہ اشارہ کیا تھا کہ ہم پر خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم ہے کہ ہم خدا کی طرف چلیں اور اس کی اطاعت کریں، اور اس کے مقابلہ میں ہمارے کچھ حقوق ہیں جن سے ہم استفادہ کرتے ہوئے اس راہ کو ہموار رکھیں۔

اس بنیاد پر معاشرہ میں جو کچھ لوگوں کی عمومی زندگی میں ان کے خداتک پہنچنے میں رکاوٹ بن رہا ہو تو اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کی روک تھام کرے اور حکومت کو چاہئے کہ وہ اسلامی معاشرہ سے ان چیزوں کو دور کرے جو خدا کی خوشنودی میں حائل ہو رہی ہیں، اسی طرح انسان اپنی شخصی اور فردی زندگی میں بھی انسان مکلف ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کامل بنانے میں آنے والی ہر چیز کو مہیا کرے اور ان کو مضبوط بنائے، اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرے، اس بنا پر حقوق پانے کا معیار اور رملاک افراد کی قابلیت اور ان میں شرائط کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ ان کے ذمہ کچھ وظائف اور ذمہ داریاں دی جاسکیں اور انہیں کی وجہ سے ان کو حقوق دئے جائیں۔

۲۔ تکالیف اور حقوق کے مابین طبعی اور کسبی اختلاف کا اثر

اب تک بیان کیے گئے مطالب کی روشنی میں صرف اس وجہ سے کہ تمام انسان ایک ہیں اور اصل انسانیت میں مشترک ہیں تو کیا سب کے حقوق و وظائف میں برابر ہونے چاہئیں؟ یہ درست ہے ہم تمام انسان اصل انسانیت میں شریک ہیں لیکن خود انسانوں کے اندر بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(الف)۔ اختلافات طبعی اور جبری

میں فرق انسانوں کے مابین سب سے زیادہ اختلافات طبعی اختلافات ہیں۔ جیسے جنسی فرق مفہوم زیست شناسی کے عنوان سے (منطقی مفہوم کے اعتبار سے نہیں) جو مرد اور عورت کے مابین پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کے مابین فیزیولوجی (علم اعضا) اور بائی لوجی (علم حیات) روانی اور عاطفی مسائل میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ انہیں اختلافات کی وجہ سے ان کے مابین وظائف اور حقوق کے لحاظ سے فرق رکھا جاتا ہے یعنی یہ صحیح ہے کہ عورت بھی انسان ہے اور مرد بھی انسان ہے اور دونوں ایک ہی درجہ میں ہیں اور انسانیت میں دو درجہ نہیں ہوتے ہیں لیکن عورت کے جسم میں خاص بناوٹ کے ساتھ ساتھ روحانی بناوٹوں کی وجہ سے اس کے ذمہ خاص وظائف عائد کیے گئے ہیں، عورت جو کردار بچے کی ولادت اور اس کو دودھ پلانے میں ادا کرتی ہے مرد کبھی اس ذمہ داری کو وفا نہیں کر سکتا۔ اور اس بارے میں ان دونوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ چونکہ یہ مسئلہ عورت اور مرد کے طبعی (فطری) اختلاف سے مربوط ہے اور اسی وجہ سے خاص وظائف اس کے ذمہ عائد کئے گئے ہیں۔ اب جب عورت اپنی ذاتی اور طبعی خصوصیات کی وجہ سے اس چیز کی پابند ہے جیسے بچے کو نو مہینے تک اپنے پیٹ میں رکھے، اور اس کے بعد دو سال تک بچہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری اور پرورش اس کے ذمہ ہے انہیں سب امور کی وجہ سے اس کے لئے خاص حقوق نظر میں رکھے گئے ہیں۔ اگر یہ طے ہو کہ عورت اپنی طبعی اور ذاتی خاصیتوں کی وجہ سے بچہ دار ہو اس کے بعد میں بچہ کو دودھ پلا کر اس کو بڑا کرے اور اسی حالت میں بالکل مردوں کی طرح کام کرے اور اپنی زندگی کے خرچ فراہم کرے، تو یہ اس کی اصلی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس پر ظلم ہوگا بچہ دار ہونے اور بچہ کو غذا دینے جیسی مشکل ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے خاص حقوق ہونے چاہئیں یعنی مرد کا وظیفہ ہے کہ وہ عورت کا خرچ پورا کرے، اگر یہ طے ہو کہ عورت خود کام کرے تو بہت سے کام ایسے ہونگے جن سے بچہ ساقط ہو جائے گا یا بہت سے کام ایسے ہوں گے کہ وہ بچہ کو وقت پر دودھ نہیں پلا سکے گی عاطفی نقطہ نظر سے بھی اگر عورت چین و سکون نہ رکھتی ہو اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر میں ہے تو یہ اضطراب و بے چینی بھی بچہ میں اثر انداز ہوتی ہے۔

علمی اعتبار سے یہ ثابت ہوا ہے کہ عورت کو جتنا بھی روحی آرام ہوگا وہ اسی لحاظ سے بچہ کی تربیت کرے گی۔ اسی وجہ سے اسلام میں عورت کے لئے خاص حقوق رکھے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیوی کا خرچ شوہر کے ذمہ ہے، یہاں تک کہ

عورت بچہ کو دودھ پلانے کی اجرت اپنے شوہر سے لے سکتی ہے یعنی یہ اجرت ان زحمتوں کی ہوتی ہے جو بچہ کو دودھ پلانے میں اٹھاتی ہے، اسی وجہ سے گھر میں اس کو خاص اہمیت ہونی چاہئے۔

لہذا مرد و عورت کے مابین حقوق اور وظائف کے اعتبار سے یہ تصور کرنا دونوں انسان ہیں، لہذا ان کے حقوق اور ذمہ داریاں بھی ایک ہی طرح کی ہوں، یہ غلط ہے۔ ہاں دونوں انسانیت میں شریک ہیں لیکن عورت اور مرد ہونے میں شریک نہیں ہیں مرد اپنی خاص خصوصیات کا حامل ہے اور عورت اپنی خصوصیات کی متحمل ہے یہی خاص خصوصیات وظائف اور حق میں اختلاف کا سبب ہیں۔

اس وجہ سے انسانوں کے درمیان کچھ اختلافات طبعی اور جبری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص بھی اپنے لئے عورت ہونے کو منتخب نہیں کرتا اور اسی طرح کوئی عورت اپنے کو مرد ہونا منتخب نہیں کرتی ہے یہ مسئلہ تو ارادہ الہی سے مربوط ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذَّكَوَرَةَ﴾ (۴)

”اور جسے چاہتا ہے (فقط) بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (محض) بیٹے عطا کرتا ہے“ نتیجہ یہ نکلا کہ افراد کا ارادہ و اختیار اپنی اور اپنی اولاد کی نسبت معین کرنے میں دخالت نہیں رکھتا لیکن جب کسی کو جنسیت کے لحاظ سے مرد یا عورت بنادیا گیا تو اس کے ذمہ خاص تکلیفیں قرار دیدی گئیں جن کا انجام دینا اختیاری ہے اور اس کے کچھ حقوق بھی ہوں گے جن کو وہ وفا کر سکتا ہو۔ لہذا اس طرح کے اختلافات کو اختلافات طبعی کہا جاتا ہے۔

(ب) انسانوں کے مابین دوسرا اختلاف اختیاری ہے

جو افراد زندگی بسر کرنے کی خاطر خاص شرطوں کو حاصل کرتے ہیں فرض کر لیجئے جو شخص علم دین حاصل کرتا ہے وہ اپنے انداز اتنی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے، معاشرہ میں کسی عہدہ کو سنبھال سکے لیکن جاہل شخص اس عہدہ کو نہیں سنبھال سکتا۔ یا وہ افراد جو کسی فن میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں وہ لوگ اس لحاظ سے کہ انسان کے حقوق مساوی ہیں ان کا زحمت نہ اٹھانے والے افراد اور جنہوں نے کسی فن میں کوئی مہارت حاصل نہیں کی ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی درس پڑھ کر اور زحمت اٹھا کر پائیلیٹ بن جائے تو اس کے مقابل میں اگر کوئی درس نہ پڑھنے والا۔ زحمت نہ اٹھانے والا اور اس فن میں مہارت نہ رکھنے والا یہ ادعا کرے کہ میں بھی پائیلیٹ بننا چاہتا ہوں تو اس کا یہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہوگا بیشک تمام افراد اس کو بھی کھیں گے کہ اگر تم پائیلیٹ بننا چاہتے ہو تو پہلے علم حاصل کرو۔

اسی طرح اگر جاہل اور مسائل سیاسی سے ناواقف شخص یہ کہے کہ میں بھی وزیر اعظم ہونے کا حق رکھتا ہوں تو اس سے بھی کہیں گے کہ: وزیر اعظم بننے کی کچھ شرطیں ہوتی ہیں تم ان شرطوں کو حاصل کر لیتے اور تمہارے اندر ذاتی توانائی ہوتی تو تم بھی کنڈیڈیٹ ہو سکتے تھے اور لوگوں کے ووٹ حاصل کر کے منتخب ہو سکتے تھے۔ لہذا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ انسانوں کے مابین پہلا اور دوسرا درجہ نہیں ہے لہذا میں بھی وزیر اعظم ہونے کا حق رکھتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر انسان خواہ وہ ملت کی راہ کے خلاف ہی کیوں نہ چل رہا ہو، اور ملک کے اساسی و بنیادی قانون کو قبول نہ کرتا ہو یہ کہے:

چونکہ میں بھی انسان ہوں لہذا وزیر اعظم ہونا چاہتا ہوں؟ لہذا صرف اس وجہ سے کہ تم انسان ہو، تم کو ملک کی کوئی پوسٹ دے دی جائے کیونکہ ہر پوسٹ کے لئے کچھ نہ کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی ملک میں وزیر اعظم مسلمان ہونا چاہئے، ایک غیر مسلمان شخص (درحالیکہ ہم اس کے احترام کے قائل ہیں اور قانون اساسی بھی اس کے لئے حق کا قائل ہوا ہے) وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔

۳۔ افراد کے لئے شہریت کے قوانین میں مختلف درجات کا معین ہونا

پوری دنیا میں خاص منصب کے لئے خاص شرطیں رکھی گئی ہیں منجملہ جن امور میں خاص شرطیں رکھی گئیں ہیں ان میں سے ایک نیشنلٹی کا مسئلہ ہے اور عالمی حقوق میں یہ بات مسلم ہے کہ نیشنلٹی یکساں اور برابر نہیں ہے اور خصوصی حقوق بین الملل سے مختصر سی آشنائی رکھنے والا انسان بھی اس مطلب کو درک کرتا ہے۔ فرض کر لیجئے اگر ایک ایرانی شخص کسی یورپی ملک یا امریکا کے کسی ملک میں رہنا چاہتا ہے پہلے تو اس کے وہاں پر رہنے کے لئے اس میں کچھ شرطوں کا ہونا ضروری ہے اگر اتفاقاً اس کو نیشنلٹی دے بھی دی جائے تو اس کو وزیر اعظم ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کیوں کہ وہ درجہ دوم کا شہری ہے ممکن ہے وہ ایک طولانی مدت تک اپنے تمام امتحانوں میں کامیاب رہا ہو، اور درجہ دوم کی نیشنلٹی سے درجہ اول کی شہریت میں آجائے۔

بہر حال اگر کوئی شخص جس ملک کی شہریت رکھتا ہو ایسا نہیں ہے کہ وہ تمام حقوق جو اس ملک کے باشندے رکھتے ہیں اس شخص کو بھی وہی حقوق دیدے جائیں۔ چونکہ شہریت میں فرق ہے اور کئی درجہ رکھتی ہے، اگر ہم مان لیں کہ انسانیت کے درجات نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہریت بھی درجے نہیں رکھتی، ہر ملک اپنے باشندوں کے لئے خاص شرطوں کا قائل ہے اسلام میں بھی خاص شرطیں ہیں صرف یہ کہ تمام انسان انسانیت میں شریک ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہریت میں بھی سب برابر ہیں۔

لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک کے افراد اس ملک کے باشندے شمار کئے جاتے ہیں وہ بھی منصب اور مقام کے لحاظ سے ایک نہیں ہیں اور ان کے حقوق بھی جدا جدا ہیں۔ لیکن کونسا معیار و ملاک ان کے حقوق معین کرتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں

، حقیر کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ تمام اذن الہی کی طرف پلٹتے ہیں جو لوگ لیبرال (آزادی خواہ) ممالک یا ڈیموکریٹ (جمہوری) ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ قوانین کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کو لوگوں کی رائے کا تابع ہونا چاہئے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ: لوگوں کی رائے کے علاوہ خدا کی اجازت بھی ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہماری رائے اور خواہش خدا کے قانون کے خلاف نہیں ہوں۔

بہر حال کوئی بھی ملک تمام افراد کے لئے مساوی شہریت کا قائل نہیں ہے اور چونکہ انسانیت میں درجہ نہیں ہے لہذا شہریت بھی درجات نہیں رکھتی اس کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا، ہمارے اساسی اور بنیادی قوانین میں بھی اس مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، اور ہمیں تعجب ہوتا ہے ان لوگوں پر جو قانون اساسی کے اس بند پر توجہ نہیں کرتے، قانون اساسی کا بند یہ کہتا ہے:

”جو اشخاص بھی ایرانی نیشنلٹی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا حاصل کریں گے وہ تمام حقوق جو ایرانیوں کے لئے مقرر ہیں وہی حقوق ان کے لئے بھی ہیں سوائے وزیر اعظم، وزرات، یا ہر طرح کی خارجی سیاست کے عہدہ“

یعنی جو شخص بھی ایران کی شہریت میں آجائے اس کو سیاسی عہدہ دار یا سفیر بننے کا حق نہیں وہ کونسلٹ اور وزیر نہیں بن سکتا ہے حالانکہ اس نے ایرانی شہریت قبول کر لی اور ایرانی حکومت نے بھی اس کو اپنی نیشنلٹی دے دی لیکن اس کو اس طرح کے حقوق مانگنے کا کوئی حق نہیں یہ ہمارے (ایران) کے قانون۔

۳۔ اسلام کی نگاہ میں پہلے اور دوسرے طبقہ کی شہریت

ہم اب شہریت کے مستحق ہونے اور اس کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو تفصیلی طور پر بیان نہیں کر سکتے، اس لئے کہ یہ بحث فلسفہ حقوق سے مربوط ہے اور ہماری بحث کا موضوع فلسفہ سیاست ہے۔ لیکن مختصر طور پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ممالک کی حد بندی میں اسلام کا حقوقی نظریہ کی رو سے اعتقادات اصل ہیں، اور جغرافیائی اعتبار سے حد بندی کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اسلام کا سب سے پہلا ہدف یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو (انشاء اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے بعد قائم ہوگی) اس میں جغرافیائی حد بندی اٹھالی جائے گی اور تمام افراد امت اسلام اور ایک حکومت کے شہری ہونگے اور ان کی شہریت کا ملک اسلام ہے اس حکومت میں غیر مسلمان افراد کے حقوق اور وظائف مسلمانوں سے متفاوت ہونگے، غیر مسلمان کو ایک مسلمان کے تمام وظائف اور عہدہ نہیں ملے گا، اور نہ ہی اس کو مسلمان کے تمام حقوق اس کو دیتے جائینگے یہ اسلام کا پہلا ہدف ہے۔

لیکن خاص شرائط کے اعتبار سے ولی فقیہ اور اسلامی حکومت عنوان ثانوی کے ماتحت جغرافیائی حد بندی کو معتبر سمجھ سکتے ہیں اس بنا پر اگر ہم جغرافیائی حد بندی کو معتبر سمجھ سکتے ہیں تو اسلام کی طرح حکم اولی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ثانوی طریقہ اور مصلحتوں

کی وجہ سے ہے جو منطق اور بین الاقوامی قوانین کے ماتحت ہے اور وہ قوانین ولی فقیہ کے دستخط کے ذریعہ ہمارے لئے معتبر ہوتے ہیں اور حقیقت میں وہ تمام حد بندی ولی فقیہ کے ذریعہ متعین کی جاتی ہے

نتیجتاً پہلے طریقہ اور آئیندیل اسلام میں شہریت کے دوسرے درجہ میں شمار ہونگے لیکن خاص شرطوں کی وجہ سے جغرافیائی حد بندی معتبر مانی گئی ہے اور قانون کی بنیاد پر شہریت کے لئے خاص شرطوں کو نظر میں رکھا گیا ہے، ولایت فقیہ کے نظریہ پر کی بنیاد پر جب ان شرائط و قوانین پر ولی فقیہ دستخط فرمادیں تو تمام احکام اسلامی کی طرح وہ بھی واجب الاطاعت ہوں گے، جبکہ حضرت امام خمینی نے فرمایا ہے کہ ”اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کرنا واجب ہے“

۵۔ نظام ولایت فقیہ کا دوسرے نظاموں سے فرق

جو افراد ہمیشہ جمہوریت کا دم بھرتے ہیں اور اپنی حکومت کو ولایت فقیہ کی بنیاد پر اچھا نہیں سمجھتے انھوں نے اس ملک کے لئے ولایت فقیہ کی خدمات کی طرف توجہ نہیں دی ہے، اور وہ یہ بھی توجہ نہیں کرتے کہ ولایت فقیہ کے نظریہ کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے احکام و قوانین اور اسلامی پارلیمنٹ کے وضع کئے ہوئے قوانین کی شورا کی نگہبان کی تائید کے بعد اطاعت کرنا واجب ہے، چونکہ وہ ولی فقیہ کی اجازت سے اس مرحلہ تک پہنچے ہیں، اور ان کا اذن خدا کا اذن ہے، اس نظام کا ایک بڑا امتیاز بھی ہے، لیکن اگر ہم ولایت فقیہ کو تسلیم نہ کریں تو کم از کم وجوب عرفی کی بنا پر قوانین کی اتباع کرنا ہوگی، جو لوگ اپنی خواہش کے قانون کو رائے دے چکے ہیں، ورنہ خود اپنے ہی عہد پر وفادار نہیں ہوں گے، اور اگر دل چاہے تو اس عہد سے لوٹ جائیں اور اپنی درخواست پر تجدید نظر کریں اور اپنی خواہش کے مطابق قانون میں تغیر و تبدیلی کر سکتے ہیں، جمہوری حکومت میں لوگوں پر قوانین کی اطاعت کرنا کوئی واجب نہیں ہے۔

اسلامی حکومت میں ولی فقیہ کی اجازت اور دستخط سے قانون معتبر جانے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ لوگوں کے خود لازم کردہ اور وجوب عرفی کی بنا پر ان کے لئے لازم ہوتے ہیں اور وجوب شرعی بھی رکھتے ہیں اور ان کی مخالفت کرنا گناہ اور سزا کا باعث بھی ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت کے قوانین کی اتباع کرنے اور جو قوانین اکثر لوگوں کی رائے کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی اتباع کرنے میں کتنا فرق ہے اور چونکہ نمائندہ مجلس کو اکثر لوگوں نے اپنے ووٹ دے کر منتخب کیا اور خود اس کی اتباع کرنے کو لازم قرار دیا ہے اب جن افراد نے اس قانون کی ووٹ نہیں دئے یا وہ اقلیت جنھوں نے اس نمائندہ مجلس کو ووٹ نہیں دئے ان افراد کو اس قانون کی کسی حد تک اتباع کرنا چاہئے؟ جو قانون اکثر افراد کی رائے سے بنایا گیا ہو تو کیا نفسیاتی، عاطفی اور قلبی اعتبار سے اس قانون کے مخالف افراد پر بھی اس قانون کی اتباع کرنا لازم ہے؟ اور کس طرح قلبی طور پر بھی وہ اکثر لوگوں کی خواہش کی مطابق ملتزم ہوں؟

جو قوانین اسلامی حکومت کے ذریعہ نمائندگان مجلس کے توسط سے بنائے جاتے ہیں، اور ولی فقیہ نے بھی ان کی تائید فرمادی وہ خداوند عالم کی طرف سے واجب ہو گئے اور ان کی اطاعت کرنا واجب ہے، اور جن افراد نے ان قوانین کو اپنی رائے نہیں دی ہے ان پر بھی شرعی طور پر ان کی اتباع کرنا لازم ہے، البتہ تمام افراد اس بات سے واقف ہیں اور اسلامی حکومت کے قوانین کو تھ دل سے تسلیم کرتے ہیں ان کو شرعی قوانین کی حیثیت دیتے ہیں اور ان کی مخالفت نہیں کرتے۔

چونکہ وہ الہی اور اسلامی حکومت کے قوانین و ضوابط سے آشنا ہیں اس طرح سے قوانین کے ضوابط کو قبول کرنا اور اس کی اتباع کرنا یہ نظام الہی کی خصوصیات میں سے ہے جو ہمارے ملک میں نظام ولایت فقیہ کے ماتحت وجود میں آئی ہے، اسلامی انقلاب سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ تمام لوگوں پر رہبر اور ولی فقیہ کی اطاعت کرنا ضروری ہے اور ان کے اوامر اور راہنمائی کی طرف خالصانہ قدم اٹھانے ہی سے ہم کامیاب ہوئے ہیں، چاہے وہ دوران انقلاب ہو یا انقلاب کے بعد کا زمانہ، اور فی الواقع جنگ میں کامیابی اور سرفرازی کا راز بھی یہی ہیں۔

دنیا میں کون سا ایسا شخص ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی میں ایک اہم چیز لوگوں کا اپنی مذہبی رہبر پر اعتقاد رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا تھا، اس وقت یہ کہنا بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ جس ملک میں شہیدوں نے اپنی جانفشانی اور فداکاریوں سے امام خمینی اور مرجع تقلید کے امر سے جہاد کیا اور اسی راہ میں شہید ہو گئے اور جس کی برکت سے اسلامی نظام وجود میں آیا اور بھی آزاد فضا جو شہیدوں کے خون اور ان کی فداکاریوں کا نتیجہ ہے اس میں کچھ لوگ یہ کہیں کہ: امام خمینی نے ایک دفعہ ہوا طوفان مچایا اور لوگوں کی تحریک کو نھضت انقلاب اسلامی کا نام دیدیا، کیا اس دعوے کی کوئی حقیقت ہے؟ اگر ایران کی عوام انقلاب کے موقع پر اپنے دینی اور شرعی وظیفہ کو انجام دینے کے لئے قیام نہ کرتے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنے سینوں کو سپر نہ بناتے تو کیا انقلاب کامیاب ہو جاتا؟ اور اگر امام خمینی کا حکم نہ ہوتا تو کیا وہ اس کام کو کرتے؟ حقیقت کو بھلانا اور اس کا انکار کرنا بے انصافی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دین اور امام خمینی کے رہبریت نے ہمیشہ انقلاب کے کامیاب ہونے، اس کے دوام پانے اس کے بعد جنگ میں کامیابی پانے اور تمام مشکلوں اور سختیوں میں ثابت قدم رہ کر اہم کردار ادا کیا ہے، اور انشاء اللہ حضرت امام خمینی قدس سرہ کے لائق و شائستہ جانشین (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) اور ان کی حکیمانہ تدبیروں کے زیر سایہ یہ کامیابی و موفقیت ایران کے فداکار لوگوں کی یکتائی اور ہمدلی کے ذریعہ اسی طرح باقی رہے گی، اور لوگ ولی فقیہ کے سایہ میں کمال اور ترقی کے مزید مراحل کو طے کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہو کہ شہریت کی درجہ بندی کرنا ایک ایسی چیز ہے جس کو پوری دنیا کی تمام حکومتوں میں تسلیم کیا گیا ہے البتہ اسلام کے نقطہ نظر اور دوسروں کے نقطہ نظر سے شہریت کے ملاک اور اس کی شرطوں میں فرق ہے، لیکن شہریت کے درجہ میں اختلاف

ایسی چیز نہیں ہے کہ ہم اس کو ایجاد کیا ہو، اور شہریت کے درجہ میں یہ فرق انسانیت میں لوگوں کے مشترک ہونے سے کوئی ربط نہیں رکھتا ہے، تمام انسان انسانیت کے درجہ میں ایک ہیں، لیکن یا تو ان میں طبعی طور پر وہ شرطیں موجود ہوتی ہیں جو وظائف اور حقوق کے اختلاف کا سبب ہوتی ہیں یا وہ جو خصوصیات، طاقت اور قابلیت کو حاصل کرتے ہیں ان کی وجہ سے ان کو کچھ منصب دئے جاتے ہیں اور ان کے عوض میں ان کو حقوق دئے جاتے ہیں، تو اب حقوق اور وظائف کے مابین فرق یا تو طبعی ہے یا افراد کے انتخاب اور اختیار میں ہے، مثال کے طور پر وہ خاص دین کو تسلیم کر لیں یا کسی فن میں مہارت حاصل کر کے کسی منصب کو حاصل کر لیں، اور اس میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں ہے کہ یہ اختلاف اور کسب شدہ خصوصیات اور منجملہ اصول مہانی کو تسلیم کرنا وہ انسان کی شہریت میں موثر ہو سکتا ہے۔

والسلام

حوالے

۱۔ سورہ مومنون آیت ۲۲۔

۲۔ سورہ شوریٰ آیت ۴۹۔

۳۔ سورہ یس آیت ۶۰۔

فہرست

- ۳..... پہلا جلسہ
- ۳..... اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات
- ۳..... مقدمہ ۱
- ۵..... ۲۔ اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ
- ۶..... ۳۔ اسلامی سیاسی نظریہ کا بنیادی ہونا
- ۷..... ۴۔ اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان
- ۸..... ۵۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ، اس کے اختیارات اور وظائف کی وسعت
- ۱۰..... ۶۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار اور چند دیگر سوالات
- ۱۰..... ۷۔ اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے
- ۱۲..... حوالہ
- ۱۳..... دوسرا جلسہ
- ۱۳..... اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت
- ۱۳..... ۱۔ اسلامی انقلاب سے مغرب و مشرق کا برتاؤ
- ۱۳..... ۲۔ جوانوں کی گمراہی کے لئے مغرب کا ایک ثقافتی حربہ
- ۱۵..... ۳۔ فرہنگی تین حربے
- ۱۶..... الف: دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا
- ۱۶..... ب: ولایت فقیہ کا انکار
- ۱۷..... ج۔ ولایت فقیہ کو مورد اعتراض قرار دینا
- ۱۸..... ۳۔ دشمن کی مذکورہ سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ

- ۵۔ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں بہت ریزاستوں کا انتخاب ۱۹
- ۶۔ دین کی تعریف اور اس کے حدود ۲۰
- ۷۔ دینی طریقوں سے دینی معرفت کی ضرورت ۲۲
- حوالے ۲۵
- تیسرا جلسہ ۲۶
- دین میں سیاست کی اہمیت ۲۶
- ۱۔ گزشتہ مطالب پر ایک نظر ۲۶
- ۲۔ سیاست کی تعریف اور اسلام میں تین طاقتوں کی اہمیت ۲۷
- ۳۔ عدالتی احکام قرآن کی نگاہ میں ۲۹
- ۴۔ سلام کا ہمہ گیر ہونا اور اسلامی حاکم کی اہمیت ۳۰
- ۵۔ مذکورہ بحث کا خلاصہ ۳۳
- حوالے: ۳۳
- چوتھا جلسہ ۳۶
- دین میں سیاست کی اہمیت ۳۶
- ۱۔ گزشتہ مطالب پر ایک نظر ۳۶
- پھلا اعتراض: ۳۶
- ۲۔ کیا دین سیاست سے جدا ہے؟ (مذہبی و غیر مذہبی لوگوں کا نظریہ) ۳۷
- ۳۔ دنیا اور آخرت میں چولی دامن کا رابطہ ہے ۳۹
- ۴۔ انسان کے دنیاوی اعمال و کردار کی اہمیت ۴۱
- ۵۔ انسان کے کردار کی اہمیت کو سمجھنے میں عقلی طاقت کی شعائیں ۴۳

۶۔ دین کے حدود.....	۳۳
۷۔ دین اور حکومت میں رابطہ.....	۳۳
۸۔ دین کی جامعیت.....	۳۶
حوالہ.....	۳۷
پانچواں جلسہ.....	۳۸
اسلام میں آزادی ^(۱)	۳۸
۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر.....	۳۸
۲۔ علم اور دین کے مخصوص دائرے.....	۳۸
۳۔ دینی حاکمیت کا آزادی سے ٹکراؤ، ایک شبہ.....	۳۹
۳۔ مذکورہ شبہ دینی انداز میں.....	۳۹
مذکورہ اعتراض کا جواب.....	۵۰
۵۔ قرآن پر مختلف توجہ کی دلیل.....	۵۱
۶۔ مذکورہ شبہ غیر مذہبی طریقہ سے.....	۵۵
۷۔ ”ھیوم“ کا اعتراضات اور ان کے جوابات.....	۵۵
۸۔ دوسرا جواب: آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہے.....	۵۶
۹۔ حاکمیت اور انسان کے خلیفۃ اللہی عظمت کے درمیان تعارض ایک شبہ.....	۵۷
اعتراض کا جواب.....	۵۷
۱۔ اسماء کا علم.....	۵۸
۲۔ اللہ کا خلیفہ روئے زمین پر عدالت و انصاف کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو.....	۵۸
حوالے.....	۵۹

چھٹا جلسہ.....	۶۱
اسلام میں آزادی ^(۲)	۶۱
۱- تاریخ انسان میں تحویل و تحول کی بنا پر ایک شبہ.....	۶۱
۲- ہمارا جواب.....	۶۲
تشریحی لحاظ سے دوسرا جواب.....	۶۳
۳- گزشتہ اعتراض، ایک دوسرے لحاظ سے.....	۶۳
۳- ہمارا جواب.....	۶۳
۵- خدا کی نافرمانی تاریخ کی نظر میں.....	۶۵
۶- خدا کی اطاعت اور آزادی.....	۶۷
حوالہ.....	۷۰
ساتواں جلسہ.....	۷۱
آزادی کے حدود.....	۷۱
۱- اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی کو محدود کرنے کا شبہ.....	۷۱
۲- آزادی کے بارے میں مختلف نظریات.....	۷۲
۳- آزادی، مطلق نہیں ہے، اور آزادی کے دین پر مقدم ہونے کا جواب.....	۷۳
۳- ہر معاشرے کی مقدسات کی رعایت ضروری ہے۔.....	۷۵
۵- آزادی کے نعرہ میں ناجائز غرض.....	۷۷
۶- آزاد گفتگو کی حدود.....	۷۸
۷- الفاظ کے مفہوم اور مصادیق کو روشن کرنے کی ضرورت.....	۷۹
حوالہ.....	۸۰

۸۱	آٹھواں جلسہ.....
۸۱	حکومت کے ڈھانچے کی وضاحت.....
۸۱	۱- عنصری اور مصداقی تعریف کی اہمیت.....
۸۲	۲- اسلام اور تینوں قوتوں کے جدا جدا ہونے کا نظریہ.....
۸۲	الف- قوہ مقننہ:.....
۸۲	ب- قوہ قضائہ:.....
۸۳	ج- قوہ مجریہ:.....
۸۳	۳- اسلام معاشرہ کو ادارہ نہیں کر سکتا (ایک شبہ).....
۸۵	۳- قوانین کی مختلف اقسام اور متغیر قوانین ہونے کی ضرورت.....
۸۵	الف- قانون اساسی.....
۸۶	ب- پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین.....
۸۶	ج- انجمن حکومت کے بنائے گئے قوانین.....
۸۷	۵- قوانین کا اسلامی ہونے کا مطلب.....
۸۹	۶- اسلامی حکومت میں قانون گذاری کا مسئلہ.....
۹۰	۷- اسلامی حکومت میں قانون کے جاری کرنے والوں کو منصوب کرنا.....
۹۱	حوالہ.....
۹۲	نواں جلسہ.....
۹۲	دینی نظام میں قوانین کا مقام.....
۹۲	۱- اسلام کے سیاسی نظریہ کے اصول.....
۹۲	الف- قانون.....

- ۲- طبعی اور بنائے گئے قوانین کی اہمیت ۹۳
- ب- قوانین کا مرضی الہی اور دین کے مطابق ہونا ضروری ہے ۹۵
- ۳- دین کی ضروری باتوں کو قبول کرنا لازمی ہے ۹۶
- ۳- اسلام، اصول اور ثابت معرفتیں ۹۸
- ۵- قرآن کریم کے ثابت اور قطعی احکام و مفاہیم ۹۹
- ۶- اسلام مختلف تعبیریں رکھتا ہے- ۱۰۱
- ۷- اسلام انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے ۱۰۲
- الف: سوال کے ثبوتی پہلو کی تحقیق ۱۰۲
- ب:- سوال کے اثباتی پہلو ۱۰۳
- حوالہ ۱۰۳
- دسواں جلسہ ۱۰۵
- قانون کے سلسلہ میں نظریات میں فرق ۱۰۵
- ۱- گزشتہ مطالب پر ایک نظر ۱۰۵
- ۲- دور حاضر میں قانون سے بحث کرنے کی ضرورت ۱۰۵
- ۳- قوانین کے حدود کو معین کرنے میں دو مختلف نظریے ۱۰۶
- ۳- جمہوری حکومت میں قانون کی ضرورت ۱۰۷
- ۵- حقوق بشر کے اعتبار کا معیار ۱۰۸
- ۶- حقیقی اور تکوینی قوانین اور انسان کے اختیارات کی اہمیت ۱۰۹
- ۷- الہی اور تشریعی قوانین، انسان کے کمال اور سعادت کی ضامن ہے ۱۱۱
- ۸- حقوقی قوانین اور اخلاقی قوانین میں فرق ۱۱۳

- ۹۔ اسلامی اور خود مختاری کے نظریات میں فرق..... ۱۱۵
- حوالے..... ۱۱۷
- گیارہواں جلسہ..... ۱۱۸
- قانون کے اعتبار کا معیار..... ۱۱۸
- ۱۔ بڑے سیاسی مسائل کی عمیق تحقیق کی ضرورت..... ۱۱۸
- ۲۔ قانون کے معتبر ہونے کا معیار اور اس کی وسعت..... ۱۱۹
- الف: نظریہ عدالت..... ۱۲۰
- ب: معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنا..... ۱۲۱
- ج: عوام الناس کیا چاہتی ہے..... ۱۲۱
- ۳۔ پھلے نظریہ پر اعتراض..... ۱۲۲
- ۳۔ اسلامی قوانین کی برتری..... ۱۲۳
- ۵۔ دوسرا نظریہ عملی نہیں ہے..... ۱۲۳
- ۶۔ تیسرے نظریہ کی کمی اور اسلامی لحاظ سے ضرورتوں کی وسعت..... ۱۲۵
- ۷۔ اسلامی انقلاب اور اس کا معنوی مصلحتوں سے برتر مقام..... ۱۲۷
- حوالہ..... ۱۲۹
- بارہواں جلسہ..... ۱۳۰
- اقدار کے بارے میں اسلام اور مغربی تمدن میں نظریاتی فرق..... ۱۳۰
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر..... ۱۳۰
- ۲۔ دین کی نظریں بہت رین قانون اور دوسروں کے نظریہ کے تحت تاثیر واقع ہونے کا خطرہ..... ۱۳۱
- ۳۔ دینی نظریات میں دوسروں سے متاثر ہونا..... ۱۳۲

- ۳۔ پلورالیزم دینی کا مطلب ۱۳۵
- ۵۔ بندگی خدا کی عظمت اور اس کا مطلق آزادی سے ٹکراؤ ۱۳۶
- ۶۔ یورپ اور علم و دین کے ٹکراؤ کا دور ہونا ۱۳۹
- ۷۔ اسلام اور آزاد بخواہ مکتب میں عوام الناس کی اہمیت ۱۴۱
- ۸۔ اسلام اور یورپ میں جمہوریت اور قانون گذاری کا مرجع ۱۴۲
- ۹۔ جوانوں کے لئے ایک نصیحت ۱۴۵
- حوالہ ۱۴۶
- تیرہواں جلسہ ۱۴۸
- قانون کے سلسلے میں اسلام اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق ۱۴۸
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۱۴۸
- ۲۔ فردی آزادی اور قانون کے درمیان رابطہ ۱۴۹
- ۳۔ اومانیزم اور لیبرالیزم کا قانون میں داخل ہونا ۱۵۰
- ۳۔ یورپی ثقافت کے اصول اور اسلامی ثقافت سے ان کا موازنہ ۱۵۱
- ۵۔ علماء اور اسلامی تالیفات کی ذمہ داریاں ۱۵۳
- ۶۔ قانون کی حقیقت اور اسلام اور لیبرالیزم میں اس کی اہمیت ۱۵۳
- ۷۔ مشروع آزادی کا نسبی ہونا ۱۵۶
- ۸۔ اسلام کا لیبرالیزم سے ٹکراؤ ۱۵۷
- ۹۔ اسلام اور ڈیموکریسی میں قانون گذاری ۱۵۸
- ۱۰۔ اسلامی حکومت میں معتبر قانون ۱۵۹
- حوالہ ۱۶۱

- چودھواں جلسہ..... ۱۶۲
- قانون کے سلسلے میں غرب کی مادی نگاہ..... ۱۶۲
- ۱۔ گزشتہ مطالب پر ایک نظر..... ۱۶۲
- ۲۔ مکتب حقوق طبعی..... ۱۶۳
- ۳۔ یورپ میں حقوق بشر کی حدود..... ۱۶۳
- ۴۔ آزادی کی حد بندی میں تعارض کا ظاہر ہونا..... ۱۶۵
- ۵۔ حقوق بشر میں آزادی کی اہمیت..... ۱۶۶
- ۶۔ یورپ میں آزادی کی حد بندی پر اعتراضات..... ۱۶۷
- ۷۔ مادی اور معنوی مصلح پر قانون اسلام کی توجہ..... ۱۶۹
- ۸۔ مصلح معنوی اور دینی کا مصلح مادی پر مقدم ہونا..... ۱۷۱
- ۹۔ اسلام اور لیبرالیزم کے مابین آزادی اور قید میں فرق..... ۱۷۲
- حوالہ..... ۱۷۳
- پندرہواں جلسہ..... ۱۷۳
- اسلامی حکومت اور ثقافتی حربے..... ۱۷۳
- ۱۔ گزشتہ مطالب پر ایک نظر..... ۱۷۳
- ۲۔ علماء اور ان کی خطرناک ذمہ داری..... ۱۷۳
- ۳۔ ملکی اخباروں میں مغربی غلط آزادی کی تبلیغ..... ۱۷۷
- ۳۔ اسلامی پروٹسٹانیزم، اسلام پر ایک حملہ..... ۱۷۸
- ۵۔ حق مسلم کا مفہوم حقیقی..... ۱۷۹
- ۶۔ اسلام کی حقیقی قرأت اور اس کا صحیح مطلب..... ۱۸۰

- ۷۔ شرعی آزادی ۱۸۳
- ۸۔ دین اور قانون آزادی کو محدود کرتے ہیں۔ ۱۸۳
- ۹۔ آزادی کو محدود کرنے کی ضرورت ۱۸۵
- حوالے ۱۸۷
- سولہواں جلسہ ۱۸۸
- قانون اور آزادی کے لحاظ سے الہی اور والحادی ثقافت میں فرق ۱۸۸
- ۱۔ انتخاب کی اہمیت اور ہدف تک پہنچنے کے لئے قوانین کی آگاہی اور رعایت ۱۸۸
- ۲۔ اخلاقی اور حقوقی قوانین میں فرق ۱۹۰
- ۳۔ الہی اور کفر والحادی ثقافت میں فرق اور قانون کے بارے میں اختلاف نظر ۱۹۱
- ۳۔ مغربی ثقافت کے تین اہم رکن ہیں ۱۹۲
- ۵۔ اسلامی اور مغربی تمدن کا بنیادی فرق ۱۹۵
- ۶۔ آزادی کے حدود کو معین کرنے میں اسلام اور مغربی تمدن میں فرق ۱۹۷
- حوالہ ۲۰۰
- سترہواں جلسہ ۲۰۱
- ربوبیت تشریعی، حاکمیت اور قانون گزاری میں رابطہ ۲۰۱
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۲۰۱
- ۲۔ اصول موضوعہ کو معین کرنے کی ضرورت ۲۰۱
- ۳۔ خدا کی حاکمیت اور تشریعی الوہیت ۲۰۳
- ۳۔ خالص توحید کا مطلب ۲۰۵
- ۵۔ قانون گزار حضرات اور اسلام میں حاکمیت ۲۰۶

- ۶۔ قانون گزاری حق خدا سے مخصوص ہونے کے دلائل ۲۱۰
- حوالے ۲۱۳
- اٹھارہواں جلسہ ۲۱۵
- قانون گزاری کے شرائط اور اسلام میں اس کی اہمیت ۲۱۵
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۲۱۵
- ۲۔ قانون گزاری کے شرائط خداوند عالم میں منحصر ہیں ۲۱۶
- ۳۔ قانون بنانے والے متعدد ہو سکتے ہیں (ایک اعتراض) ۲۱۷
- ۳۔ گذشتہ اعتراض کا جواب ۲۱۸
- ۵۔ قانون گزاری میں خدا کی اجازت بے اثر ہے۔ (دوسرا اعتراض) ۲۱۹
- ۶۔ گذشتہ اعتراض کا جواب ۲۱۹
- ۷۔ کیا انسان اپنی زندگی پر حق حاکمیت رکھتا ہے؟ ۲۲۲
- ۸۔ انسان کی حاکمیت خدا سے نہیں ٹکراتی ۲۲۵
- حوالہ ۲۲۷
- انیسواں جلسہ ۲۲۸
- حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کی خصوصیت ۲۲۸
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۲۲۸
- ۲۔ حکومت سے مخصوص کاموں کے بارے میں تین نظریے ۲۲۹
- ۳۔ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے کاموں میں ایک امتیازی فرق ۲۳۱
- ۳۔ انسانی معاشرہ کی حقیقت اسلام کی نگاہ میں ۲۳۲
- ۵۔ قانون گزار کی ضروری صفات ۲۳۳

۲۳۷	۶۔ اسلامی اور لیبرالیزم قوانین میں اختلاف
۲۳۰	حوالے
۲۳۱	بیسواں جلسہ
۲۳۱	قانون و حکومت کی ایک نئی تصویر
۲۳۱	۱۔ معاشرہ پر ایک طبقاتی اور احزابی نظر
۲۳۲	۲۔ معاشرہ کے طبقاتی اور احزابی نظام کے بارے میں اسلام کا نظریہ
۲۳۳	۳۔ معاشرہ اور پیکر انسانی میں دیگر شباهتیں
۲۳۵	۳۔ معاشرہ میں طبقاتی نظام کی روشنی میں حکومت کی اہمیت
۲۳۸	۵۔ واقعی مصالح و مفاسد قانون کے پشت پناہ
۲۵۰	حوالے
۲۵۱	اکیسواں جلسہ
۲۵۱	اسلام اور جمہوریت (۱)
۲۵۱	۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر
۲۵۲	۲۔ قانون کے جاری کرنے والوں کے لئے بھی خدا ضروری
۲۵۳	۳۔ جمہوریت کے معنی اور اس کے استعمال میں ایک بحران
۲۵۶	۳۔ دور حاضر میں جمہوریت کا مفہوم
۲۵۷	۵۔ جمہوریت کی نئی تصویر سے استعمار کا بے جا فائدہ اٹھانا
۲۵۸	۶۔ اسلامی نظریہ کے مطابق جمہوریت کی مناسب تصویر
۲۶۲	بائیسواں جلسہ
۲۶۲	اسلام اور جمہوریت (۲)

- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر..... ۲۶۲
- ۲۔ سیکولر جمہوری اور اس کے فلسفہ کی وضاحت..... ۲۶۲
- ۳۔ سیکولر نظام کی فلسفی بنیاد میں مغالطہ..... ۲۶۳
- ۴۔ مدیریت کے میدان میں جمہوریت کا دوسرا رخ..... ۲۶۵
- ۵۔ جمہوری اسلامی میں اسلام و ولایت فقیہ کا سب سے اہم مقام..... ۲۶۷
- حضرت امام خمینی مکرر فرمایا کرتے تھے:..... ۲۶۸
- ۶۔ اسلام کی مورد قبول جمہوریت..... ۲۶۹
- حوالے..... ۲۷۰
- تیسواں جلسہ..... ۲۷۱
- انسانیت میں اصل وحدت کی تحقیق اور شہریوں کی اتباع..... ۲۷۱
- ۱۔ اسلامی نقطہ نظر کسی کا صاحب حق ہونا..... ۲۷۱
- ۲۔ تکالیف اور حقوق کے مابین طبعی اور کسبی اختلاف کا اثر..... ۲۷۳
- (الف)۔ اختلافات طبعی اور جبری..... ۲۷۳
- (ب) انسانوں کے مابین دوسرا اختلاف اختیاری ہے..... ۲۷۵
- ۳۔ افراد کے لئے شہریت کے قوانین میں مختلف درجات کا معین ہونا..... ۲۷۶
- ۳۔ اسلام کی نگاہ میں پہلے اور دوسرے طبقہ کی شہریت..... ۲۷۷
- ۵۔ نظام ولایت فقیہ کا دوسرے نظاموں سے فرق..... ۲۷۸
- حوالے..... ۲۸۰